ہمہ رنگ غالب



ڈاکٹر جمال نقوی

پیس پبلی کیشنز

ہمہ رنگ غالب

ڈاکٹر جمال نقوی

پیس پبلی کیشنز
42- اُردو بازار، لاہور

2020ء

سیدذوالفقار حسین شاہ نے
پیس پبلی کیشنز لاہور سے شائع کی۔

نام کتاب : ہم رنگ غالب
مصنف: ڈاکٹر جمال نقوی
ناشر : پیس پبلی کیشنز
پرنٹرز : حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز، لاہور
بائنڈر : قیوم احمد

ISBN:969-728-018-6
ISBN:978-969-728-018-6

Peace Publications
42-Manzoor Manzal Urdu-Bazar Lahore
Cell: 0322-4298311 – 0307-4505020
E-mail peace_publications@yahoo.come

انتساب

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کیلئے

فہرست

پروفیسر سحر انصاری
(تمغۂ امتیاز)

دیباچہ

مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ برصغیر پاک وہند کے سربرآوردہ شاعروں اور نثر نگاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی زندگی، شاعری، افکار ومحسوسات ایک زندہ انسان کی پوری شخصیت کی عکاسی کرتے ہیں۔

عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ بڑی شخصیتوں میں کچھ انسانی کمزوریاں ہوں تو ان پر ان شخصیتوں کے مداحین عقیدت کے پردے ڈال دیتے ہیں۔ لیکن غالب ایک ایسی شخصیت ہے جس نے انسانی کمزوریوں کو خود ہی بیان کر دیا ہے۔ اور اس طرح وہ ایک ایسے مثالی انسان کی شکل میں سامنے آتے ہیں جو انسان کامل نہیں ہے لیکن اس کا کلام پڑھ کر دوسرے آدمی انسانِ کامل بن سکتے ہیں۔ اس کا سبب غالب کی سچائی، بیباکی اور حق گوئی ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ وہ اپنی وضع قطع سے لیکر شاعری اور نثر تک روش عام پر چلنے سے گریزاں رہے۔

غالب پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور آئندہ بھی لکھا جاتا رہے گا۔ ہر مرحلے پر یہ محسوس ہوتا ہے کہ اب غالب شناسی کا سارا عمل مکمل ہو چکا ہے اور مزید کچھ کہنے کی گنجائش نہیں رہی۔ غالب کا ایک شعر ہے:

بلائے جاں ہے غالب اس کی ہر بات
عبارت کیا، اشارت کیا ادا کیا

یہ شعر غالب کے معشوق سے زیادہ خود غالب پر ہی صادق آتا ہے کہ کوئی نہ کوئی گوشہ اس کی شاعری اور شخصیت کا تازہ کاری کی طرف رہنمائی کرہی دیتا ہے۔

ٹی ایس ایلیٹ نے اپنے مضمون روایت اور انفرادی صلاحیت میں یہ بھی لکھا ہے کہ نوجوانی میں تو ہر شخص شاعر ہوتا ہی ہے لیکن اگر اس کے بعد بھی کوئی شاعر رہنا چاہے تو مرے پاس اس کا ایک نصاب ہے۔ اس میں ایلیٹ نے مغربی ادب کے حوالے سے بات کی ہے کہ ایسے شاعر کو ہومر سے لے کر اپنے عہد تک کے معاصرین کے کلام سے کما حقہ، واقفیت ہونی چاہیے۔ ساتھ ہی اس نے روایت کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے کہا کہ روایت کے معنی قدامت نہیں ہیں یہ ایک تسلسل ہے جو ایک زمان سے دوسرے زمان تک جاری رہتا ہے۔ لہٰذا ایسے شاعر کے یہاں ماضی کی ماضیت Pastness of the past ہونا چاہیے۔

اب ذرا مرزا غالب کی دانشورانہ کیفیت پر نظر ڈالیے تو اس معیار پر صرف وہی پورے اترتے ہیں کیونکہ ژن، پاژن اور اوستا سے لے کر یورپی فارسی شاعری نثر نگاری، تاریخ و احوالِ ملل سے گزرتے ہوئے اور اپنے معاصر ایرانی شاعر قاآنی سے نہ صرف واقف تھے بلکہ مطالعہ کے لیے آخر وقت تک اس کا دیوان غالب کے سرہانے رکھا رہتا تھا۔ پھر محض علم اور آگہی سے ہی بڑا شاعر معارض وجود میں نہیں آتا بلکہ اس کے یہاں تخلیق کی وہ صلاحیت ہونی چاہیے جس سے ظاہر ہو کہ وہ مضمون شعر کا پابند نہیں بلکہ مضمون شعر اس کی تخلیقی صلاحیت کا پابند ہے۔

ما نبودیم از ایں مرتبہ راضی غالب
شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فنِ ما

اس کے علاوہ بھی غالب کی فکر اور شخصیت کے متعدد پہلو ہیں جن میں فلسفیانہ فکر، ظرافت و شوخی، انسان دوستی اور ذرے سے لے کر کائنات تک ایک اسرارِ زیست کو سمجھنے اور پیش کرنے کی مسلسل کاوش۔

ڈاکٹر جمال نقوی جو ایک ترقی پسند شاعر اور نقاد ہیں اب تک متعدد موضوعات پر اپنی تصانیف پیش کر چکے ہیں۔ ان کے یہاں ادب شناسی اور فروغ ادب کا ایک ختم نہ

ہونے والا جذبہ ہر وقت موجود رہتا ہے۔ اسی جذبہ نے ان کی تصانیف میں خاصا تنوع پیدا کر دیا ہے۔

زیرِ نظر کتاب 'ہمہ رنگ غالب' ان کی تحقیقی اور تنقیدی مضامین کا گلدستہ ہے۔ اس میں غالب کی تخلیقی جہات کو بہت انہماک سے زیرِ مطالعہ لایا گیا اور اپنی ذاتی تنقیدی فکر کے ساتھ ساتھ مشرق و مغرب کے اکابر ادب کے افکار و خیالات سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

غالب شناسی کی اس انداز کا آغاز تو ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کے 'محاسن کلام غالب' سے ہوا تھا اس ضمن میں کچھ ناقدین نے بجنوری سے اختلاف بھی کیا تھا لیکن جیسے جیسے ہمارے معاشرے میں علم و آگہی کے نئے دریچے کھلتے چلے گئے تو اندازہ ہوا کہ غالب کے یہاں تو امکانات کی ایک وسیع و عریض کائنات موجود ہے۔ اگر آپ کے پاس نئے علوم کی خوردبین اور دوربین ہے تو آپ اس کے اس عالم تخیل کی نئے نئے زاویوں سے سیر کر سکتے ہیں۔

ڈاکٹر جمال نقوی نے غالب کے کلام سے موقع محل کے مطابق اشعار بھی پیش کیے ہیں اور ناقدین کی آراء بھی اس طرح یہ مضامین قلم برداشتہ یا سرسری نوعیت کے نہیں ہیں بلکہ ان سے غالب شناسی کے مزید رخ سامنے آ سکتے ہیں۔ ان مضامین میں غالب سے متعلق بعض اہم تصانیف کا حوالہ بھی آیا ہے اس لیے ڈاکٹر جمال نقوی نے کتاب کے آخر میں خواجہ حسن نظامی کا مرتب کردہ غالب کا روزنامچہ، دستنبو، محاسن کلام غالب جیسی کتابوں کے متن بھی شامل کر دیے ہیں چونکہ یہ عام طور پر دستیاب نہیں۔

کتابیات کے ساتھ 'احوال غالب' (مرتبہ کالیداس گپتا رضا) کے عنوان سے غالب اور ان کے عہد کی اہم تاریخوں کو واقعات کے تناظر میں پیش کیا ہے یہ بھی ایک اچھا اضافہ ہے۔

اس کتاب کی اشاعت پر میں ڈاکٹر جمال نقوی کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ ان کا یہ ادبی سفر اسی طرح جاری رہے۔

پیش لفظ

غالب جس کے لیے اس کے زمانے میں یہ کہا جاتا تھا کہ 'ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے' اسی کو اور اس کی تحریروں کو ایک صدی گزرنے کے بعد اتنا سمجھا جا رہا ہے کہ نہ تو اس پر سوچنے اور لکھنے والے تھکتے ہیں اور نہ ہی پڑھنے والوں میں کوئی کمی واقع ہوتی ہے۔ اس کے برعکس اس کی مقبولیت میں روز بروز اضافہ ہی ہو رہا ہے۔ اور مستقبل شناس غالب نے یہ پیشین گوئی تو پہلے ہی کر دی تھی:

کوکبم را در عدم اوجِ قبولے بودہ است
شہرتِ شعرم بہ گیتی بعدِ من خواہد شدن

اسی لیے علامہ اقبال نے بجا طور پر ارشاد فرمایا تھا کہ 'مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے اور مولانا ابوالکلام آزاد کی اس بات کے جواب میں کہ 'کسی زبان ادب کا پیمانہ عظمت یہ ہے کہ اس کا کتنا حصہ عالمی ادب کو دین ہے'، پروفیسر آل احمد سرور نے تحریر کیا ہے کہ غالب کی کچھ غزلیں عالمی ادب کو اردو کا عطیہ ہیں۔

۱۸۹۷ء میں الطاف حسین حالی کی شائع ہونے والی کتاب 'یادگارِ غالب' کو اولیت کا شرف حاصل ہے اور اس نیک شگون کی وجہ سے اب تک 'غالب' ایک محبوب

موضوع بنا ہوا ہے۔ محققوں، ناقدوں، مصوروں اور مصنفوں نے اپنے اپنے انداز میں اس کی تحریروں کی تشریحیں کر کے اسے خراج عقیدت پیش کیا۔ لیکن ابھی تک یہ کہا جا رہا ہے...... حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔

میں کیا اور مجھ جیسے ادب کے طالب علم کی بساط ہی کیا مگر میں نے غالب شناسی کے موضوع پر جو کچھ پڑھا، سمجھا اور محبان غالب کی تحریروں سے جو کچھ استفادہ کیا وہ بزم غالب میں خراج عقیدت کے طور پر حاضر ہے۔

شکریہ

کراچی، فروری ۲۰۱۷ء ڈاکٹر جمال نقوی

drjamalnaqvi@gmail.com

ہمہ رنگ غالب

(دبیرم، شاعرم، رندم، ندیمم شیوہ ہا دارم)

یہ حقیقت ہے کہ غالب باضابطہ طور پر نہ فلسفی تھے، نہ صوفی تھے، نہ سائنس دان تھے اور نہ ہی ترقی پسند تھے مگر کلام غالب گنجینۂ معنی کا وہ طلسم کدہ ہے جس میں ہر موضوع پر اشعار دستیاب ہیں۔

غالب کے فلسفیانہ خیالات اور منطقی استدلال پر مبنی چند اشعار دیوانِ غالب سے پیش کیے جاتے ہیں:

فلسفۂ حیات:

قیدِ حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے، خونِ گرم دہقاں کا

کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیا سعیٔ آزادی
ہوئی زنجیرِ موجِ آب کو فرصت روانی کی

فلسفۂ عشق:

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا
صنائے پائے خزاں ہے، اگر بہار ہے بھی
دوامِ کلفتِ خاطر ہے عیش دنیا کا

فلسفۂ غم:

رنج کا خوگر ہوا انساں، تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

فلسفۂ طاعت:

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود
قبلہ کو اہلِ نظر، قبلہ نما جانتے ہیں

فلسفۂ شوق (منطقِ استدلال):

شوق ہر رنگ رقیبِ سروساماں نکلا
قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

غالب صوفی نہ ہوتے ہوئے بھی تصوف کے رمز آشنا ضرور تھے۔ اسی لیے مولانا الطاف حسین حالی نے 'یادگارِ غالب' میں تحریر کیا:

''علمِ تصوف سے جس کی نسبت کہا گیا ہے کہ 'برائے شعر گفتن خوب است'، ان کو خاص مناسبت تھی۔ حقائق و معارف کی کتابیں اور رسالے کثرت سے ان کے مطالعے سے گزرتے تھے اور سچ پوچھیے تو انہیں متصوفانہ خیالات نے مرزا کو نہ صرف اپنے ہم عصروں میں بلکہ بارہویں اور تیرہویں صدی کے تمام شعراء میں ممتاز بنا دیا تھا۔''

غالب نے خود بھی کہا ہے کہ:

یہ مسائل تصوف، یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دو چار ہوتا

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

سائنسداں نہ ہوتے ہوئے بھی غالب نے سائنسی مضامین کو بڑی خوبصورتی سے اپنے کلام میں پیش کیا ہے:

ضعف سے گریۂ مبدل بدمِ سرد ہوا
باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے، ہوا کیا ہے

اور اس زمانے میں ترقی پسندی کا تصور نہ ہوتے ہوئے بھی ان کے مندرجہ ذیل شعر سے زیادہ روشن خیالی کہاں ملے گی:

لکھتے رہے جنوں کی حکایت خوں چکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

جس کو بعد میں ترقی پسند شاعر فیض احمد فیض نے یوں نظم کیا:

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے

غالب کو ہمیشہ یہ شکایت رہی کہ تنگنائے غزل 'بقدرِ ظرف' نہیں ہے مگر انہوں

نے غزل کے اسی پیکر میں بحرِ بیکراں سمو دیے، یاں یوں کہوں کہ غزل کے کوزے میں سمندر کو بند کر دیا۔ جبکہ اس سمندر میں مندرجہ بالا خصوصیات کے علاوہ مابعد الطبیعات، اخلاقیات، مخدوفات، آشوبِ حالات، اور انکشافِ ذات غرض زندگی کا شاید ہی کوئی پہلو بچا ہو جس کے رنگ ان کے کلام میں موجود نہ ہوں۔ اسی لیے اردو دنیا کی معتبر ہستیوں نے انہیں یوں خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے تحریر کیا کہ: ''ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں، ایک وید مقدس اور دوسری دیوانِ غالب۔ اس خیال کے لیے ان کو اشارہ خود غالب کی فارسی رباعی سے ملا جس سے اس نے دعویٰ کیا ہے کہ اگر فنِ سخن کوئی دین ہوتا تو اس دین کی ایزدی کتاب 'یہ' یعنی دیوانِ غالب ہوتی۔

نیاز فتح پوری غالب کی شاعری کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

''غالب کی شاعری ماضی کی داستان نہ تھی بلکہ مستقبل کا نفسیاتی رجحان تھی جو اول اول نامانوس سی چیز معلوم ہوتی تھی، بعد کو وہی زمانے کی انتہائی تمنا قرار پائی۔ غالب چوں کہ فطرتاً بڑا خود آگاہ شاعر تھا اس لیے وہ خود بھی ان پوشیدہ حقیقتوں اور اپنے اندر چھپے امکانات سے واقف تھا۔''

مجنوں گورکھپوری کہتے ہیں کہ ''اردو غزل کی رفتار میں غالب ایک نیا رہنما ہے اور 'دیوانِ غالب' ایک نیا موڑ، وہ اگر شاعر نہ ہوتا تو خود اپنا ایک نظامِ فکر رکھنے والا بہت بڑا فلسفی ہوتا اور اگر وہ کسی دوسرے ملک میں ہوتا تو ایک مفکر کی حیثیت سے واقعی ہیگل اور گوئٹے کی صف میں کھڑا ہوتا۔ مگر آج غالب شاعر ہوتے ہوئے بھی مفکر ہے۔ وہ اردو کا پہلا مفکر شاعر ہے کیوں کہ وہ زندگی کی رفتار اور زندگی کی تمام پیچیدگیوں اور تہہ داریوں کا شعور رکھتا ہے۔

وہ اردو کا پہلا شاعر ہے جو دلی واردات اور ذہنی کیفیات کو صرف بیان کر کے نہیں رہ جاتا بلکہ ان پر مفسرانہ نگاہِ بازگشت بھی ڈالتا ہے۔ غالب نے اقبال کو پیدا کیا اور اقبال نے بعد کے تمام اردو شاعروں کو پیدا کیا۔'

علامہ اقبال غالب کی عظمت کا اعتراف ان کو مخاطب کرتے ہوئے یوں فرماتے ہیں:

محوِ حیرت ہے ثریا رفعتِ پرواز پر
نطق کو سو ناز ہیں تیرے لبِ اعجاز پر

ڈاکٹر سلیم اختر تحریر کرتے ہیں کہ مابعد الطبعیات، اخلاقیات، عصری شعور، انکشافِ ذات، تصورِ غم، طنز و مزاح، غرض یہ کہ زندگی کا شاید ہی کوئی ایسا پہلو بچا ہو جس پر غالب کی نگاہ نہ گئی ہو اور اس نے اس کے بارے میں اظہارِ خیال نہ کیا ہو، مفصل نہ سہی مختصر سہی، لیکن ایسا اختصار جو ایمائیت کے جوہر سے منور ہو۔ واضح رہے کہ غالب نظم گو نہ تھا وہ اس غزل کا شاعر تھا جس میں دو مصرعوں اور گنتی کے چند الفاظ میں مفہوم کا ابلاغ کرنا ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ عمر بھر اس کا شاکی رہا کہ یہ تنگنائے غزل 'بقدرِ ظرف' نہیں ہے لیکن اس کے باوجود اس نے اسی تنگنائے میں معانی کے بحرِ بیکراں سمو دیے۔ دو مصرعوں کے کوزہ میں اگر دریا بندی کا عمل دیکھنا ہو تو 'دیوانِ غالب' سے بہتر مثال اور کہیں نہیں ملے گی۔ شاید اسی لیے عبدالرحمٰن بجنوری نے کلامِ غالب کو الہامی قرار دے کر 'وید مقدس' کا ہم پلہ قرار دیا تھا۔ بدلتے ادبی ذوق اور متغیر شاعرانہ معیار کے باوجود بھی غالب ہر عہد میں غالب ہی رہا۔ تو اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ غالب ہر عہد کے قاری سے مکالمہ کرنے کی صلاحیت کی وجہ سے ہر زمانے کے لیے اپنی حیثیت، اہمیت اور ضرورت برقرار رکھ سکتا ہے۔ کلام کی دیگر خصوصیات بھی یقیناً قابلِ توجہ ہیں اور ان سے صرفِ نظر ممکن نہیں لیکن بنیادی وجہ یہی ہے کہ غالب اپنے زمانے سے آگے تھا۔

غالب کی ہمہ رنگی فارسی اور اردو میں صرف اس کی شاعری ہی سے نہیں بلکہ نثر میں تحریر کردہ اس کے خطوط، اس کی تاریخ نویسی اور الفاظ ولغات پر اس کی قدرت سے ظاہر ہوتی ہے۔ غالب ایک کثیر التصانیف قلم کار تھا لہٰذا مطالعہ غالب کا حق ادا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ۱۸۴۱ء سے ۱۸۹۹ء تک شائع ہونے والی ان کی مندرجہ ذیل تصانیف کا بھرپور مطالعہ کیا جائے۔ ان کا پہلا اردو دیوان سرسید کے بھائی سید محمد خاں بہادر مالک مطبع سید المطابع وسید الاخبار نے شائع کیا:

۱۔ دیوان اردو، طبع اول، ۱۸۴۱ء، سید المطابع دہلی
۲۔ دیوان فارسی، طبع اول، ۱۸۴۵ء، دارالسلام، دہلی
۳۔ پنج آہنگ، طبع ثانی، ۱۸۴۹ء، دارالسلام، دہلی
۴۔ مثنوی بہادر شاہ ۱۸۵۳ء، دارالسلام، دہلی
۵۔ مہر نیم روز، طبع اول، ۱۸۵۵، فخر المطابع، دہلی
۶۔ دستنبو، طبع اول، ۱۸۶۲، مفید الخلائق، آگرہ
۷۔ کلیات نظم فارسی، ۱۸۶۳ء، نولکشور، لکھنو
۸۔ قاطع برہان، ۱۸۶۴ء، نولکشور، لکھنو
۹۔ قادر نامہ غالب، ۱۸۶۴ء، مجس پریس، دہلی
۱۰۔ مثنوی ابر گہر بار، طبع اول، ۱۸۶۴ء، اکمل المطابع، دہلی
۱۱۔ اسمائے فارسی، طبع اول، ۱۸۶۴ء
۱۲۔ سوالات عبدالکریم، طبع اول، ۱۸۶۴ء، اکمل المطابع، دہلی
۱۳۔ لطائف غیبی، طبع اول، ۱۸۶۴ء
۱۴۔ نامہ غالب، طبع اول، ۱۸۵۶ء
۱۵۔ درفش کاویانی، ۱۸۶۵ء، اکمل المطابع، دہلی

۱۶۔ رقعات غالب (فارسی)، ۱۸۶۷ء

۱۷۔ تیغ تیز، ۱۸۶۷ء، اکمل المطابع، دہلی

۱۸۔ سبد چین، طبع اول، ۱۸۶۷ء، مطبع دہلی

۱۹۔ کلیات نثر فارسی، ۱۸۶۷ء، نولکشور، لکھنو

۲۰۔ عود ہندی (اردو)، ۱۸۶۸ء، مطبع مجتبائی میرٹھ

۲۱۔ اردوئے معلیٰ (اردو) ۱۸۹۹ء

مندرجہ بالا کتب میں ہمہ رنگ متفرق موضوعات کے علاوہ غالب نے نعت وسلام لکھنے کا اعزاز بھی حاصل کیا۔ چند اشعار دیکھئے:

نعت:

حق جلوہ گر ز طرز بیان محمدؐ ست
آری کلام حق بزبان محمدؐ ست
غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتیم
کاں ذات پاک مرتبہ دان محمدؐ ست

سلام:

سلام اُسے کہ اگر بادشاہ کہیں اس کو
تو پھر کہیں کہ کچھ اس سے سوا کہیں اس کو
بھرا ہے غالب دل خستہ کے کلام میں درد
غلط نہیں ہے کہ خونیں نوا کہیں اس کو

اردو کا پہلا فلسفی شاعر

شاعری اور فلسفہ ہمیشہ دو مختلف چیزیں سمجھی جاتی رہی ہیں۔ مگر ارسطو نے یہ کہہ کر کہ شاعری تاریخ سے زیادہ فلسفیانہ ہے کیونکہ تاریخ وقتی چیزوں سے سروکار رکھتی ہے جبکہ شاعری آفاقی چیزوں سے، اس مفروضے کو ختم کرنے کی کوشش کی اور ہمیں سوچ کی ایک نئی جہت دی۔ مغرب میں شاعری اور فلسفہ کی ہم آہنگی انیسویں صدی سے شروع ہوتی ہے اور اس کی ابتداء گوئیٹے کے کلام سے ہوتی ہے۔ اب بڑے شاعر کا فلسفی ہونا لازمی قرار دیا گیا اور ایسی شاعری آفاقی شاعری کے زمرے میں گنی جانے لگی۔

مشرقی شاعری جو ابھی تک مذہبی روایات اور تصوف تک محدود تھی اس میں غالب وہ پہلا شاعر تھا جس کے حکیمانہ اندازِ فکر نے اس روایتی اور محدود دنیا سے نکل کر نئی دنیا کا احساس پیدا کیا۔ یہ دنیا ماضی وحال سے آگے بڑھ کر مستقبل کے رنگ وآہنگ، فکرو احساس اور شعور وادراک کی دنیا تھی۔ غالبؔ اسے آفاقی تجربوں، ذہن اور شخصیت کی بے پناہ وسعتوں اور اعتماد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

ہوں گرمئی نشاطِ تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیب گلشنِ نا آفریدہ ہوں

اور اسی گلشن نا آفریدہ کے عندلیب اسد اللہ خاں غالب کو اس کا اپنا عہد پوری طرح نہ سمجھ سکا کیونکہ وہ اپنے زمانے سے بہت آگے تھا اور جب زمانہ آہستہ آہستہ فکر و وجدان کے اس معیار کے قریب پہنچا جہاں سے غالب کے افکار و خیالات کی ابتدا ہوتی تھی تب اس کی شعری عظمت ابھر کر سامنے آئی اور غالب شناسی کار جحان عالمی سطح پر پیدا ہوا۔

غالب کی عظمت کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ وہ بہ یک وقت ماضی، حال اور مستقبل کا شاعر ہے اور اسی لیے ہر زمانے کے قاری کو اس کے کلام میں اپنا عکس نظر آتا ہے۔ ان کے ہاں زندگی کا ایک فلسفیانہ احساس ملتا ہے۔ جس میں رنج و راحت دونوں کے لیے گنجائش ہی نہیں بلکہ طلب بھی ملتی ہے۔

ڈاکٹر اے بی اشرف اپنے ایک مضمون میں تحریر کرتے ہیں:

''اسلوبیاتی سطح پر غالب متحرک جمالیات کا حامل ہے۔ بیشک وہ زندگی کو فانی تصور کرتا ہے۔ اس کا تصور حیات بڑا حرکی اور فعال ہے۔ وہ زندگی میں حرکت و فعالیت کو بڑی اہمیت دیتا ہے۔ اس طرح وہ اقبال کے حرکی فلسفے کے قریب تر ہے۔ غالب کے نزدیک اس دائمی حرکت و عمل کی محرک انسانی تمنا اور آرزو ہے:

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب
ہم نے دشت امکاں کو ایک نقش پا پایا
نہ ہو گا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا
حبابِ موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا

غالب کی فکری، آفاقی، اور فلسفیانہ شاعری انہیں اپنے ہم عصر شعراء میں ممتاز مقام دلاتیہ ہے۔ انہوں نے ایک فلسفی کی طرح سوالات اٹھائے ہیں:

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

ہے پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود
قبلہ کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں
منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے ادھر ہوتا کاش کہ مکاں اپنا
مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولٰے برق خرمن کا ہے خون گرم دہقاں کا
نظر میں ہے ہماری جادۂ راہ فنا غالب
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

غالب نے جو کچھ لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی معلومات محض کتابی نہ تھیں بلکہ اپنی ذہانت اور ذاتی تجربہ کی وجہ سے وہ قدیم تصورات سے آگے جانا چاہتے تھے۔ نئی باتوں کو سمجھنا اور ان کو برتنا چاہتے تھے، وہ اخبارات پڑھتے اور دنیا کے حالات سے باخبر رہنا چاہتے تھے۔ ان کے فلسفۂ حیات کی ایک نمایاں خصوصیت اس نئے نظام کی برکتوں سے ان کی آگاہی تھی جو ازمنہ وسطیٰ کے پرانے اداروں کی جگہ لے رہا تھا۔

غالب کی تجسس آمیز فکر کے بارے میں پروفیسر احتشام حسین نے اپنے ایک مضمون 'غالب کی بت شکنی' میں تحریر کیا ہے:

> "غالب کا زمانہ عام انسانوں کے لیے تقلید اور روایت پرستی کا زمانہ تھا اور حساس انسانوں کے لیے تشکیک کا۔ غالب بھی شک کا شکار تھے لیکن شکوک کو روندکر آگے بڑھ جانا چاہتے تھے۔"

اسی وجہ سے وہ اس بات سے واقف تھے کہ اگر بے عملی کی زندگی ختم ہو جائے تو کچھ نہ کچھ ہو رہے گا، دنیا امکانات سے بھری ہوئی ہے۔

کچھ نہ کی اپنے جنونِ نارسا نے ورنہ یاں
ذرہ ذرہ روکش خورشید عالمتاب تھا

غالب خود بھی جدید ترقی پسند خیالات ورجحانات سے متاثر ہوئے۔ انہوں نے خود کائنات کا مطالعہ کیا اور دوسروں کو بھی اس مطالعے کی دعوت دی:

نہیں گر سر و برگ ادراک معنی
تماشائے نیرنگ صورت سلامت

وہ سائنسی اور فلسفیانہ فکر کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ اسی لیے وہ فلسفی، مفکر اور انسانی فطرت کے نباض کہے جاتے ہیں:

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

وہ ہر شخص میں آفاقیت کا عنصر پیدا کر دینا چاہتے ہیں اور اسی کو دعوت فکر دیتے ہیں کہ ہر شئے میں جو راز چھپے ہوئے ہیں اس کے چہرے سے پردے اٹھائے جائیں اور ماضی وحال سے سبق لے کر مستقبل سنوارا جائے۔

بخشے ہے جلوہ گل ذوق تماشا غالب
چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا

اہل بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب
لطمۂ موج کم از سیلئ استاد نہیں

شاعر اور فلسفی دونوں دائمی اور آفاقی حقیقتوں تک پہنچتے ہیں مگر دونوں کے راستے جدا جدا ہوتے ہیں۔ شاعر کا راستہ تخیل اور ادراک کا راستہ ہے۔ جبکہ فلسفی کا دلیل و بحث کا۔ لہٰذا شاعر کے فلسفی ہونے کا معیار یہ طے پایا کہ آیا شاعر ان آفاقی بلندیوں تک پہنچتا ہے یا نہیں جہاں تک فلسفی پہنچا ہے۔ اس لیے بنیادی طور پر یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ شاعر نے ہمارے

شعور کو ہماری فکر کو کہاں تک آگے بڑھایا ہے اور کن آفاقی اور ابدی صداقتوں کو تجربے کی بھٹی میں کندن بنا کر پیش کیا ہے۔ مندرجہ بالا چند اشعار سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ غالب کی شاعری اس معیار پر پوری اترتی ہے۔

غالب کی نظر ایک فلسفی کی نظر ہے اور وہ جن چیزوں کو سامنے لاتا ہے تخیل، جذبے اور تجربات کے ذریعے ان کو دائمی حقیقت اور گہرائی تک پہنچا دیتا ہے۔ ان کی شاعری میں وہ تمام فلسفیانہ خیالات موجود ہیں جو کسی بڑے فلسفی کے یہاں ملتے ہیں۔ اگر ان کے یہاں ایک طرف تصور کی موجودگی ہے تو دوسری طرف حیات و کائنات کا ذاتی مطالعہ بھی ملتا ہے۔

غالب ایسا فلسفیانہ ذہن رکھتے تھے جو جذبے سے بڑھ کر فکر کی طرف لے جاتا ہے۔ انہوں نے اردو شاعری کو ایک ذہن دیا۔ یہ ذہن اپنے زمانے کے تہذیبی اثرات سے باخبر ہے، فلسفے اور تصوف کے مسائل کو جانتا ہے، مذہبی اور اخلاقی قدروں سے آشنا ہے۔ غالب کا حکیمانہ اور شاعرانہ استدلال غور و فکر کی طرف مائل کرتا ہے اور انہیں معنوں میں وہ آفاقیت رکھتے ہیں۔ ان کے یہاں فلسفیانہ نظام نہیں، بلکہ فلسفیانہ طریق فکر اور انداز بیان ملتا ہے۔ ان کے اکثر اشعار گہرے طور پر فلسفیانہ ہیں بقول حالی وہ فلسفیانہ متن کی وضاحت میں ماہر تھے۔

اس کے ساتھ ہی انہوں نے شاعرانہ انداز بیان کو برقرار رکھا ہے اور یہی ان کے کلام کی خوبی ہے۔ غالب کا فلسفیانہ، حیات عمل، حرکت اور حرارت پر مبنی ہے وہ عموماً زندگی سے مفاہمت کے بجائے مقابلے کی خواہش رکھتے ہیں اور حیات میں حرکت و نمو کے خواہاں ہیں۔

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

فلسفہ کا اہم مسئلہ یہ رہا ہے کہ مادی محسوسات کا کوئی وجود نہیں ہوتا ہم ان کی خصوصیات کی بناء پر ان کو محسوس کرتے ہیں لہٰذا ہستی یعنی مادے کا وجود نسبتی ہے۔ اس کو غالبؔ نے اپنے پیرایہ بیان میں یوں کہا ہے:

جز نام نہیں صورت عالم مجھے منظور
جز وہم نہیں ہستی اشیا مرے آگے

فلسفہ قدیم میں مادے کے مقابلے میں روح کو اولیت کا درجہ حاصل ہے اور غالب بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔

ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے
پر تو سے آفتاب کے ذرہ میں جان ہے

افلاطونی فلسفہ کے مطابق تمام اشیاء اپنی اصل کی طرف بازگشت کرتی ہیں اور غالب بھی اپنے شعر میں اس کی ترجمانی کرتے ہیں:

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

تخلیقی ارتقا کا جدید ترین نظریہ فرانسیسی فلسفی برگساں نے پیش کیا ہے، جو عقل سے کہیں زیادہ وجدان کا قائل ہے۔ غالبؔ نے اس سلسلے میں اپنی شاعرانہ بصیرت کا اظہار یوں کیا ہے:

آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیش نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

فلسفیوں نے حقیقت کی تاویل اس طرح سے کی تھی کہ حقیقت مطلق نور ہے مگر وہ اپنے اظہار کے لیے مادہ کا محتاج ہے اور غالب بھی اس کی تائید یوں کرتے ہیں۔

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینہ باد بہاری کا

بقول علی سردار جعفری......

"یہاں غالب ہیگل کی جدلیت کے قریب پہنچ جاتا ہے اور اقبال کے فلسفۂ خودی کے ابتدائی نقوش قائم کرتا ہے۔"

غالب کے یہاں فلسفیانہ خیالات کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ مگر جو تصور ان کے پورے فلسفے پر چھایا ہوا ہے وہ عقیدہ وحدت الوجود ہے۔ جس کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ فطرت ہی خدا ہے اور کائنات کا خدا سے الگ کوئی وجود نہیں ہے۔ اسی فلسفے کی بنیاد پر انہوں نے ہمیشہ بدلتے ہوئے نظام حیات کا تصور پیش کیا ہے:

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

غالب کے ان فکری رجحانات اور ترقی پسندانہ خیالات سے صحیح معنوں میں فائدہ اٹھانے والوں میں علامہ اقبال کا نام سرِفہرست ہے کیونکہ اقبال جو بات کہنا چاہتے تھے وہ صرف غالب کی زبان میں ہی ادا ہو سکتی تھی لیکن ان کا وجدان منفرد ہے۔ اس طرح اردو کے اس پہلے فلسفی شاعر کو اپنا ہمنوا مل گیا جس نے اس جدید دور میں بھی شاعری اور فلسفے کو یکجا کر کے اردو ادب کو زندہ جاوید بنا دیا۔

اے بی اشرف کہتے ہیں کہ غالب کے سامنے کوئی اجتماعی فلسفہ نہ تھا، نہ وہ کسی انقلاب کا داعی اور ہیئت اجتماعی کو انقلاب آشنا کرنے کا حوصلہ رکھتا تھا تاہم وہ انسانی آزادی کا خواہاں، رسوم و قیود کی پابندیوں کا ماتمی اور ایک نئی دنیا کی حسرتِ تعمیر ضرور رکھتا تھا تاکہ شخصی نشوونما میں رکاوٹ پیدا نہ ہو:

رفتم کہ کہنگی ز تماشا بر افگنم
در بزمِ رنگ و بو نمطے دیگر افگنم

غالب نے اپنی جذباتی حسیات کو فکریاتی رنگ میں سمو کر شاعری کو فلسفہ تو نہیں بنایا لیکن بقول آلِ احمد سرور 'ایک ذہن ضرور عطا کیا'۔

ہاں! کلام غالب سے یہ واضح ہے کہ وہ متحرک جمالیات کا حامل ہے۔ اس کا تصورِ حیات بڑا حرکی اور فعال ہے۔ اسی لیے وہ زندگی میں حرکت اور فعالیت کو بڑی اہمیت دیتا ہے۔ اس طرح وہ اس حرکی فلسفے سے بہت قریب ہے۔ جس کی محرک انسانی تمنا اور آرزو ہے:

دیر و حرم آئینۂ تکرار تمنا
واماندگی شوق تراشے ہے پناہیں

اسی بات کو پروفیسر خورشید الاسلام نے بھی ان کے تنگیٔ کائنات کے گلے اور خواہش و احساس وسعت کی بنیاد پر اپنے انداز میں یوں بیان کیا ہے کہ وہ دوریٔ منزل سے پریشان رہتے تھے اور ان میں دریاؤں میں طغیانی پیدا کرنے والے پانی کا سا جوش تھا جو ان کی فطرت کا اقتضاء تھا۔ اس سوچ کو انہوں نے اپنے انداز میں یوں تحریر کیا ہے:

غالب شوق پر دل کی وسعتوں، جنوں پر دل کی دشت کی پنہائیوں اور معنی پر الفاظ کے سانچوں کو تنگ پاتے ہیں۔ وہ حرکت چاہتے ہیں اور ان کے شوق کی انتہا نہیں ہے وہ دریا کا سا جوش رکھتے ہیں اور اپنی رفتار کے آگے بیابان کو بھی خاطر میں نہیں لاتے۔ اسی لیے انہوں نے کہا:

ہر قدم دوریٔ منزل ہے نمایاں مجھ سے
میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے
نہ ہو گا اک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا
حبابِ موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا

میں اپنی گفتگو کو ٹی ایس ایلیٹ کے اس قول پر ختم کروں گا کہ شاعر حقیقی معنوں میں مفکر، فلسفی یا نظریہ ساز نہیں ہوتا مگر نظریے کی دل میں اتر جانے والی ترجمانی انتہائی کامیابی سے کرتا ہے۔ لہٰذا غالب محض شاعر ہی نہیں تھے۔ وہ حکیم اور نکتہ داں بھی تھے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں حکمت اور فلسفے کو بڑی حسن و خوبی سے سمو کر نہ صرف زندگی کی بصیرتوں کو اجاگر کیا بلکہ ان میں اضافہ بھی کیا ہے۔

غالب کی نوائے سروش

قد کشیدہ، حسین وجمیل، ترکی النسل، راست گفتار، خوش اخلاق، فراخ دل، ظرافت مزاج، پرزادے میرزا اسداللہ خاں غالب نے ورثے میں ملی ہوئی تلوار کو تو کبھی نہیں اٹھایا مگر خداداد ذہانت کی بدولت حاصل کیے ہوئے علم سے قلم کو بطور تلوار یوں استعمال کیا کہ آج تک دلوں اور ذہنوں پر ان کی حکومت قائم ہے اور جب تک زبانوں کے اس بازار میں اردو یا ہندی اور فارسی سکۂ رائج الوقت کی حیثیت سے برقرار رہیں گی غالب کی حکومت بھی قائم ودائم رہے گی۔ اسی لیے یہ بات صد فیصد درست ہے کہ غالب صرف ایک فرد یا ایک شاعر کا نام نہیں، یہ ایک عہد، ایک دَور ایک دبستان اور ایک ادائے خاص کا نام ہے جس کی کوئی دوسری مثال خصوصی طور پر اردو ادب میں نہیں ملتی۔ غالب ایک ایسے نابغۂ روزگار دیدہ ور تھے جو ہزاروں سال میں پیدا ہوتے ہیں:

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

غالب نے ۱۷۹۶ء میں ابتدائی تعلیم اپنی جائے پیدائش آگرے میں شیخ معظم سے حاصل کی لیکن فارسی میں مہارت اپنی جستجوئے علم کے تحت ایک پارسی نژاد شخص ہرمزد سے

حاصل کی، اسلام قبول کرنے کے بعد جس کا نام عبدالصمد تھا، جو عربی زبان کا بھی بہت بڑا عالم تھا۔ یہ راز بھی ان ہی کا فاش کیا ہوا ہے اور اس کو مشکوک بنانے میں بھی ان ہی کا دخل ہے جب وہ یہ کہتے ہیں کہ مبداء فیاض کے سوا میں نے کسی سے تلمذ نہیں کیا:

آنچہ در مبداء فیاض بود آں من ست
گل جدا ناشدہ از شاخ بداماں من ست

بہر حال حقیقت جو کچھ بھی ہو پہلے فارسی اور بعد میں اردو زبان میں انہوں نے اپنے ذخیرہ الفاظ سے گنجینۂ معنی کا ایک ایسا طلسم پیدا کر دیا ہے جو آج تک سر چڑھ کر بول رہا ہے۔

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آئے

۱۸۱۰ء یعنی ۱۳ برس کی عمر میں غالب کی شادی دہلی میں مرزا الٰہی بخش خاں معروف کی چھوٹی بیٹی امراؤ بیگم سے قرار پائی۔ جس کے سبب انہوں نے دہلی میں ہی سکونت اختیار کر لی، اور تادم مرگ وہیں کے ہو کر رہ گئے، جب کہ کچھ عرصے کے لیے وہ لکھنؤ، بنارس اور کلکتہ اور بعد میں رامپور بھی تشریف لے گئے۔ کلکتہ کے سفر میں اپنے فارسی کلام پر معترضین کی سخت تنقید کے باوجود وہ انگریزوں کی لائے ہوئی سائنسی ایجادات سے بہت متاثر ہوئے۔ وہاں کے جدید حسن و جمالیات نے ان کے ذہن پر کتنا اثر کیا اس کا اظہار انہوں نے اپنے ایک شعر میں اس طرح کیا ہے:

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے

انہوں نے سرسید کی تصحیح کردہ آئین اکبری کو ایک فضول کام قرار دیا۔ ساتھ ہی انگریزوں کے آئین وقانون و ایجادات کی طرف ان کی توجہ مبذول کرائی جسے وہ اپنی آنکھوں سے کلکتہ میں دیکھ آئے تھے۔ انہوں نے سرسید کو اس مردہ پروری سے منع کرتے

ہوئے تحریر کیا:

مردہ پرور دن مبارک کار نیست
خود بگو کاں نیز جز گفتار نیست

غالب کو اپنے علمی وادبی مرتبے اور صاحبانِ علم واقتدار اور دربار سے باعزت طور پر ملے ہوئے اعزازات پر فخر تھا۔ انہوں نے صاحبانِ اقتدار اور مسند نشینانِ دربار کے قصیدے تو لکھے اور ان کے عوض دیے گئے عطیات تو قبول کیے مگر ۱۸۴۲ء میں دہلی کالج کی مدرسی کی سرکاری ملازمت سے اس لیے انکار کر دیا کہ اس سے ان کے موجودہ اعزاز میں فرق آ رہا تھا۔ ۱۸۵۰ء میں بہادر شاہ ظفر نے انہیں نجم الدولہ، دبیر الملک، نظام جنگ کے خطاب سے نوازا اور چھ پارچے کا خلعت معہ تین رقوم جواہر یعنی جیغہ و سرپیچ وحمائل مروارید کے دربارِ عام میں مرحمت فرمایا اور خاندانِ تیمور کی تاریخ نویسی کی خدمت میں بمشاہرہ پچاس روپیہ ماہوار مامور کیا۔ کتاب کا پہلا حصہ "مہرِ نیمروز" کے نام سے مکمل ہوا مگر دوسرا حصہ 'ماہِ نیم ماہ' غدر کی نذر ہو گیا یعنی لکھا نہ جا سکا۔ ۱۸۵۵ء میں استادِ شاہ شیخ ابراہیم ذوق کے انتقال کے بعد بادشاہ کے اشعار کی اصلاح بھی مرزا غالب کی ذمہ داریوں میں شامل ہو گئی تھی۔

سات بچوں کے پے در پے انتقال کے بعد مرزا بے اولاد تھے، اس لیے انہیں اپنی بیوی کے بھانجے زین العابدین خاں عارف سے بہت محبت تھی جو خوش فکر و خوش گو بھی تھے۔ ان کی جوان موت پر مرزا کو شدید رنج ہوا جس کا اظہار انہوں نے ان اشعار میں کیا:

ہاں اے فلک پیر جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور
جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب! قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

بقول پروفیسر محمد حسن عسکری، ''نوائے سروش بھی دو طرح سے سنی جاتی ہے، کبھی تو سروش اپنے آپ بول پڑتا ہے کبھی اس کے کان مروڑنے پڑتے ہیں۔ سروش کی فیاضی سے تو ہر آدمی ہی ادیب و شاعر بن جاتا ہے مگر سروش کو زبردستی بلوانے کے لیے ہمت درکار ہے، کیوں کہ سروش کے کان مروڑنے کا مطلب ہے اپنے کان مروڑنا''۔

میں سمجھتا ہوں کہ بعض دفعہ غالب نے سروش کے کان اس طرح مروڑے کہ اس کے حوصلے کی داد دینی پڑتی ہے۔ کم فہم لوگوں کے لیے یہ کہنا تو آسان تھا کہ...... ''وہ اپنا کہا خود آپ سمجھے یا خدا سمجھے'' مگر غالب کی یہی نوائے سروش تھی جس نے اسے آج تک زندہ رکھا ہے۔ اردو شاعری میں غالب ایک ایسا تخلیق کار ہے جس نے فارسی شاعری میں اپنا مقام بنانے کے بعد جب اردو شاعری کی طرف توجہ کی تو اس کے منفرد احساسات و جذبات کے فراہم کردہ خام مال نے یہاں بھی اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا اور یہی چیز بالآخر بلندیٔ کلام غالب کا معیار ٹھہری

مرزا غالب نے ۱۸۰۷ء سے اردو زبان میں شاعری کی ابتدا کی اور اسدؔ تخلص اختیار کیا جو بعد میں ۱۸۱۶ء سے غالب قرار پایا۔ مگر ملا عبدالصمد کی پڑھائی ہوئی فارسی اور مرزا بیدلؔ کی فارسی شاعری ذہن پر اس قدر چھائی ہوئی تھی کہ ان کے اشعار سامعین کے ذہنوں پر گراں گزرتے تھے۔ مثلاً اس دور کا ایک شعر دیکھیے:

ہوائے سیر گل، آئینہ بے مہریٔ قاتل
کہ انداز بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا

اس قسم کی تنقید پر مرزا غالب کا ردِعمل یہ تھا کہ وہ روشِ عام پر چلنے کے قائل نہ تھے۔

نہ ستائش کی تمنا، نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

۱۸۲۷ء سے فارسی میں شعر گوئی کا باقاعدہ آغاز کیا۔ ان کے دیوانِ اردو کا پہلا

ایڈیشن ۱۸۴۱ء میں اور دیوانِ فارسی ۱۸۴۵ء میں دہلی سے شائع ہوئے۔ خود غالب اپنی اردو غزلوں کو پیٹ پالنے کی باتیں کہتے ہیں۔ انہیں اپنے فارسی قصیدوں پہ ناز تھا۔ اسی بات کو انہوں نے اپنے ایک فارسی قطعہ میں یوں بیان کیا ہے:

فارسی بیں تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ
بگور از مجموعۂ اردو کہ بے رنگِ من ست
راست می گویم من و از راست. سر نتواں کشید
ہر چہ در گفتار فخر تست آں ننگ من ست

آخرش غالب نے اپنی مشکل پسندی کو ترک کر کے سہل ممتنع میں غزلیں کہیں مگر اچھوتے مضامین کو غزل کے اشعار میں باندھنے کی انفرادیت برقرار رکھی۔ یہی غالب کی 'ادائے خاص' ہے اور ان کا منفرد رنگِ شاعری ہے:

ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نغمہ سرا
صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

اور یہ ادائے خاص ان کو قدرت کی طرف سے ودیعت ہوا تھا جس نے کلکِ باری کی وہ آواز سنی تھی جو نوائے سروش ہے۔ اسی لیے انہوں نے کہا کہ:

آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں
غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

غالب کی نوائے سروش گنجینۂ معنی کا وہ طلسم ہے جس کی تشریح مختلف انداز سے کی گئی ہے۔ مگر غالب شناسی کا ایک اہم نام اردو زبان کے ماہر لسانیات شان الحق حقی بھی ہیں۔ جنہوں نے کلام غالب کے منفرد معانی و مفاہیم کو تلاش کیا ہے۔ وہ اپنے ایک مضمونِ 'شرح نکات غالب' میں تحریر کرتے ہیں:

"اشعار غالب کا مفہوم وہ نہیں ہے جو ان کے معاصرین نے سمجھایا،

بعد کے شارحین نے بیان کیا۔ بلکہ وہ بھی نہیں ہے جو خود غالب نے
بتایا۔ اصل مفہوم وہ ہے جو میرے اور آپ کے دل کو لگے۔ کیوں کہ
عملِ تخلیق بھی ایک مثلث ہے جسے شاعر، کلام اور قاری مل کر پورا
کرتے ہیں۔"

یہ غالب کی نوائے سروش کا کمال تھا کہ اس کے معاصرین اسے پوری طرح نہ سمجھ سکے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ معنی کا یہ طلسم کھلتا ہی چلا جاتا ہے۔ کلامِ غالب کے اسی وصف کو حقی صاحب نے اپنے مضمون میں 'ندرتِ تخیل' کا نام دیا ہے۔ جس کا اظہار غالب کی انوکھی تراکیب سے ہوتا ہے:

بس کہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیرِ پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

غالب کی لفظی اختراعات دنیائے ادب میں اتنی مقبول ہوئیں کہ آج تک بہت شوق سے تصنیفات کا عنوان بنتی چلی آ رہی ہیں۔ مثلاً آشوبِ آگہی، رقصِ شرر، شعلۂ آواز اور گزرگاہِ خیال وغیرہ۔ اس سے غالب کی نوائے سروش کی آفاقیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

غالب۔ منفرد آہنگ، لہجہ اور اندازِ بیان

غالب ندرت پسندی، جدت طرازی اور آہنگ نو کے ساتھ محافل شعر و سخن میں داخل ہوا۔ اس کے جدید لب و لہجہ اور انداز بیان کی وجہ سے ابتدا میں اسے مشکل پسند اور اس کی شاعری کو نامانوس قرار دیا گیا، اور بعض نے تو اپنی سہل پسندی اور شاعرانہ رقابت میں کلامِ غالب کو مہمل و بے معنی بھی کہا۔ لیکن صاحبانِ فکر و نظر کے تذکروں میں کم عمری کے باوجود ان کا ذکر بہتر انداز سے کیا جاتا رہا اور شاعری کے انتخاب میں ان کا کلام منتخب ہوتا رہا۔ مثال کے طور پر میر محمد خاں سرور کا انتخاب 'عمدۂ منتخبہ' اور خوب چند ذکا کا انتخاب 'عیار الشعراء' ہے۔ محققین کی رائے کے مطابق یہ دونوں مجموعے ۱۸۱۲ء تک مکمل ہو چکے تھے۔ یعنی غالب جب عمر کی ۱۵ ویں منزل پر پہنچ رہے تھے (کیوں کہ ان کی تاریخ پیدائش ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء ہے) اس وقت تک ان کی شاعری میں اتنی پختگی آچکی تھی کہ اسے انتخاب میں شامل کرنے کا حق حاصل ہوا۔ اسی لیے خدائے سخن میر تقی میرؔ نے ان کے لڑکپن کے اشعار سن کر یہ کہا تھا کہ اگر اس لڑکے کو کامل استاد مل گیا اور اس نے سیدھے راستے پر ڈال دیا تو لاجواب شاعر بن جائے گا۔ "یادگار غالب" میں الطاف حسین حالیؔ نے اپنے دیباچہ میں غالب کی زندگی ہی میں ان کی مقبولیت کا حال بیان کرتے ہوئے تحریر کیا:

''غالب کا تمام کلام اردو، فارسی نظم ونثر ان کے جیتے جی اطراف
ہندوستان میں پھیل گیا تھا۔ان کے ماننے والے اور مداح وثنا خواں
ملک کے ہر گوشے میں پائے جاتے تھے اور پائے جاتے ہیں۔''

میر مہدی مجروح نے غالب کے انتقال کے اگلے ہی روز یعنی ۱۷ فروری ۱۸۶۹ء کے ''اکمل الاخبار'' دہلی میں غالب پر تحریر کردہ اولین مقالہ میں انہیں فخرِ عرفی قرار دیا ہے۔ اس مقالہ کا عنوان مندرجہ ذیل شعر کی صورت میں تھا:

فخرِ عرفی و رشکِ طالب مرد
اسد اللہ خان غالب مرد

ویسے تو وہ ''استادِ شہ'' بھی مقرر ہوئے اور انہیں دربارِ شاہی سے ''نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ کا خطاب بھی ملا اور خلعت وانعام بھی ملے اس کے علاوہ ریاست رامپور سے وظیفہ بھی جاری ہوا مگر اتنی مقبولیت اور ستائش کے باوجود غالب جیسے عظیم شاعر کو شکوہ تھا کہ ''شہرتِ شعرم بگیتی بعدِ من خواہد شدن'' اس کے علاوہ آج تک ان کی شخصیت وفن پر سب سے زیادہ خامہ فرسائی کی گئی ہے مگر اولیت کا سہرا ''یادگارِ غالب'' کے سر ہے جو ان کے انتقال کے ۲۸ سال بعد یعنی ۱۸۹۷ء تامی پریس کانپور سے شائع کی گئی۔ یہ کام ان کے شاگرد رشید شمس العلماء مولانا الطاف حسین حالی نے انجام دیا۔ فرہنگ وتشریح الفاظ کے علاوہ دو سو صفحات کی اس چھوٹی سی کتاب کو حالی نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا حصہ غالب کے حالاتِ زندگی پر مشتمل ہے جبکہ دوسرا حصہ میں ان کے منتخب اردو کلام پر تبصرہ اور مزید چالیس صفحات میں فرہنگ وتشریح الفاظ دے کر اسے عام فہم بنا دیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اردو زبان میں غالب پرستی کا یہیں سے آغاز ہوا۔

اگرچہ مرزا کی پیدائش آگرے میں ہوئی اور سات برس کی عمر سے دلی میں ان کا آنا جانا رہا لہٰذا اردو زبان ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی لیکن ۱۴ برس کی عمر میں عبدالصمد

(ہرمزد) نے فارسی زبان کی ان میں وہ استطاعت و بصیرت پیدا کر دی جس کا ثبوت شاعری میں ان کے چار فارسی مجموعے سبدِ چین، گل رعنا، کلیات نظم فارسی، انتخاب دیوان فارسی، اور نثر میں قاطع برہان، اور 'درفش کاویانی' سے ظاہر ہوتا ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے 'آب حیات' میں ان کی فارسی شاعری اور انشاپردازی کی تعریف کی ہے اور خود غالب نے بھی کہا تھا:

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بہ گزر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ من است

(میری فارسی شاعری کا مطالعہ کرو تا کہ تم کو نئے نئے نقش و نگار نظر آئیں میرے اردو کے مجموعہ کلام کو چھوڑو کہ اس میں میری شاعری کا رنگ کمال تم کو نظر نہ آئے گا)

"گل رعنا" کے دیباچے میں غالب نے خود تحریر کیا ہے کہ ابتدا میں انہوں نے اردو میں شعر کہنا شروع کیا تھا، لیکن عبدالصمد کی تعلیم کے سبب رنگ فارسی ان کے اشعار میں نمایاں تھا۔ فارسی تعلیم کے تحت انہوں نے مرزا بیدل کے کلام کا زیادہ مطالعہ کیا تھا جس نے زبان فارسی میں جدت پیدا کی تھی۔ اسی روش پر چلتے ہوئے انہوں نے بھی انفرادیت پیدا کرنے کے لیے طرزِ بیدل کی روش اختیار کرنے کی کوشش کی مگر انہیں اس بات کا اعتراف کرنا پڑا کہ:

طرزِ بیدل میں ریختہ کہنا
اسداللہ خاں قیامت ہے

لیکن انہوں نے اپنی مشکل پسندی کو ہی اپنی انفرادیت جانا۔ انہوں نے نہایت جانکاہی اور جگر کاری سے اشعار تخلیق کیے گو کہ لوگ انہیں مہمل قرار دیتے رہے اور ان پر اعتراض کرتے رہے۔ چند ایسے اشعار آپ بھی دیکھیے:

شمارِ سبحہ مرغوب بتِ مشکل پسند آیا
تماشائے بیک کف بردن صد دل پسند آیا

ہوائے سیرِ گل آئینۂ بے مہریٔ قاتل
کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا
لے گئے خاک میں ہم داغ تمنائے نشاط
تو ہو اور آپ بصد رنگِ گلستاں ہونا
یک قدم وحشت سے درسِ دفترِ امکاں کھلا
جادہ اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا

احباب کی نکتہ چینیوں کو انہوں نے شاید کم علمی اور رقابت سمجھا اسی لیے کہا تھا کہ:

نہ ستائش کی تمنا، نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی
گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

لیکن اپنے پُر اعتماد دوست مولوی فضلِ حق کے سمجھانے پر بہت سے اشعار نکال دیے اور اپنے 'دیوانِ ریختہ' کے انتخاب میں ان کو شامل نہیں کیا۔ اس سلسلے میں ان کا کہنا تھا کہ اگر دوستوں کی فرمائش پوری کروں اور آسان شعر کہوں تو یہ اپنی طبیعت کے خلاف نظر آتا ہے اور ایسا نہ کروں تو دوست برا مانتے ہیں:

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل
سُن سُن کے اسے سخنورانِ کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

مگر جو بھی اشعار موجود ہیں اس سے ان کے منفرد لب ولہجہ اور اندازِ بیان کا پتہ چلتا ہے۔ مثلاً ان کے چند اشعار دیکھیے:

قمری کفِ خاکستر و بلبل قفس رنگ
اے نالہ نشانِ جگر سوختہ کیا ہے

حالی کہتے ہیں کہ اس کی تشریح جب انہوں نے مرزا غالب سے چاہی تو انہوں نے کہا کہ 'اے' کی بجز 'پڑھو معنی خود سمجھ میں آ جائیں گے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ قمری جو ایک کف کی خاکستر سے زیادہ اور بلبل جو ایک قفسِ عنصری سے زیادہ نہیں۔ ان کے جگر سوختہ یعنی عاشق ہونے کا ثبوت صرف ان کے چہکنے اور بولنے سے ہوتا ہے۔ یہاں جس معنی میں مرزا نے 'اے' کا استعمال کیا ہے۔ یہ انہی کا اختراع ہے۔ مرزا چوں کہ معمولی اسلوبوں سے تا بمقدور بچتے تھے اور شارعِ عام پر چلنا نہیں چاہتے تھے۔ اس لیے وہ بہ نسبت اس کے کہ شعر عام فہم ہو جائے اس بات کو پسند کرتے تھے کہ طرزِ خیال اور طرزِ بیان اور طرزِ بیان میں جدت اور نرالا پن پایا جائے۔ مرزا کے ابتدائی کلام کو مہمل و بے معنی کہو یا اس کو اردو زبان کے دائرے سے خارج سمجھو مگر اس میں شک نہیں کہ اس کی اوریجنیلٹی (originality)، ایجادِ نو اور غیر معمولی اُپج کا خاطر خواہ سراغ ملتا ہے اور یہی ان کی ٹیڑھی ترچھی چالیں ان کی بلند فطرتی اور غیر معمولی قابلیت واستعداد پر شہادت دیتی ہے۔

غالب اپنے اچھوتے خیالات، منفرد اندازِ بیان اور استدلالی لب ولہجہ کی وجہ سے موجودہ اور آنے والی صدیوں میں بھی زندہ رہے گا۔ ایسے چند اشعار دیکھیے:

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یا رب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ
ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

غالب کا شاعرنہ استدلال، جرأتِ اظہار، ہمتِ عالی، وسیع الخیالی، جدید طرز شوخی اور جدتِ مضامین ان کے اشعار کے خوبی ہے جو انفرادیت پر مبنی ہے اور یہی ان کی خوبیِ بیان ہے۔ جس میں اخلاقیات، تصوف، ظرافت اور رندانہ وعاشقانہ ہر قسم کے مضامین شامل ہیں۔ غالب نے انہی گل بوٹوں سے اپنے کلامِ بلاغت نظام میں جدت اور حسن ادا کی جوت جگائی۔ فیض احمد فیض نے انہیں ایک سماجی تجزیہ کار قرار دیا ہے۔ اسی لیے انہوں نے غالب کی شخصیت کے اس رُخ کو بڑے سلیقے اور اپنے منفرد انداز میں یوں تحریر کیا ہے:

> ”غالب تو اپنے دور کے غم بیان کر رہے تھے جس عہد میں وہ رہتے تھے، جو ان کا معاشرہ تھا، ان پر جو گزر رہی تھی، وہ سارے معاشرے کا دکھ درد، اس عہد کا تجربہ اور تجربے کا درد بیان کر رہے تھے...... غالب کے یہاں داخلی اور ذاتی طریقۂ کار میں سماجی احساس کا عنصر بھی ملتا ہے۔ اسی لیے ان کا کلام تنگ نظری اور اپنی ذات تک محدود ہونے کے بجائے کل سماج کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔“

میں سمجھتا ہوں کہ غالب کے منفرد آہنگ، لہجہ اور اندازِ بیان کی اس سے بہتر تشریح نہیں ہو سکتی۔

غالب انسانیت کا پرستار

مرزا غالب کی انسان دوستی، حوصلہ اور اخلاق بہت وسیع تھے۔ جو بھی ان سے ملتا وہ ان کی کشادہ پیشانی، وسعتِ اخلاق اور فراخ حوصلگی سے اتنا متاثر ہوتا کہ اسے ہمیشہ ان سے ملنے کا اشتیاق رہتا تھا۔ نہ صرف دہلی بلکہ پورے ہندوستان میں اور ہر مذہب و ملت کے لوگوں سے ان کی دوستی تھی۔ جس کا ثبوت ان کے وہ خطوط ہیں جو انہوں نے اپنے دوستوں کو تحریر کیے اور ان کے خطوط کے جواب دیے۔ مرزا کے یہ خطوط دلی کی تاریخ بیان کرتے ہیں، اس عہد کی ادبی صورتِ حال واضح کرتے ہیں اور ان کے ذریعہ غزلوں کی اصلاح بھی کی جاتی ہے۔

الطاف حسین حالی 'یادگارِ غالب' میں تحریر کرتے ہیں کہ اکثر لوگ مرزا کو بیرنگ خط بھیجتے تھے مگر ان کو کبھی ناگوار نہ گزرتا تھا۔ اگر کوئی شخص لفافے میں ٹکٹ رکھ کر بھیجتا تھا تو وہ سخت شکایت کرتے تھے۔ انہوں نے میسور کے ایک شہزادے کو اپنی کتاب بھیجی۔ اس نے کتاب کی رسید بھیجی اور قیمت دریافت کی جس پر انہوں نے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ انہیں اپنے دشمن کو بھی اپنا ہم زباں بنالینے کا ہنر آتا ہے:

تا کرے نہ غمازی، کر لیا ہے دشمن کو
دوست کی شکایت میں، ہم نے ہم زباں اپنا

مرزا کی انسان دوستی ان کے کردار وعمل سے ظاہر تھی۔ ہندو ہوں یا مسلمان یا انگریز سب ہی کا دل وہ شاد کرنا چاہتے تھے اور اسی میں خوش تھے:

چشم ما روشن! کہ اس بے درد کا دل شاد ہے
دیدۂ پُرخوں ہمارا، ساغرِ سرشارِ دوست

غالب کو ندیم دوست سے بوئے دوست کا احساس ہوتا ہے۔ اسی لیے انہوں نے کہا:

غالب! ندیمِ دوست سے آتی ہے بوئے دوست
مشغولِ حق ہوں، بندگیٔ بو تراب میں

مرزا نے افتادِ زمانہ کے باوجود حوصلے میں کمی نہیں آنے دی اور نہ ہی اخلاقیات کو چھوڑا۔ یہی ان کی انفرادیت تھی:

چھوڑی اسدؔ نہ ہم نے گدائی میں دل لگی
سائل ہوئے تو عاشقِ اہلِ کرم ہوئے

غالب کی انسان دوستی انہیں اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ وہ اپنے عدو کو بھی دکھ دینے کی دعا کریں۔ اس بات کو انہوں نے اپنے اس شعر میں یوں بیان کیا ہے:

یوں ہی دکھ کسی کو دینا نہیں خوب، ورنہ کہتا
کہ ترے عدو کو یارب! ملے میری زندگانی

غالب کی اخلاقیات تہذیب سے کمتر اندازِ گفتگو کی اجازت نہیں دیتی اور وہ پکار اٹھتے ہیں کہ:

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے؟
تمہیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

دارورسن کی آزمائش نے بھی غالب کے حوصلے پست نہیں ہونے دیے اور وہ ان کی آزمائش سے بڑی کامیابی کے ساتھ گزرے:

قد و گیسو میں قیس و کوہکن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں، وہاں دارورسن کی آزمائش ہے

غالب اپنی انسان دوستی اور اپنے مسلک کے بارے میں بتاتے ہیں کہ وہ آزادہ رو ہیں اور ان کا مسلک صلح کل ہے۔ انہیں کسی سے عداوت یا دشمنی نہیں ہے:

آزادہ رَو ہوں اور مرا مسلک ہے صلح کل
ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے

غالب کی انسان دوستی ان کے کلام میں جگہ جگہ بکھری ہوئی ہے۔ کلام غالب کا مطالعہ اس بات کا غماز ہے کہ اس میں انسانی زندگی سے متعلق تشکیک و استفہام اور کشمکش و ذوق جستجو کے نشانات نمایاں نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کلامِ غالب ہر عہد میں انسانی افکار کا ترجمان معلوم ہوتا ہے۔ ہر عہد کا انسان ان کے اشعار سے اپنی طبیعت کو مانوس پاتا ہے اور یہ محسوس کرتا ہے کہ اُس دور کے مضطرب انسان کے عزم و جستجو اور درد و داغ و سوز وساز نے شاعری کی زبان میں اپنے آپ کو ظاہر کیا ہے۔ غالب کا کلام ہمیں جمالیاتی انبساط بھی بخشتا ہے اور انسانی زندگی سے متعلق ہماری آگہی اور بصیرت میں اضافہ بھی کرتا ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور نے تحریر کیا ہے:

"غالب کا کلام واقعی ایک جامِ جہاں نما ہے۔ ان کے تخیل میں بلندی ہے، ان کے احساس میں تندی و تیزی ہے۔ وہ صورت گری کے بادشاہ ہیں وہ افکار واقدار کے شاعر ہیں۔ وہ انسانیت کے ہر رنگ میں پرستار ہیں۔ انہوں نے بت شکنی بھی کی ہے اور نئے افکار کے صنم خانے بھی بنائے ہیں۔ وہ اپنے دور کے نمائندے بھی ہیں اور

اس سے بلند بھی۔ ان کی غزل حدیثِ عشق نہیں انسانی زندگی کا ایک صحیفہ بھی ہے۔"

غالب انسانیت کے ایسے پرستار تھے جو ہر وقت اس جستجو میں رہتا ہے کہ وہ کس طرح غربت اور محتاجی کو ختم کر کے انسانیت کے حسن میں اضافہ کر سکے۔ غدر کے بعد ان کی آمدنی اتنی ہو گئی تھی کہ ان کے کھانے پینے کے خرچ کے بعد جو کچھ بچتا تھا اس سے وہ غریبوں اور محتاجوں کی مدد کیا کرتے تھے۔

گردشِ روزگار سے تنگ اپنے دوستوں کے ساتھ وہ نہایت شریفانہ سلوک کرتے تھے۔ یادگار غالب میں حالیؔ ایک واقعہ کے ذریعہ ان کی انسان دوستی اور اخلاق کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

"دلی کے عمائدین میں سے ایک صاحب جو مرزا کے دوست تھے اور غدر کے بعد ان کی حالت سقیم ہو گئی تھی۔ ایک روز چھینٹ کا فرغل پہنے ہوئے مرزا سے ملنے کو آئے۔ مرزا نے کبھی ان کو مالیدہ یا جامہ دار وغیرہ کے چغوں کے سوا ایسا حقیر کپڑا پہنے نہیں دیکھا تھا۔ چھینٹ کا فرغل ان کے بدن پر دیکھ کر دل بھر آیا۔ ان سے پوچھا کہ یہ چھینٹ آپ نے کہاں سے لی۔ مجھے اس کی وضع بہت ہی بھلی معلوم ہوتی ہے۔ آپ مجھے فرغل کے لیے یہ چھینٹ منگوا دیں۔ انہوں نے کہا یہ فرغل آج ہی بن کر آیا ہے اور میں نے اسی وقت اس کو پہنا ہے۔ اگر آپ کو پسند ہے تو یہی حاضر ہے مرزا نے کہا جی تو یہی چاہتا ہے کہ اسی وقت آپ سے چھین کر پہن لوں۔ مگر جاڑا شدت سے پڑ رہا ہے۔ آپ یہاں سے مکان تک کیا پہن کر جائیں گے۔ پھر ادھر اُدھر دیکھ کر کھونٹی پر سے اپنا مالیدہ کا نیا چغہ اتار کر انہیں پہنا دیا اور اس

خوبصورتی کے ساتھ وہ چغدان کی نذر کیا۔“

ایک خط میں انسان دوستی پر مبنی اپنی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

”قلندری، آزادگی وایثار وکرم کے جو دواعے میرے خالق نے مجھ میں بھر دیے ہیں، بقدر ہزار ایک ظہور میں نہ آئے۔ نہ وہ طاقت جسمانی کہ لاٹھی ہاتھ میں لوں اور اس میں شطرنج اور ایک ٹین کا لوٹا مع سوت کی رسی کے لٹکالوں اور پیادہ پا چل دوں۔ کبھی شیراز جا نکلا، کبھی مصر میں جا ٹھہرا، کبھی نجف جا پہنچا۔ نہ وہ دست گاہ کہ ایک عالم کا میزبان بن جاؤں۔ اگر تمام عالم میں نہ ہو سکے نہ سہی، جس شہر میں ہوں اس شہر میں تو بھوکا ننگا نظر نہ آئے۔ خدا کا مقہور خلق کا مردود، بوڑھا ناتواں۔“

بقول غالب انسان کو یہ منزل اسی وقت حاصل ہوتی ہے جب وہ رسم و رواج اور آباؤ اجداد کی تقلید کے بتوں کو توڑ کر آگے بڑھنے کی ہمت کرتا ہے۔ کیوں کہ جب تک یہ پابندیاں باقی رہتی ہیں انسان کوئی بڑا کام نہیں کر سکتا۔ اپنی اس بات کو سمجھنے کے لیے انہوں نے حضرت ابراہیم کی مثال دی ہے:

با من میاویز اے پدر، فرزند آذر را نگر
ہر کس کہ شد صاحب نظر، دین بزرگاں خوش نہ کرد

یوں جدید اقدار حیات کی تلاش اور بہتر زندگی کی جستجو کرنے والے انسانوں کے غالب پرستار تھے اور یہی سبق انہوں نے تمام انسانیت کو دیا ہے۔ انسان اور انسانیت کے بارے میں غالب کے خیالات کو پروفیسر احتشام حسین نے ان الفاظ میں تحریر کیا ہے:

”وہ انسان کے ساتھ محبت اور ہمدردی کو اعلیٰ ترین مذہب سمجھتے تھے اور ان کے نزدیک وہ تمام انسان برابر تھے جنہیں راہِ حق کی تلاش اور جو اپنے عقائد پر ثابت قدمی کے ساتھ قائم تھے۔“

غالب کی آزاد خیالی

میر کے دین و مذہب کو کیا پوچھتے ہو کہ ان نے تو
قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

میر تقی میر اور عالمِ انسانیت کے دیگر علماء و فضلاء، مشاہیر فلاسفہ، ماہرین و کاملین فن کی طرح اسد اللہ خاں غالب کی ذات بھی حسب و نسب، قوم و خاندان، ملک و مذہب اور تشیع و تسنن کے تخصصات و امتیازات سے بالاتر اور کسی قسم کے قیود سے یکسر بے نیاز تھی۔ ان کی نظر میں اس طرح کے دیگر اختلافات اگر تنگ نہیں تو مہمل ضرور تھے۔ اکبر الہ آبادی نے بھی شعراء کے مذہب سے متعلق وضاحت کرتے ہوئے کہا ہے:

مذہب کو شاعروں کے تو کیا پوچھتا ہے شیخ
جس وقت جو خیال ہے، مذہب بھی ہے وہی

مولانا شبلی نعمانی نے اپنی مشہور و معروف تصنیف 'المامون' میں ایک بڑی اہم بات لکھی ہے کہ "بزرگانِ سلف میں سینکڑوں ایسے گزرے ہیں کہ اگر ان کے مجموعہ عقائد کا شیرازہ کھول دیا جائے تو سنی، شیعہ، معتزلی، قدری ہر ایک کے ہاتھ میں اس کا کچھ حصہ ضرور

آئے گا۔" اور شیخ سعدی نے تو فلسفۂ مذہب یوں بیان کیا ہے:

دریں بحر جز مرد داعی نہ رفت
گم آں شد کہ دنبالِ راعی نہ رفت
کسانیکہ زیں راہ برگشتہ اند
بہ رفتند و بسیار سرگشتہ اند

حقیقت یہ ہے کہ مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کا مذہب صلح کل تھا۔ بقول میر انیس ان کی نظروں میں خیال خاطر احباب کی بڑی اہمیت تھی کہ کہیں آبگینوں کو ٹھیس نہ لگ جائے۔

"یادگار غالب" میں شمس العلماء مولانا الطاف حسین حالی نے اس سلسلے کا ایک واقعہ یوں بیان کیا ہے کہ ایک دفعہ بہادر شاہ سخت بیمار ہوئے۔ اس زمانے میں مرزا حیدر شاہ شکوہ جو اکبر شاہ کے بھتیجے اور مرزا سلیمان شکوہ کے بیٹے تھے، وہ بھی لکھنؤ آئے ہوئے تھے اور بادشاہ کے مہمان تھے۔ ان کا مذہب اثنا عشری تھا۔ جب بادشاہ کو کسی طرح آرام نہ ہوا۔ مرزا حیدر شکوہ کی صلاح سے خاکِ شفا دی گئی اور اس کے بعد بادشاہ کو صحت ہو گئی۔ مرزا حیدر شکوہ نے نذر مانی تھی کہ بادشاہ کو صحت ہو جائے گی تو حضرت عباس کی درگاہ، جو لکھنؤ میں ہے، واں علم چڑھاؤں گا۔ چنانچہ انہوں نے لکھنؤ جا کر بادشاہ کو عرض داشت بھیجی کہ میرا مقدور نذر ادا کرنے کا نہیں ہے۔ حضور مدد فرمائیں۔ یہاں سے بادشاہ نے کچھ روپے مرزا حیدر شکوہ کو بھجوائے اور انہوں نے بڑی دھوم دھام سے علم چڑھایا۔ جس میں اودھ کا تمام شاہی خاندان اور امراء و علماء سب شریک تھے اور مجتہد العصر کے ہاتھ سے علم چڑھوایا گیا۔

اس واقعہ کے بعد یہ بات عموماً مشہور ہو گئی کہ بادشاہ شیعہ ہو گئے۔ اس شہرت کا بادشاہ کو رنج ہوا، اور حکیم احسن اللہ خاں مرحوم نے اس کے تدارک کے لیے کچھ رسالے شائع کرائے اور بہت سے اشتہارات کوچوں اور بازاروں میں چسپاں کرائے گئے اور

بادشاہ کے حکم سے مرزا نے بھی ایک مثنوی فارسی زبان میں لکھی، جس کا نام غالباً 'دفع الباطل' رکھا گیا تھا اور جس میں بادشاہ کو تشیع کے اتہام سے بری کیا گیا تھا۔ اس مثنوی میں مرزا نے اپنی طرف سے کوئی بات نہیں لکھی تھی۔ جو مضامین حکیم احسن اللہ خاں نے بتائے تھے ان کو فارسی میں نظم کر دیا تھا۔

جب یہ مثنوی لکھنؤ پہنچی تو مجتہد العصر نے مرزا سے دریافت کیا کہ آپ نے خود مذہب شیعہ اور مرزا حیدر شکوہ کی نسبت اس مثنوی میں ایسا لکھا ہے۔ اس پر مرزا نے انہیں لکھ بھیجا کہ میں ملازم شاہی ہوں۔ جو کچھ بادشاہ کا حکم ہوتا ہے اس کی تعمیل کرتا ہوں۔ اس مثنوی کا مضمون بادشاہ اور حکیم احسن اللہ خاں کی طرف سے اور الفاظ میری طرف سے تصور فرمائیں۔

اسی قسم کا ایک اور واقعہ ''یادگارِ غالب'' میں ملتا ہے کہ ''مولانا فضلِ حق غالب کے بڑے گاڑھے دوست تھے اور ان کو فارسی زبان کا نہایت مقتدر شاعر مانتے تھے۔ چونکہ مولانا کو وہابیوں کے خلاف ایک مثنوی لکھ دو جس میں ان کے بڑے بڑے اور مشہور عقیدوں کی تردید اور خاص کر امتناع نظیر خاتم النبیین کے مسئلے کو زیادہ شرح وبسط کے ساتھ بیان کرو۔

مرزا نے اولاً عذر کیا مگر مولانا نہ مانے تو انہوں نے ایک مثنوی لکھی جو ان کی کلیات میں موجود ہے۔ مرزا کو نہ وہابیوں سے کچھ خصوصیت تھی اور نہ ان کے مخالفوں سے کچھ تعلق تھا بلکہ صرف دوست کی رضا جوئی منظور تھی۔ اس لیے انہوں نے جو کچھ لکھا وہ مولانا کے جبر اور ان سے تعلق خاطر کی بنا پر لکھا۔

مرزا غالب کی آزاد خیالی ان کی کلام اور ان کی گفتگو سے ظاہر ہوتی ہے اور خود انہوں نے اس کو چھپانے کے بجائے اس کا برملا اظہار کیا ہے۔ شاعرانہ انداز میں انہوں نے اپنے ایک شعر میں یوں کہا ہے:

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت، لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

حالی لکھتے ہیں کہ غدر کے بعد جبکہ پنشن بند تھی اور دربار میں شریک ہونے کی اجازت نہ ہوئی تھی۔ پنڈت موتی لال، میر منشی لیفٹننٹی پنجاب مرزا صاحب سے ملنے کو آئے کچھ پنشن کا ذکر چلا۔ مرزا صاحب نے کہا تمام عمر ایک دن بھی شراب نہ پی ہو تو کافر، اور ایک دفعہ بھی نماز پڑھی ہو تو گنہگار۔ پھر میں نہیں جانتا کہ سرکار نے کس طرح مجھے باغی مسلمانوں میں شمار کیا۔ یا یہ کہ ''آدھا مسلمان ہوں۔ شراب پیتا ہوں، سور نہیں کھاتا۔ اور بڑے فخر کے ساتھ کہتے ہیں:

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

غالب کہتے ہیں میں موحدِ خالص اور مومن کامل ہوں۔ ہمیشہ تنہائی میں یہ کلمات میری زبان پر جاری رہتے ہیں۔ لا الہ الا اللہ، لا موجود الا اللہ، لا موثر فی الوجود اللہ۔ مثنوی ابر گہر بار میں مناجات کے ذیل میں وہ کہتے ہیں:

ہمانا تو دانی کہ کافر نیم
پرستار خورشید و آذر نیم
نہ کشتم کسے را بہ اہرمنی
نہ بردم زکس مایہ از رہزنی
مگر مے کہ آتش بہ گورم از دست
بہ ہنگامہ پروانہ دورم از دست
من اندوہگیں دمے اندہ ربائے
چہ می کردم اے بندہ پرور خدائے

یعنی اے اللہ یہ تو تو، اچھی طرح جانتا ہے کہ میں کافر نہیں ہوں۔ نہ سورج یا آگ کی پرستش کرتا ہوں۔ میں نے کس کی جان نہیں لی۔ میں نے کسی کا مال نہیں لوٹا۔ مجھ میں بس ایک عیب ہے کہ میں شراب پیتا ہوں اور وہی میری ہلاکت کا باعث ہے۔ میں مصیبت و آفت کا مارا۔ میرے لیے ایسی صورت میں صرف شراب ہی تھی جو غم غلط کرتی۔ پھر اے میرے اللہ اگر غم میں شراب نہ پیتا تو کیا کرتا۔

اتنی دردمندی سے گڑگڑا کر اللہ کے حضور درخواست کرنا غالب کی ندامت اور شرمندگی کی علامت ہے۔ خطوط میں 'نجات کا طالب' وغیرہ کا تحریر کرنا ان کے گنہگاری اور استغفار کے ثبوت ہیں۔ مگر یہ تو تھا غالب کا اس کے خدا کے ساتھ معاملہ مگر کسی اور کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ غالب کو کافر اور دوزخی سمجھے۔

اسی آزاد خیال غالب کا خلق خدا کے ساتھ معاملہ صلح کل، فیاضانہ اور ہمدردانہ ہی رہا ہے۔ غریب پروری اور لوگوں کی حاجت براری کو وہ اپنا فرض سمجھتا تھا۔ دل آزادی اسے پسند نہ تھی اس لیے انہوں نے کبھی کسی کی ہجو نہیں کی۔

ہاں! حضرت معین الدین چشتی، شیخ سعدی اور علامہ اقبال کی طرح محمد و آل محمد کی مدح وثنا ضرور کی ہے:

پہنچا جو آپ کو تو میں پہنچا خدا کے تئیں
معلوم اب ہوا کہ بہت میں بھی دور تھا

غالب ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست
مشغول حق ہوں بندگیٔ بو تراب میں

اس کے ساتھ ساتھ کبھی قشقہ کھینچ کر دیر میں بیٹھ جاتا ہے اور ترکِ اسلام بھی کر دیتا ہے:

قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

غالب کی اس آزاد خیالی نے اسے وہ قبولیت عام عطا کی ہے کہ وہی شاعر جسے ابتدا میں مشکل پسند کہا جاتا تھا اب اس کا کلام زبان زد خاص و عام ہے۔ اپنی اسی آزاد خیالی کو فروغ دینے میں خود ان کی شعوری کوشش بھی شامل ہے۔ ایک مرتبہ کا قصہ ہے کہ بادشاہ نے ان سے پوچھا کہ ہم نے سنا ہے کہ غالب نے شیعہ مذہب اختیار کیا ہے؟

اس پر میرزا غالب نے شاعری میں اس کی وضاحت یوں کی:

جن لوگوں کو ہے مجھ سے عداوت گہری
کہتے ہیں مجھے وہ رافضی، دہری
دہری کیوں کر ہو جو کہ ہووے صوفی
شیعی کیوں کر ہو ماوراء النہری

آخر میں اردو ادب کی اہم شخصیت علی سردار جعفری کے ایک اقتباس پر میں اس مضمون کا اختتام کروں گا:

"اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو کا یہ عظیم المرتبت شاعر قدیم صوفیانہ خیالات سے متاثر تھا۔ جو اس کے مطالعے کے علاوہ اسے فارسی اور اردو شاعری سے ورثے میں ملے تھے۔ یہ کہنے کے بعد کہ "تصوف نہ فہید سخن پیشہ را" غالب نے کائنات کو سمجھنے کے لیے اور مذہب کی ظاہر داریوں سے بچنے کے لیے تصوف کے بعض خیالات سے مدد لی اور انہی سے اپنی آزاد خیالی اور کج اندیشہ فطرت کی تربیت کی۔"

غالب اور مسائل تصوف

مسائل تصوف سے غالب کی گہری دلچسپی ان کی ہمہ رنگی، ہمہ جہتی اور آزاد خیالی کی مثال ہے۔ تصوف سے مراد معرفت لیا جاتا ہے اور غالب معرفتِ نفس کے اعلیٰ مقام پر فائز تھے۔ اسی لیے انہوں نے کہا تھا:

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود
قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

غالب کی اردو اور خصوصاً فارسی شاعری میں متصوفانہ خیالات کی بہتات عجمی شاعری کی دین ہے تصوف جس کا طرہ امتیاز ہے۔ اردو شاعری میں مضامین تصوف فارسی شاعری کی ایک قدیم روایت کے طور پر ابتدا ہی سے پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ یہ ضروری نہیں کہ جو شاعر منازل تصوف سے گزرا ہو وہی ان مضامین کو بیان کرے۔ روایتی غزل میں یہ مضامین عشق مجازی کے مضامین کے ساتھ اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ ان کے درمیان امتیاز بہت کم برتا جاتا ہے۔ چنانچہ تصوف کی اصطلاحات اور عشق مجازی کی اصطلاحات میں فرق محسوس نہیں ہو پاتا۔ جیسے ساقی سے مراد شراب دینے والا بھی ہے اور تصوف کی لغت

میں مرشد روحانی بھی حسن وعشق کے پس منظر میں وصال سے مراد جنسی آسودگی ہے جبکہ تصوف کے پس منظر میں اسے واصل بحق ہونا سمجھا جائے گا۔ اس لیے کسی شاعر کے کلام میں تصوف کا بیان اصطلاحی معنی میں اسے صوفی یا ولی نہیں بناتا۔ اسی لیے غالب نے کہا:

یہ مسائلِ تصوف، یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

فارسی زبان کے چند شعراء جنہیں صوفی شعراء کہا جاتا ہے وہ حقیقتاً اصطلاحی معنی میں صوفی نہ تھے۔ مثلاً حافظ شیرازی کو اہلِ ایران رندِ مشرب بھی مانتے ہیں اور صوفی شاعر بھی جبکہ وہ بھی غالب ہی کی طرح رندِ ہزار شیوہ تھے مگر ان کے کلام کی متصوفانہ کیفیت سے کسی کو انکار نہیں ہے۔

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے مولانا جلال الدین رومی کے تصوفانہ موقف کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ ”لایعنی بحثیں، تنگ نظری، تعصب اور حسد سے پیدا ہوتی ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ حسد تنگ نظری سے پیدا ہوتا ہے۔ مولانا کی سوانح میں ایک واقعہ یوں تحریر ہوا کہ چند حسد پرست علماء نے ایک شخص کو سکھا پڑھا کر مناظرے کے لیے ان کے پاس بھیجا کہ پہلے ان سے یہ سوال کرنا کہ آپ کس فرقے سے ہیں۔ پھر جس فرقے سے وہ اپنا تعلق بتائیں اس کے متعلق سوال کرنا، کیوں کہ ہر فرقے کے متعلق مناظر کو الگ الگ پینترے اختیار کرنے پڑتے ہیں۔ چنانچہ اس نے مولانا سے آغازِ بحث میں یہی سوال کیا۔ مولانا نے کہا کہ میں بہتر فرقوں سے متفق ہوں۔

یہ جواب جھگڑالو مولوی صاحب کے لیے بہت غیر متوقع تھا۔ سٹ پٹا کر بولے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ بے دین اور ملحد ہیں۔ مولانا نے فرمایا کہ میں اس سے بھی متفق ہوں۔“

بس! کچھ ایسی ہی صورتِ حال مرزا اسد اللہ خاں غالب کی بھی تھی کیوں کہ عصرِ جدید میں مذہبی تکثریت (Pluralism) کی جو بحث آج زبان زدِ خاص و عام ہے، غالب کی تحریریں اس کی مثال پیش کرتی ہیں:

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

غالب شاید اس کے قائل تھے کہ تصوف برائے شعر گفتن خوب است، کیونکہ وہ کسی بات کے پابند نہیں تھے اور تصوف تو ایک فکری مسلک ہے۔ وہ اس میں کیسے بندھ سکتے تھے۔ عظیم شاعر اتنی بڑی شخصیت کا مالک ہوتا ہے کہ وہ فکری اور ذہنی طور پر بہت سی چیزوں کی معرفت رکھ سکتا ہے۔ نفسیاتی لحاظ سے شاعر کا ہر رنگ ایک ایسا نقاب ہے جسے شعر کہتے وقت وہ اوڑھ لیتا ہے۔ اسے مکر یا فریب نہیں سمجھنا چاہیے۔ بلکہ یہ اسٹیج پر اداکاری کرنے والے اس فنکار کی طرح ہے جو جس روپ میں آتا ہے اسے حقیقت سے قریب تر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ جتنا عظیم شاعر ہوگا اتنی ہی پہلو دار اور گہری اس کی شاعرانہ شخصیت بھی ہوگی اسی لیے جب غالب معرفت کی شاعری کرتے ہیں تو وہ ولی اور صوفی ہی نظر آتے ہیں۔ ایسے اشعار میں جو مسائل تصوف بیان کیے گئے ہیں وہ بہ لحاظ بیان اپنے اندر ندرت بھی رکھتے ہیں اور غالب کی انفرادیت کی مثال بھی:

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

رہا آباد عالم اہلِ ہمت کے نہ ہونے سے
بھرے ہیں جس قدر جام و سبو میخانہ خالی ہے

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

ہاں! کھائیو مت فریب ہستی
ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے

مژدۂ صبح دریں تیرہ شبانم دادند
شمع کشتند و ز خورشید نشانم دادند

قوئی فتادہ چو نسبت ادب مجو غالب
ندیدۂ کہ سوئے قبلہ پشت محراب است

''یادگارِ غالب'' میں مولانا الطاف حسین حالی نے غالب اور مسائل تصوف کے بارے میں یوں اظہارِ خیال کیا ہے:

> ''علم تصوف سے جس کی نسبت کہا گیا ہے کہ 'برائے شعر گفتن خوب است' ان کو خاص مناسبت تھی اور حقائق و معارف کی کتابیں اور رسالے کثرت سے ان کے مطالعے سے گزرتے تھے اور سچ پوچھئے تو انہی متصوفانہ خیالات نے مرزا کو نہ صرف اپنے ہم عصروں بلکہ بارہویں اور تیرہویں صدی کے تمام شعراء میں ممتاز بنا دیا تھا۔''

معراجِ تصوف کا ذکر کرتے ہوئے غالب نے اس راہ کی مشکلات کا یوں بیان کیا ہے:

جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی
مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی

غالب کے اس شعر پر تبصرہ و تشریح کرتے ہوئے حالی لکھتے ہیں کہ صوفیا کی اصطلاح میں محادست اور مسامرت (یعنی عبد اور معبود کے درمیان گفتگو ہونا) کے دو مرتبے ہیں جو کاملین اور عرفا کو حاصل ہوتے ہیں۔ غالب کہتے ہیں کہ شاہد حقیقی کے ساتھ اس معمولی لب و دہن سے بات چیت نہیں ہو سکتی بلکہ اس کے لیے دہانِ زخم پیدا کرنا چاہیے یعنی جب تک دل تیغ عشق سے مجروح نہ ہو یہ مرتبہ حاصل نہیں ہو سکتا۔

غالب تصوف تک عقل کی راہ پہنچے ہیں نہ کہ تجربے کی راہ سے۔ وہ جذبے کو عقل کی روشنی میں پرکھتے ہیں۔ ان پر عقل کی گرفت اتنی سخت ہے کہ وہ انہیں جذباتیت کے دھارے پر بہنے نہیں دیتی۔ فلسفے کے ساتھ ان کا گہرا رابطہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ فیضی، دارالشکوہ اور دوسرے شعراء کے زیر اثر انہوں نے اپنے متصوفانہ کلام میں ویدانتی فلسفے کے تحت بھی کچھ اشعار کہے جن میں بتایا گیا ہے کہ دنیا محض دھوکا، سراب اور مایا ہے مثلاً

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

ہمہ اوست کا فلسفہ مرزا غالب کو ایرانی شاعری کی وساطت سے ملا۔ جس کے تحت انہوں نے ادب کو بہت سے حسین اشعار دیے۔ مثلاً

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

نیاز فتح پوری نے اپنے ایک مضمون کے اختتامیہ میں غالب کی طرز شاعری اور شاعرانہ خصوصیات کے بارے میں جو نتیجہ نکالا ہے وہ کچھ یوں ہے:

"غالب کا منظوم کلام جو کلیات غالب کے نام سے شائع ہوا ہے اس کا حجم ۵۱۴ صفحات کو محیط ہے اور ۶۶ قطعات، ایک مخمس، دو ترکیب بند، ایک ترجیع بند، گیارہ مثنویوں، ۶۴ قصائد، ۱۰۴ رباعیوں اور ۱۳۰

غزلوں پر مشتمل ہے۔ قصیدوں اور غزلوں کے اشعار تین تین ہزار سے کچھ اوپر ہیں اور مثنوی کے ابیات دو ہزار کے قریب ہیں۔ اس طرح پورا کلیات قریب قریب دس ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ اور ان میں سے فلسفہ و تصوف کے اشعار دو تین سو سے زیادہ نہ ہوں گے۔ اس لیے یقیناً یہ بڑی زیادتی ہے کہ ہم انہی چند اشعار کو سامنے رکھ کر غالب کی ذوقِ شاعری کے متعلق یہ فیصلہ کر دیں کہ غالب صرف صوفی، فلسفی والہیاتی شاعر تھا، جیسا کہ بعض حضرات نے ظاہر کیا ہے۔ تاہم اس سے انکار نہیں کہ اس کے یہاں تصوف والہیات کے جو خیالات ملتے ہیں وہ بڑے لطیف و پاکیزہ ہیں۔ جس کا خود اس کو بھی پورا پورا احساس تھا اور اسی لیے اس نے یہ پیشن گوئی بھی کر دی تھی کہ "شہرت شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن"۔

نیاز صاحب کے مدلل فیصلے سے انکار نہیں کیا جا سکتا، کیوں کہ میں سمجھتا ہوں کہ تصوف صدائے احتجاج ہے معاشرتی، سیاسی اور مذہبی جبر کے خلاف اور غالب نے اپنی نثر اور نظم دونوں کے ذریعے یہ صدائے احتجاج بلند کی ہے، جیسا کہ ان کے پیش رو مولانا روم کر چکے تھے، جنہوں نے کہا:

دل بدست آور کہ حج اکبر است
کعبہ بنگاہِ خلیل آزر است
از ہزار اں کعبہ یک دل بہتر است
دل گزرگاہ جلیل اکبر است

اور غالب نے کہا:

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

لہٰذا اختتامی طور پر یں یہی کہوں گا کہ غالب کی تحریروں میں دیگر موضوعات کے علاوہ تصوف کی ایک نمایاں جھلک نظر آتی ہے اور انہوں نے مسائل تصوف کو اچھی طرح سمجھا اور سمجھایا ہے۔

ڈاکٹر اے بی اشرف نے اپنے ایک مضمون میں غالب کے مسائل تصوف پر گفتگو کرتے ہوئے تحریر کیا:

غالب کا کائناتی تصور بھی صوفیاء کے تصور کائنات کے مماثل ہے۔ دنیا کی حقیقت کے بارے میں فنا کا تصور غالبؔ کا غالب رجحان بن گیا ہے۔ چنانچہ غالب زندگی کو حلقۂ دام خیال سمجھتے ہیں اور اس کے فریب سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں:

ہاں کھائیو ، مت فریب ہستی
ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

دیوانِ غالب کا پہلا شعر ہی دنیا کی ہر شے کو بودا اور کاغذی پیرہن کا پیکر قرار دیتا ہے:

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

غالب کی تحریروں میں طنزومزاح

طنز کی شدت اور اس کے منفی اثرات کو زائل کرنے کے لیے مزاح کی چاشنی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اکثر طنز و مزاح ساتھ ساتھ استعمال ہوتے ہیں۔ شاید اسی لیے عام طور پر طنز و مزاح میں چولی دامن کا ساتھ سمجھا جاتا ہے۔ اور یہ محسوس کیا جاتا ہے کہ کوئی مضمون طنز پر مکمل اور جامع نہیں ہوسکتا جب تک اس کے ساتھ ظرافت کا ذکر نہ ہو۔ جب کہ طنز مزاح سے بالکل الگ چیز ہے۔ یہ ایک طرح کی تنقید ہے اور عمل جراحی ہے۔ مگر اس عمل جراحی میں کامیابی انہیں ہی حاصل ہوتی ہے جن کو الفاظ پر قدرت حاصل ہو اور جن کے اس عمل میں اثباتی مقصدیت شامل ہو۔ غالب انہی صاحبان کمال میں شامل تھے جن کے بقول لب کی شیرینی کا کرشمہ ہے کہ اس کی گالیاں کھا کے بھی ہم بے مزا نہیں ہوتے۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ طنز عام ادبی تنقید سے بلند ہے۔ کیوں کہ تنقید کا مقصد ہے کسی ادبی پارے کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانا اور ادب میں اس کی حیثیت کا تعین جبکہ طنز کا مقصد ہے اصلاح، یعنی تنقید استحسان ہے اور طنز تحسین۔

غالب کی طنزیات میں بات کو لپیٹ کر کہا گیا ہے اور اشاروں میں چوٹ کی گئی ہے۔ اس ہنر مندی کو تعریض کہا جاتا ہے۔ غالب کے اس شعر میں ذوق پر چوٹ کی گئی

ہے۔اسے تعریف کی بہترین مثال کہا جا سکتا ہے:

بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگر نہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

غالب کی طنز نگاری کی اس منفرد خصوصیت کے بارے میں پروفیسر رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں:

"غالب براہ راست نہیں اشاروں میں بہت کچھ کہہ جاتے ہیں اور یہ عجیب بات ہے کہ وہ جس پر وار کرتے ہیں اسے اول تو اس کا احساس ہی نہیں ہوتا کہ وہ ان کے طنز کا نشانہ تھا اور اگر ہوتا ہے تو اس وقت جب طنز اپنا اثر کر چکتا ہے۔طنز کی یہی سب سے بڑی خوبی ہے۔"

غالب کا طنز منفرد ان معنوں میں ہے کہ وہ بڑا ہی سادہ اور پرکار ہے۔جس میں فن کی سادگی اور فکر کی پرکاری نظر آتی ہے۔انہوں نے اپنے طنز کو لب ولہجہ کی تلخی سے ترش اور کڑوا نہیں بنایا ہے ویسے ہر سچی بات بری لگتی ہے۔غالب کی شوخی اس کی طنز میں نمایاں نظر آتی ہے:

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمہاری شراب طہور کی

آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

مندرجہ بالا اشعار اور خصوصاً آخری شعر میں کتنا گہرا اور موثر طنز ہے جسے کتنے سادہ اور پرکار انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ناقدریٔ زمانہ کی حکایت غالب نے بار بار کی ہے:

حسد، سزائے کمالِ سخن ہے کیا کیجے
ستم، بہائے متاعِ ہنر ہے کیا کہیے

غالب کی یہ شکایت انفرادی ہونے کے بجائے اجتماعی فریاد کا درجہ رکھتی ہے۔ طنز کے اس شعر میں دو رخ ہیں، 'حسد' کا رخ متشاعروں کی طرف ہے جبکہ 'ستم' کا رخ اہلِ ثروت اور اہلِ دانش کی طرف لیکن حسد و ستم کے باوجود شکست ماننے پر تیار نہیں ہیں۔

غالب کی شعری دنیا ہجو سے خالی ہے۔ انہوں نے کبھی کسی کی ہجو سے اپنی زبان کو آلودہ نہیں کیا۔ ہاں! ایسے مواقع پر انہوں نے طنز کو تمثیلی رخ میں بڑی خوبصورتی سے پیش کر کے اپنی بات کو کارپردازانِ قضا و قدر تک پہنچایا ہے:

آپ کا بندہ اور پھروں ننگا
آپ کا نوکر اور کھاؤں ادھار
سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہگری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

اور 'روئے سخن کس کی طرف ہو تو روسیاہ' کہہ کر راز کو رازہی رکھنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ کیوں کہ جن لوگوں تک طنز کا یہ تیر پہنچنا تھا وہ ان تک تو پہنچ ہی گیا۔ غالب کے طنزیہ انداز کی کامیابی کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت پیش کیا جاسکتا ہے کہ آج ہمارے بعض نکتہ رس نقاد بھی اس چھپے ہوئے طنز کا پتہ نہ چلا سکے اور ذیل کے شعروں کا رخ انہیں غالب کی طرف ہی نظر آیا۔

چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسد
آپ کی صورت بھی دیکھا چاہیے
گر خامشی سے فائدہ اخفاء حال ہے
خوش ہوں کہ میری بات سمجھنا محال ہے

جب شکایت کے ساتھ مزاج میں تلخی آ جاتی ہے تو طنز کچھ زیادہ ہی مزہ دینے لگتا ہے لیکن غالب نے ان حالات میں بھی اعتدال کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا:

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا
لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

غزل کے دو مصرعوں کی تنگ دامانی کے پیش نظر ہی اس خواہش کا اظہار کیا گیا کہ "کچھ اور چاہیے وسعت مجھے بیاں کیلئے" مگر ان بندشوں کے ساتھ ہم غالب کی طنز نگاری پر نظر ڈالتے ہیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ حدود غزل میں رہ کر انہوں نے اپنی طنازانہ طبیعت کے جوہر اس خوبی سے دکھائے کہ دوسرا غزل گو ان کے رتبے کو نہیں پہنچ سکتا۔

غالب نے غزل میں تنگ دامانی کی حسرت اردو نثر میں اپنے خطوط کے ذریعے پوری کی ہے۔ کلیم الدین احمد نے اپنے مضمون "اردو ادب میں طنز و ظرافت" کے ذیل میں تحریر کیا ہے۔

"مرزا کی تحریر صرف خط و کتابت کے دائرے میں ہی اپنا نظیر نہیں رکھتی بلکہ اس وقت تک بھی کوئی اردو انشاء پرداز بلحاظ دلچسپی اور لطف بیان کے غالب کی تحریر کی مثال نہیں پیش کر سکا...... ابھی تک اردو میں جو خالص ظرافت کے نمونے، ایسے نمونے جو ادبی معیار پر بھی پورے اتریں، نظر آتے ہیں وہ غالب کے معیار سے بہتر کہاں، اس معیار کی گرد کو بھی نہیں پاتے۔"

اس سلسلے میں مرزا غالب کے خطوط کے اقتباسات کے چند نمونے حاضر ہیں جن سے ان کی ظرافت کا اظہار ہوتا ہے:

ایک دوست کو دسمبر ۱۸۵۸ء کی اخیر تاریخوں میں خط لکھا ہے۔ انہوں نے اس کا

جواب ۱۸۵۹ء کی پہلی یا دوسری کو لکھ بھیجا۔ اس کے جواب میں ان کو اس طرح لکھتے ہیں:

"دیکھو صاحب یہ باتیں ہم کو پسند نہیں۔ ۱۸۵۸ء کے خط کا جواب ۱۸۵۹ء میں بھیجتے ہو اور مزا یہ ہے کہ جب تم سے کہا جائے گا تو یہ کہو گے کہ میں نے دوسرے ہی دن جواب لکھا ہے۔"

ایک دوست کو رمضان میں خط لکھا ہے۔ اس میں لکھتے ہیں:

"دھوپ بہت تیز ہے۔ روزہ رکھتا ہوں مگر روزے کو بہلاتا رہتا ہوں، کبھی پانی لیا، کبھی حقہ پی لیا، کبھی کوئی ٹکڑا روٹی کا کھا لیا۔ یہاں کے لوگ عجب فہم رکھتے ہیں میں تو روزہ بہلاتا ہوں اور یہ صاحب فرماتے ہیں کہ تو، روزہ نہیں رکھتا۔ یہ نہیں سمجھتے کہ روزہ رکھنا اور چیز ہے اور روزہ بہلانا اور بات ہے۔"

ایک خط میں نواب امین الدین کو لکھتے ہیں:

"آج تم دونوں بھائی اس خاندان میں شرف الدولہ اور فخر الدولہ کی جگہ ہو۔ میں لم یلد ولم یولد ہوں"

المختصر یہ ماننا پڑتا ہے کہ خواجہ الطاف حسین حالی نے غالب کی طرز تحریر کی خصوصیتوں کے بارے میں بجا تحریر کیا تھا:

"وہ چیز جس نے غالب کے مکاتیب کو ناول اور ڈرامے سے زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے وہ شوخیٔ تحریر ہے جو اکتساب یا مشق و مہارت یا پیروی و تقلید سے حاصل نہیں ہو سکتی...... مرزا کی طبیعت میں شوخی ایسی بھری ہوئی تھی جیسے ستار کے تار میں سر بھرے ہوتے ہیں اور قوت متخیلہ جو شاعری اور ظرافت کی خلاق ہے اس کو مرزا کے دماغ سے وہی نسبت تھی جو قوت پرواز کو طائر کے ساتھ ہوتی ہے۔"

غالب کا تنقیدی شعور

لغوی معنی میں تنقید کا مطلب ہے جانچنا و پرکھنا، اور جانچنے و پرکھنے کے لیے وسیع معلومات ضروری ہے۔ مگر جب بات ادبی تنقید کی آئیگی تو اس کے لیے جانچنے و پرکھنے والے (یعنی نقاد) کے لیے صاحب ذوق ہونا بہت ضروری ہے اور ذوق کا درجہ جتنا بلند ہوگا تنقید کا معیار بھی اتنا ہی بلند ہوگا۔ کیوں کہ ادبیات کا درجہ نفس مضمون سے اوپر ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے تنقید کے سلسلے میں ایک بہت اچھا فیصلہ یہ کیا ہے کہ ہر نسل کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی تنقید خود پیدا کرے اور اپنی فکر کے پیمانوں اور معیاروں کا از سر نو جائزہ لے۔

مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کی شعر فہمی اور سخن سنجی زباں زد خاص و عام تھی۔ داد سخن کے سلسلے میں بھی ان کا ایک منفرد انداز تھا۔ جب تک کوئی شعر فی الواقع مرزا کو پسند نہ آتا تھا وہ ہرگز اس کی تعریف نہ کرتے تھے۔ یادگار غالب میں اس بات کو تحریر کرتے ہوئے حالی نے لکھا کہ ان کے بعض معاصرین اس بات سے آزردہ رہتے تھے اور اسی لیے ان کی شاعری پر نکتہ چینی کرتے تھے۔ مگر مرزا باوجودیکہ ان کی طبیعت نہایت صلح جو تھی انہوں نے اپنی روش نہ بدلی۔ لیکن جو شعر ان کے دل میں چبھ جاتا اس کی تعریف بھی ایسی کرتے تھے

جو مبالغے کی حد تک پہنچ جاتی تھی۔ وہ درحقیقت کسی کو خوش کرنے کے لیے ایسا نہیں کرتے تھے بلکہ ذوق سخن ان کو بے اختیار کر دیتا تھا۔

ایک واقعہ نقل کرتے ہوئے حالی فرماتے ہیں کہ شیخ ابراہیم ذوق جن کی نسبت مشہور ہے کہ مرزا کو ان سے چشمک تھی۔ ایک روز جبکہ مرزا شطرنج میں مصروف تھے، منشی غلام علی خاں مرحوم نے ان کا یہ شعر کسی دوسرے شخص کو سنانے کو پڑھا:

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

خان مرحوم کہتے تھے کہ مرزا کے کان میں بھی اس کی بھنک پڑ گئی۔ فوراً شطرنج چھوڑ دی اور مجھ سے کہا۔ بھیا! تم نے کیا پڑھا؟

میں نے پھر وہ شعر دہرایا۔ پوچھا...... کس کا شعر ہے؟

میں نے کہا ذوق کا۔ یہ سن کر نہایت متعجب ہوئے اور مجھ سے بار بار پڑھواتے تھے اور سر دھنتے تھے۔ ہم بھی دیکھتے ہیں کہ مرزا نے اپنے اردو خطوط میں اس شعر کا جا بجا ذکر کیا ہے۔

جہاں عمدہ شعر کی مثالیں دی ہیں، وہاں اس شعر کو ضرور لکھا ہے۔

اسی طرح مومن خاں کا جب یہ شعر سنا:

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

تو اس کی بہت تعریف کی اور یہ کہا کہ کاش! مومن میرا سارا دیوان لے لیتا اور صرف یہ شعر مجھ کو دے دیتا۔ اس شعر کو بھی انہوں نے متعدد خطوں میں نقل کیا ہے۔

اسی طرح سودا کا یہ شعر بھی ایک مقام پر نقل کیا ہے:

دکھلایئے لیجا کے تجھے مصر کا بازار
لیکن کوئی خواہاں نہیں واں جنس گراں کا

ایک صحبت میں نواب مرزا خاں داغ کے اس شعر کو وہ بار بار پڑھتے تھے اور اس پر وجد کرتے تھے۔

رُخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
ادھر جاتا ہے دیکھیں، یا اِدھر آتا ہے پروانہ

حالی لکھتے ہیں کہ بعض اوقات وہ اپنے شاگردوں کے کلام سے اس قدر متاثر ہوتے تھے کہ ان کی تعریف میں ان کا دل بڑھانے کو حد سے زیادہ مبالغہ کرتے تھے انہوں نے اخیر عمر میں اپنے ایک شاگرد کی غزل دیکھ کر اس کی بے انتہا تعریف کی اور کہا کہ اگر میں رشک کرنے کے قابل ہوتا تو تم محسود ہوتے اور میں حاسد۔

غالب نے تقریظ نگاری کا ایسا طریقہ اختیار کیا تھا کہ کوئی بات حقائق کے منافی بھی نہ ہو اور بات بھی بنی رہے۔ 'دیوانِ تفتہ' کی تقریظ جب مرزا نے منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھ کر بھیجی تو انہوں نے شکوہ کیا۔ جس کے جواب میں غالب نے تحریر کیا کہ کیا کروں اپنا شیوہ ترک نہیں کیا جاتا۔ وہ روش ہندوستانی فارسی لکھنے والوں کی مجھ کو نہیں آتی کہ بالکل بھاٹوں کی طرح بکنا شروع کردوں۔ میرے قصیدے دیکھو تشبیب کے شعر بہت پاؤں گے اور مدح کے شعر کمتر۔ نثر میں بھی یہی حال ہے۔ نواب مصطفیٰ خاں کے تذکرے کی تقریظ ملاحظہ کرو۔ کہ ان کی مدح کتنی ہے۔ مرزا رحیم الدین حیا کے دیوان کے دیباچے کو دیکھو۔ وہ جو تقریظ انطباع دیوانِ حافظ کی جان جیکب کی فرمائش سے لکھی ہے، اس کو دیکھو فقط ایک بیت میں ان کا نام اور ان کی مدح آئی ہے اور باقی نثر میں اور ہی مطلب ہیں۔ واللہ باللہ اگر کسی شہزادے یا امیر زادے کے دیوان کا دیباچہ لکھتا تو اس کی مدح اتنی نہ کرتا کہ جتنی تمہاری مدح کی ہے۔

سر سید احمد خان کی 'آئینِ اکبری' کی تقریظ میں، باوجودیکہ مرزا کو سر سید بہت

عزیز تھے، انہوں نے دل کی بات لکھ دی کہ یہ ایک فضول کام ہے:

مردہ پرور دن مبارک کار نیست
خود بگو کاں نیز جز گفتار نیست

لہٰذا تمام تر تعریفوں کے باوجود سر سید نے اسے آئین اکبری میں شامل نہیں کیا۔ احباب کی ناگواری کے باوجود اپنی حق پسندی اور راست گفتاری چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اس سے ان کے تنقیدی شعور کا پتہ چلتا ہے۔

غالب کی راست گفتاری نے انہیں 'جامع برہان قاطع' کی شہرت اور ناموری کے باوجود اس پر سخت تنقید سے باز نہیں رکھا۔ انہوں نے پورے اعتماد کے ساتھ برہان قاطع کی لفظی اور معنوی کمزوریوں کو گرفت میں لیا۔ اور اس میں موجود بے ربطگی کی طرف صرف متوجہ ہی نہیں کیا بلکہ ان کی وجوہات بھی بیان کی ہیں۔ اس سے علم زبان پر ان کی ماہرانہ دسترس کا ثبوت ملتا ہے۔ مثلاً صاحب برہان نے عبیر ارزاں کے معنی گیسوئے رسول ﷺ لکھے ہیں۔ غالب نے نظامی کا یہ شعر لکھتے ہوئے:

بوئے کزاں عبیر لرزاں وہی
گر بدو عالم وہی ارزاں وہی

تحریر کیا ہے کہ اس شعر کو پوری طرح نہ سمجھ کر غلطی کی گئی یہ کہ عنبر ارزاں کو عنبر لرزاں یعنی گیسوئے رسول قرار دیا گیا ہے۔

اس طرح برہان قاطع کا تنقید مطالعہ 'قاطع برہان' کے نام سے مرزا غالب نے شائع کروادیا۔ جس پر بہت شور ہنگامہ ہوا اور 'قاطع برہان' کی مخالفت کی گئی یہاں تک کہ گمنام خطوں میں مرزا صاحب کو گالیاں بھی دی گئیں مگر وہ اپنی تنقید پر قائم رہے۔ مگر انہوں نے مولوی امین الدین کی کتاب 'قاطع القاطع' کا کوئی جواب نہیں دیا، کیوں کہ اس میں فحش اور ناشائستہ الفاظ کثرت سے موجود تھے۔ کسی نے کہا حضرت! آپ نے اس کا جواب

نہیں لکھا؟

مرزا نے کہا اگر کوئی گدھا تمہیں لات مار دے تو کیا تم بھی اسے لات مارو گے؟

نواب مصطفیٰ خاں "گلشن بے خار" میں مرزا غالب کی شعر فہمی، کتاب فہمی اور تنقیدی شعور کی بنیاد پر یہ حقیقت ہے کہ وہ ایک مستثنیٰ آدمی تھے۔ کیسا ہی مشکل مضمون ہو وہ اکثر ایک سرسری نظر میں اس کی تہہ تک پہنچ جاتے تھے۔ نواب فرماتے ہیں:

"میں شاہ ولی اللہ کا ایک فارسی رسالہ، جو حقائق و معارف کے نہایت دقیق مسائل پر مشتمل تھا، پڑھ رہا تھا اور ایک مقام بالکل سمجھ نہ آتا تھا۔ اتفاقاً اسی وقت مرزا آ نکلے۔"

میں نے وہ مقام مرزا صاحب کو دکھایا۔ انہوں نے کسی قدر غور کے بعد اس کا مطلب ایسی خوبی اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا کہ شاہ ولی اللہ صاحب بھی شاید اس سے زیادہ بیان نہ کر سکتے۔

مولانا غلام رسول مہر غالب کی تنقید نگاری کا ذکر کرتے ہوئے ان کی منفرد نقادانہ صلاحیتوں کے بارے میں یوں تحریر کرتے ہیں:

> "غالب کو تنقید میں بھی ایک منفرد مرتبہ حاصل ہے۔ یعنی پچھلوں سے کامل قطع تعلق نہ کرتے ہوئے آنے والوں کے لیے نئے راستے پیدا کیے اور اپنی انقلاب آفریں فطرت سے کام لے کر جدید تنقید کی بنیادیں استوار فرمائیں یہ ان کی نقاد طبیعت اور ان کے ذوقِ سلیم کا کرشمہ تھا کہ اپنے عہد کے ادبی عیوب کا انہیں بہت جلد پورا احساس ہو گیا اور ان عیوب سے نہ صرف خود کنارہ کش ہو گئے بلکہ دوسروں کو بھی کنارہ کشی کی موثر دعوت دی۔ غالب نے ہمارے ادبیات کو جس نہج پر ڈالا تھا، یہ آج تک اسی نہج پر جاری ہیں۔"

ویسے تو فارسی اور اردو نثر و نظم میں ان کی تنقید کے بکثرت نمونے موجود ہیں لیکن

ان کی مکمل طور پر تنقیدی کتب میں قاطع برہان، لطائفِ غیبی، سوالات عبدالکریم اور تیغ تیز شامل ہیں۔ ان کتب کے علاوہ "پنج آہنگ" جو نامہ نگاری یعنی خطوط نویسی کے متعلق ہے اس کے دیباچہ میں میرزا نے بہت اہم باتیں تحریر کی ہیں۔ مختصراً ملاحظہ فرمائیں۔ وہ لکھتے ہیں:

☆ نگارش کو مقصود سے زیادہ دور نہ لے جائیں اور نفسِ مطلب کو ایسے انداز میں قلم بند کریں کہ اس کے سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔

☆ مطالب کو انتہائی احتیاط سے جدا جدا بیان کرے۔ ایسا نہ ہو کہ سب خلط ملط ہو جائیں اور پڑھنے والے کے لیے الجھن کا باعث بنیں۔

☆ نامانوس الفاظ اور دقیق استعارات سے عبارت کو پاک رکھا جائے۔

☆ حتیٰ الامکان تحریر کو طول نہ دیا جائے۔

☆ لطف تحریر کا تقاضہ یہ ہے کہ ایک لفظ بار بار استعمال نہ کیا جائے۔

☆ زبان کی خوبی کو ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے۔ لکھنے والے کو پوری کوشش کرنی چاہیے کہ سادگی اور لطافت اس کی عادت بن جائے۔

مرزا غالب کی تحریروں میں یہی خوبیاں تھیں جس نے ان کے اسلوب بیان کو شان امتیاز بخشی۔ اس لیے انہوں نے سچ کہا:

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

آخر میں بطور نمونہ دیکھیے کہ ظہوری کے ایک شعر کی تنقید مروجہ راہ سے ہٹ کر غالب نے کیسے کی ہے۔ ظہوری کا ایک معروف شعر ہے:

مروت کرد شبہا بر تو سیر بام و در لازم
نے باشد چراغے خانہ ہائے بے نوایاں را

عام طور پر اس کا مطلب یہی بتایا جائے گا کہ تو، مروت سے کام لے کر راتوں

کے اندھیرے میں کوٹھے پر چڑھ کر دیکھے تو معلوم ہو جائے گا کہ بے نواؤں کے گھروں میں ایک دیا تک موجود نہیں۔ مگر غالب اس کا تجزیہ یوں کرتے ہیں:

''ظہوری کا ممدوح اور معشوق ایک ہے یعنی سلطان جلیل القدر ابراہیم عادل شاہ۔ بادشاہوں کے منظر بلند ہوتے ہیں اور کیا بعید ہے کہ رعایا اور ملازمین میں سے کچھ لوگ زیر قصر رہتے ہوں۔ اس واسطے بادشاہوں کو اس منظر بلند پر نہیں چڑھنا چاہیے کہ مبادا رعیت یا ملازموں کی جورو اور بیٹیاں نظر آئیں۔ رات کو ان کے گھر تاریک ہوتے ہیں۔ اگر کوئی بلند مقام پر چڑھا تو کچھ نظر نہیں آئے گا۔ یہ مدح ہوئی عفت کی اب ابہام کو سوچیے۔ ممدوح نے راتوں کو کوٹھے پر چڑھنا اپنے اوپر لازم کیا ہے۔ اس واسطے کہ بے نواؤں کے گھروں میں چراغ نہیں۔ اگر کسی کو کپڑے میں پیوند لگانا یا کپڑے کی کوئی چیز گانٹھنی یا کسی مریض کا تشخص حال منظور ہو تو وہ گھر اس ممدوح کے پرتو جمال سے منور ہو جائے۔ چراغ کی حاجت باقی نہ رہے۔ مروت کا مزہ وجدانی ہے سوا اس لفظ کے علاوہ یہاں کوئی اور لفظ کام نہیں آتا۔ اگر حفظِ ناموس رعایا ہے تو مروت ہے۔ اگر مفلسوں کی کاربرآری ہے تو مروت ہے۔''

غالب کا اندازِ تقریظ

لغوی اعتبار سے تقریظ کسی شے کے متعلق رائے دینے کو کہتے ہیں۔ مگر 'تقریظ کردن' کے متعلق 'فرہنگِ فارسی' یہ کہتی ہے کہ اس کے معنی کسی کتاب کے متعلق تعریف لکھنا یا اس کی خوبیاں بیان کرنا ہے۔ اسی کے مطابق تخلیق کار اپنی ہر تخلیق کی خواہ وہ اچھی ہو یا بُری صرف تحسین و آفرین ہی چاہتا ہے۔ مگر مرزا غالب کی تقریظ کے متعلق الطاف حسین حالی تحریر کرتے ہیں کہ:

"مرزا کی عادت بالکل اس کے خلاف تھی۔ کوئی کیسا ہی معزز و محترم آدمی ہو۔ جب تک اس کا کوئی شعر فی الواقع مرزا کو پسند نہ آتا تھا، وہ ہرگز اس کی تعریف نہ کرتے تھے۔ جب تک کوئی شعر ان کے دل میں نہ چبھتا وہ ٹس سے مس نہ ہوتے۔ ان کے بعض معاصرین اس بات سے آزردہ رہتے تھے اور اسی لیے ان کی شاعری پر نکتہ چینیاں کرتے تھے۔ مگر مرزا باوجودیکہ ان کی طبیعت نہایت صلح جو واقع ہوئی تھی۔ لیکن جو شعر ان کے دل میں چبھ جاتا تھا۔ اس کی تعریف بھی ایسی کرتے تھے جو مبالغے کی حد کو پہنچ جاتی تھی۔ وہ درحقیقت کسی کے خوش کرنے کے لیے ایسا نہیں کرتے تھے۔ بلکہ ذوقِ سخن ان کو بے اختیار کر دیتا تھا۔"

غالب کے تنقیدی شعور کے بارے میں ایک الگ مضمون تحریر کیا جا چکا ہے۔ یہاں صرف یہ بتانا منظور ہے کہ غالب کا معیارِ تحریر و سخن کیا تھا جس کی بنیاد پر وہ اپنی تقریظ تحریر کرتے تھے۔ غالب نے اپنی کلیات نثر 'پنج آہنگ' میں تعریفِ سخن اس طرح کی ہے کہ: "سخن...... گراں زمتاعِ عالم قدس است" لیکن محفلِ ادب میں جس "سخن" کو بار حاصل ہے وہ "ایک معشوقہ پری پیکر ہے۔ تقطیع شعر اس کا لباس اور مضامین اس کا زیور ہے۔ دیدہ وروں نے شاہد سخن کو اس لباس اور اس زیور میں روکش پایا ہے۔" اس کی مزید وضاحت اس طرح کی ہے کہ...... "شاعری معنی آفرینی ہے، قافیہ پیمائی نہیں ہے۔" مختصراً ہم 'سہل ممتنع' کو شعر کی خوبی اور حسن قرار دے سکتے ہیں اور مرزا غالب نے بھی اسی خوبی کو حسنِ بیان کی معراج قرار دیا ہے۔ وہ تحریر کرتے ہیں کہ:

> "سہل ممتنع اس نظم کو کہتے ہیں جو دیکھنے میں آسان نظر آئے اور اس کا جواب نہ پیش کیا جا سکے۔ بالجملہ سہلِ ممتنع، کمال حسنِ کمال ہے اور بلاغت کی نہایت ہے۔ ممتنع درحقیقت ممتنع النظیر ہے۔ خودستائی ہوتی ہے۔ سخن فہم اگر غور کرے گا تو فقیر کی نظم و نثر میں سہل ممتنع اکثر پائے گا۔"

انہوں نے اس سلسلے میں نبی بخش کو اپنا مندرجہ ذیل شعر تحریر کیا تھا:

سب کہاں، کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہو گئیں

"پنج آہنگ" کے دیباچے میں انہوں نے نثر نگاری کا معیار بتاتے ہوئے جو کچھ تحریر کیا وہ کچھ یوں ہے:

> "نامہ نگار کو چاہیے کہ نگارش کو مقصود سے زیادہ دور نہ لے جائے اور تحریر میں تقریر کا رنگ پیدا کرے۔ نفس مطلب کو ایسے انداز میں قلم بند کرے کہ اس کے سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔ اگر نامہ نگار کے

سامنے زیادہ مطالب ہوں تو تمام مطالب کو انتہائی احتیاط سے جدا جدا
بیان کرے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ سب خلط ملط ہو جائیں اور پڑھنے والے
کے لیے الجھن کا باعث بنیں۔ نامانوس الفاظ اور دقیق استعارات سے
عبارت کو پاک رکھا جائے۔ حتیٰ الامکان تحریر کو طول نہ دیا جائے اور
لطفِ تحریر کا تقاضا یہ ہے کہ ایک لفظ بار بار استعمال نہ کیا جائے۔"

یہی غالب کا وہ معیارِ سخن اور تنقیدی شعور تھا جس کے تحت انہوں نے تقریظ کو صرف قصیدہ خوانی کے بجائے حقیقت بیانی کی طرح تحریر کیا ہے تاکہ مصنف و قاری دونوں کو اس سے فائدہ پہنچے۔

جیسا کہ تحریر کیا گیا اچھا شعر غالب کے دل پر بھی بہت اثر کرتا تھا اور وہ برملا اس کی مدح سرائی کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کی مدح و ثنا رشک کے حدود میں داخل ہوتی ہوئی بھی محسوس کی جا سکتی ہے۔ اس کی چند مثالیں اس طرح بیان کی گئی ہیں کہ جب انہوں نے مومنؔ خان مومنؔ کا یہ شعر سنا:

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

تو ان کا ردِ عمل یہ تھا کہ کاش مومنؔ میرا دیوان لے لیتا اور صرف یہ شعر مجھ کو دے دیتا۔ اسی طرح ذوقؔ کے مندرجہ ذیل شعر پر ان کا ردِ عمل بھی فطری تھا:

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

غالب کا عالم یہ تھا کہ سر دھنتے جاتے تھے اور شعر کو بار بار پڑھواتے جاتے تھے۔ جب یہ معلوم ہوا کہ یہ شعر شیخ ابراہیم ذوقؔ کا ہے تو انہیں بہت تعجب ہوا، اور کچھ ایسا ہی تاثر نواب مرزا داغؔ کے اس شعر پر بھی تھا:

رُخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا ادھر آتا ہے پروانہ

حقیقت پسندی کا دوسرا رُخ یہ بھی نظر آتا ہے کہ سرسید جیسی عزیز شخصیت کے لیے بھی جب ان کی مرتب کردہ "تصحیح آئین اکبری" پر مرزا غالب کو دعوت تقریظ دی گئی تو ان کی نقادانہ طبیعت مدح وستائش کی طرف مائل نہ ہو سکی۔ انہوں نے تقویم پارینہ کی تصحیح کے کام کو وقت کا ضیاع سمجھا اور اسے اپنے شعری تقریظ میں رقم کر دیا۔ اس تقریظ کے چند اشعار دیکھیے:

مژدهٔ یاراں را کہ ایں دیریں کتاب
یافت از اقبال سید فتح یاب
مردہ پروردن مبارک کار نیست
خود بگو کاں نیز جز گفتار نیست

ہاں! آخر میں سید احمد خاں کی پاسِ خاطر کے لیے بھی کچھ اشعار تحریر کر دیے:

غالب آئین خموشی دلکش است
گرچہ خوش گفتی نہ گفتن ہم خوش است
در جہاں سید پرستی دین تست
از شاہ بگذر دعا آئین تست
ایں سراپا فرہ و فرہنگ را
سید احمد خان عارف جنگ را
ہر چہ خواہد از خدا موجود باد
پیش کاوش طالع مسعود باد

سرسید غالب کی اس تقریظ سے خوش نہیں ہوئے اور انہوں نے اسے آئین

اکبری کا حصہ نہیں بنایا۔

غالب کے ایک عزیز شاگرد منشی ہرگوپال تفتہ نے جب ان سے اپنے دیوان کی تقریظ لکھوائی تو انہوں نے بھی استاد سے شکوہ کیا۔ مرزا نے اپنے جواب میں تحریر کیا:

”کیا کروں اپنا شیوہ ترک نہیں کیا جاتا۔ وہ روش ہندوستانی فارسی لکھنے والوں کی مجھ کو نہیں آتی کہ بالکل بھاٹوں کی طرح بکنا شروع کردوں۔ میرے قصیدے دیکھو! تشبیب کے شعر بہت پاؤ گے اور مدح کے شعر کمتر۔ نثر میں بھی یہی حال ہے۔ نواب مصطفےٰ خاں کے تذکرے کی تقریظ ملاحظہ کرو کہ ان کی مدح کتنی ہے؟ مرزا رحیم الدین حیا کے دیوان کا دیباچہ دیکھو۔ وہ جو تقریظ انطباع دیوان حافظ کی جان جاکوب کی فرمائش سے لکھی ہے، اس کو دیکھو کہ فقط ایک بیت میں ان کا نام اور ان کی مدح آئی ہے اور باقی ساری نثر میں کچھ اور ہی مطالب ہیں۔ واللہ باللہ کسی شہزادے کے دیوان کا دیباچہ لکھتا تو اس کی مدح اتنی نہ کرتا کہ جتنی تمہاری مدح کی ہے۔ ہم کو اور ہماری رروش کو اگر پہچانتے تو اتنی ماح کو بہت جانتے۔ قصہ مختصر تمہاری خاطر کی اور ایک فقرہ تمہارے نام کا بدل کر اس کے عوض ایک فقرہ اور لکھ دیا ہے۔ اس سے زیادہ بھی میری روش نہیں۔“

اس طرح غالب نے اپنے انداز تقریظ کی بڑی تفصیل اور مثالوں کے ساتھ وضاحت کردی ہے کہ اس کا مقصد حقیقت بیانی ہے کسی کو صرف خوش کرنا نہیں۔

خطوطِ غالب میں انشا پردازی

بقول حالی مرزا کی عام شہرت ہندوستان میں جس قدر ان کی اردو نثر کی اشاعت سے ہوئی ہے ویسی نظم اردو اور نظم فارسی اور نثر فارسی سے نہیں ہوئی۔

نثرِ غالب کے شواہد ان کی چند تقریظوں، دیباچوں، رقعات اور 'برہان قاطع' کے جواب میں لکھے گئے تین کتابچوں، لطائف غیبی، تیغ تیز اور نامہ غالب کے علاوہ ان کے تاریخ ساز خطوں میں پائے جاتے ہیں۔ انہوں نے ۱۸۵۱ء میں ان کی ابتداء کی اور ان کے یہ خطوط 'عودِ ہندی' اور 'اردوئے معلیٰ' کے نام سے ۱۸۶۸ء اور ۱۸۹۹ء میں شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے غالب کے خطوط کے بارے میں ایک اہم بات تحریر کی ہے کہ انہوں نے اپنے خطوط کے ذریعے اردو نثر کو وہ لب و لہجہ دیا جو بعد کو سر سید، حالی اور مولوی عبدالحق کی علمی و ادبی نثر کا راہنما بن گیا۔

خطوطِ غالب کیا ہیں گویا کہ اپنے چاہنے والوں سے دلچسپ گفتگو ہے جو روایتی القاب و آداب اور غیر ضروری لوازم سے بالکل عاری ہے۔ ہاں! متوجہ کرنے کے لیے میاں برخوردار، بھائی صاحب اور مہاراج جیسے مناسب الفاظ ضرور گفتگو کا آغاز بنے ہیں۔ اکثر ان کے بغیر بھی گفتگو شروع کر دی جاتی ہے۔ اس بات کی تصدیق حالی کی اس تحریر سے ہوئی ہے:

"مرزا غالب کی اردو خط و کتابت کا طریقہ فی الواقع سب سے نرالا ہے۔ نہ مرزا سے پہلے کسی نے خط و کتابت میں یہ رنگ اختیار کیا اور نہ ان کے بعد کسی سے اس کی پوری تقلید ہو سکی۔ انہوں نے القاب، آداب کا پرانا اور فرسودہ طریقہ اور بہت سی باتیں جن کی مترسلین نے لوازم نامہ نگاری میں سے قرار دے رکھا تھا، مگر در حقیقت فضول اور دور از کار تھیں، سب اڑا دیں۔ وہ خط کو کبھی میاں، کبھی برخوردار، کبھی بھائی صاحب کبھی صاحب، کبھی مہاراج، کبھی اور مناسب لفظ سے آغاز کرتے ہیں۔ اس کے بعد مطلب لکھتے ہیں اور اکثر بغیر اس قسم کے الفاظ کے مدعا لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ ادائے مطلب کا طریقہ بالکل ایسا ہے جیسے دو آدمی بالمشافہ بات چیت کرتے ہیں۔"

خطوط غالب کی اہمیت کے بارے میں معروف نقاد ریاض صدیقی یوں رقم طراز ہیں:

"مراسلہ نگاری کو ادبی صنف کا مرتبہ غالب کے انہی خطوط کے ذریعے ملا۔ اردو نثر کی ادبی اصناف میں یہ خطوط ایک نئی دریافت اور تسخیر ہیں، جن کے ساتھ زبان کی سادگی اور عمومیت کا وہ رحجان پایۂ تکمیل تک پہنچا جس کی داغ بیل میر امن دہلوی نے ڈالی تھی۔ زبان کو سماجی عمل کی حیثیت سے برتنے میں غالب کا نام سرفہرست ہے۔ گویا انہوں نے اردو زبان کو جسے وہ ہندی کہتے تھے صدیوں کی قید سے رہائی دلا دی اور ان لوگوں میں واپس لائے جن کی گود میں پل بڑھ کر وہ بلوغت کی منزل تک آئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے لفظوں اور محاوروں کے معاملے میں "غلط العوام" کو معیار بنایا۔"

شاعری کی طرح غالب نے کافی عرصے تک فارسی زبان کو اپنا ذریعۂ اظہار بنایا اور انہیں اپنی فارسی تحریروں پر بڑا ناز تھا۔ مگر جیسے جیسے اردو خواص و عوام میں مقبول ہوتی گئی اور سکۂ رائج الوقت کی حیثیت اختیار کر گئی تو مجبوراً غالب کو بھی اسی طرف آنا پڑا۔ یہاں تک کہ جب ۱۸۵۰ء میں تیموری خاندان کی تاریخ (مہر نیم روز) لکھنے پر مقرر کیا گیا اور شاہ ظفر نے انہیں نجم الدولہ، دبیر الملک اور نظام جنگ کے خطاب سے نوازا، ساتھ ہی چار سال بعد استاد شاہ شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ کے بعد بہادر شاہ ظفر کی غزلوں پر اصلاح دینے کا سلسلہ بھی شروع ہوا اس وقت ضرورت کے تحت انہیں بھی اردو ہی کو ذریعہ اظہار بنانا پڑا۔ مگر جس زبان کو انہوں نے بہ جبر استعمال کیا وہی آخر میں دنیائے ادب میں ان کی شہرت و عظمت کا سبب بنی۔

خطوط کے ابتدائیہ سے آگے بڑھ کر جب ہم اس کے متن پر نظر ڈالتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی ظرافت اور شوخیٔ تحریر نے مکاتیب کو ڈرامے اور ناول سے زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس نے ان کے خطوط میں انفرادیت، دلچسپی اور لطفِ بیان کے نئے در وا کر دیے ہیں۔

مرزا غالب نے جہاں اپنے خطوط میں ظرافت کے پہلو وا کیے ہیں وہیں ۱۸۵۷ء (غدر) کے بعد جب وہ اپنے گھر میں خود ہی محصور ہو گئے تھے تب انہوں نے اپنے احباب کو جو خطوط لکھے ان میں اس وقت کے دہلی کی تاریخ رقم کر دی ہے۔ یہ خطوط غالب کو شاعر اور انشا پرداز سے بڑھ کر ایک تاریخ نویس کا درجہ بھی دیتے ہیں۔

جب ظرافت کی بات آتی ہے تو مرزا مکتوب الیہ کی عمر اور مذاق کے مطابق اپنے خط میں شوخیاں کرتے ہیں۔ مثلاً اپنے ایک دوست کی بیٹی کو جو بچپن میں مرزا صاحب کے سامنے آتی تھی اور اب جوان ہو گئی ہے وہ یوں تحریر کرتے ہیں:

''کیوں بھئی! اب اگر ہم کول آئے بھی تو تم کو کیونکر دیکھیں گے۔ کیا تمہارے

ملک میں بھتیجیاں چچا سے پردہ کرتی ہیں؟"

غالب نے دسمبر ۱۸۵۸ء کی آخر تاریخوں میں اپنے ایک دوست کو خط لکھا۔ انہوں نے اس کا جواب ۱۸۵۹ء کی پہلی یا دوسری تاریخ کو لکھ کر بھیجا۔ مرزا صاحب نے دوبارہ انہیں اس طرح لکھ کر خط بھیجا:

"دیکھو صاحب! یہ باتیں ہم کو پسند نہیں۔ ۱۸۵۸ء کے خط کو جواب ۱۸۵۹ء میں بھیجتے ہو، اور مزا یہ ہے کہ جب تم سے کہا جائے گا تو یہ کہو گے کہ میں نے دوسرے ہی دن جواب لکھا ہے۔"

غالب اپنے خطوط کے ذریعے تاریخ یوں رقم کرتے ہیں کہ جب دلی کے لٹنے کے بعد ایک خط نواب علاؤالدین خاں کو تحریر کرتے ہیں تو اس میں یوں رقم طراز ہیں:

"کل تمہارے خط میں دوبارہ یہ کلمہ مرقوم دیکھا کہ دلی بڑا شہر ہے، ہر قسم کے آدمی وہاں بہت ہوں گے۔"

اے میری جان! یہ وہ دلی نہیں ہے جس میں تم پیدا ہوئے ہو۔ وہ دلی نہیں ہے جس میں تم نے علم تحصیل کیا ہے۔ وہ دلی نہیں ہے جس میں تم شعبان بیگ کی حویلی میں مجھ سے پڑھنے آتے تھے۔ وہ دلی نہیں ہے جس میں سات برس کی عمر سے آتا جاتا ہوں۔ وہ دلی نہیں ہے جس میں اکیاون برس سے مقیم ہوں۔ ایک کیمپ ہے جس میں مسلمان اہل حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ باقی سراسر ہنود۔ بادشاہ کے ذکور جو بقیۃ السیف ہیں، وہ پانچ پانچ روپے مہینہ پاتے ہیں۔ امرائے اہل اسلام میں اموات گنو تو حسن علی خاں، بہت بڑے باپ کا بیٹا سو روپے روز کا پنشن دار، سو روپے مہینہ کا روزینہ دار بن کر نامراد انہ گیا۔

میر ناصر الدین باپ کی طرف سے پیرزادہ، نانا اور نانی کی طرف سے امیرزادہ مظلوم مارا گیا۔ آغا سلطان بخشی محمد علی خاں کا بیٹا جو خود بھی بخشی ہو چکا ہے، بیمار پڑا نہ دوا نہ غذا انجام کار مر گیا۔ تمہارے چچا کی سرکار سے تجہیز و تکفین ہوئی۔

احباء کو پوچھو تو ناظر حسین مرزا، جس کا بڑا بھائی مقتولوں میں آیا، اس کے پاس ایک پیسہ نہیں، ٹکے کی آمد نہیں۔ مکان اگرچہ رہنے کو مل گیا ہے مگر دیکھیے چھٹا رہے یا ضبط ہو جائے۔

بڈھے صاحب ساری املاک بیچ کر اور نوشِ جان کر کے بیک بینی و دو گوش بھرت پور چلے گئے۔ ضیاء الدولہ کی پانچ سو روپیہ کرائے کی املاک واگزاشت ہو کر پھر قرق ہو گئی۔ تباہ و برباد لاہور گیا۔ وہاں پڑا ہوا ہے، دیکھیے کیا ہوتا ہے؟

قصہ کوتاہ، قلعہ اور جھجر اور بہادر گڑھ اور بلبھ گڑھ اور فرخ نگر کم و بیش تیس لاکھ کی ریاستیں مٹ گئیں۔ شہر کی عمارتیں خاک میں مل گئیں۔ ہنر مند آدمی یہاں کیوں پایا جائے۔ جو حکماء کا حال کل لکھا ہے وہ بیان واقع ہے۔ صلحاء اور زہاد کے باب میں جو حرف مختصر میں نے لکھا ہے اس کی بھی سچ جانو۔

بہت سے خطوط میں ناامیدی و افسردگی اور اس جہان کی بے اعتباری و بے ثباتی کا حال بہت تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، جس سے اس وقت کی صورت حال کا کسی حد تک اندازہ ہوتا ہے۔ مثلاً ایک خط میں اپنی پیرانہ سالی اور پریشانی کا حال اس طرح تحریر کرتے ہیں:

ناتوانی زور پر ہے، بڑھاپے نے نکما کر دیا ہے۔ ضعف، سستی، کاہلی، گراں جانی، رکاب میں پاؤں ہے نہ باگ پر ہاتھ ہے۔ بڑا سفر دور دراز درپیش ہے۔ زادِ راہ موجود نہیں، خالی ہاتھ جاتا ہوں۔ اگر ناپرسیدہ بخش دیا تو خیر اور اگر باز پرس ہوئی تو سقر مقر ہے اور ہاویہ زاویہ ہے۔ دوزخ جاوید ہے۔ اور ہم ہیں۔ ہائے کسی کا کیا اچھا شعر ہے:

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

میر مہدی مجروح کو لکھا گیا ایک خط ان سے بالمشافہ گفتگو کی مانند ہے۔ ان کے

اس منفرد اور نرالے انداز کی تقلید ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔ غالب کا یہ نرالا طرز تحریر دیکھئے:

"اے میرن صاحب۔ السلام علیکم، حضرت آداب کہو۔ حضور! آج اجازت ہے میر مہدی کے خط کا جواب لکھنے کی؟ حضور! میں کیا منع کرتا ہوں۔ پھر آپ کیوں تکلیف کریں۔ نہیں، میرن صاحب، اس کے خط کو آئے بہت دن ہوئے ہیں۔ وہ خفا ہوگا۔ جواب لکھنا ضرور ہے۔

حضرت! وہ آپ کے فرزند ہیں۔ آپ سے خفا کیوں ہوں گے؟

بھائی! آخر کوئی وجہ تو بتلاؤ کہ تم مجھے خط لکھنے سے کیوں باز رکھتے ہو؟

سبحان اللہ! اے لو حضرت، آپ تو خط نہیں لکھتے اور مجھے فرماتے ہیں کہ تو، باز رکھتا ہے۔

اچھا! تم باز نہیں رکھتے، مگر یہ کہو کہ تم کیوں نہیں چاہتے کہ میں میر مہدی کو خط لکھوں؟

کیا عرض کروں؟ سچ تو یہ ہے کہ جب آپ کا خط جاتا اور پڑھا جاتا تو میں سنتا اور حظ اٹھاتا۔ اب جو میں وہاں نہیں ہوں تو نہیں چاہتا کہ آپ کا خط جاوے۔ میں اب پنجشنبہ کو روانہ ہوتا ہوں۔ میری روانگی کے تین دن بعد آپ خط شوق سے لکھیے گا۔

میاں بیٹھو! ہوش کی خبر لو۔ تمہارے جانے نہ جانے سے مجھے کیا علاقہ؟ میں بوڑھا آدمی، بھولا آدمی تمہاری باتوں میں آ گیا اور آج تک اسے خط نہیں لکھا۔ لاحول ولا قوۃ۔"

غالب کے خطوط کی منفرد طرز تحریر اور اس میں انشا پردازی کی چند مثالیں ان کے نثری آہنگ اور شوخیٔ تحریر کو پیش کرتی ہیں اور ان کی حیثیت بطور ایک صاحب طرز انشا پرداز

متعین ہو جاتی ہے لہٰذا انہی کے الفاظ میں کہنا پڑتا ہے کہ "غالب کا ہے انداز بیاں اور"۔

آخر میں مشرق اور مغرب کے دو نقادوں کی آراء کے ساتھ ہی میں اپنی اس گفتگو کا اختتام کروں گا۔

ابتدا میں اردو خطوط نویسی مقفّیٰ اور مسجع عبارتوں سے مزین ہوتی تھی۔ اس کی تبدیلی اور وہ بھی منفرد انداز اور جدید رنگ میں غالب ہی کا اجتہاد قرار دیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں 'داستانِ تاریخ اردو' کے مصنف مولانا حامد حسن قادری غالب کی اس خصوصیت کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

> "نثر اردو میں غالب کی الوہیت اور اولیت ان کے واقعات کے سبب سے ہے۔ اردو خطوط نویسی کا غالب نے جو طریقہ ایجاد کیا اور اس میں جو جدتیں پیدا کیں اور ان کو جس التزام واہتمام کے ساتھ برتا، اس میں غالب اول بھی ہیں اور آخر بھی۔"

غالب کی خطوط نویسی میں پائی جانے والی اس جدت طرازی کا اعتراف مغربی دانشوروں نے بھی کیا ہے۔ پروفیسر گراہم بیلی نے اپنی "تاریخ ادب اردو" میں غالب کی خطوط نویسی کے متعلق مختصر لیکن جامع بیان اس طرح دیا ہے:

"He (Ghalib) changed the whole course of Urdu letter writing substituting the natural for the artificial".

تشریح کلام غالب

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

غالب کہتے ہیں کہ نقاش ازل کا ہر وجود اپنی ناپائیداری کا شاکی ہے کیوں کہ ہر وجود اپنی اصلیت میں عارضی ہے۔ (غالب نے قدیم ایران کے اس رواج کی طرف اشارہ کیا ہے جس میں فریادی حاکم کے سامنے کاغذی لباس پہن کر جاتا تا کہ اس کی ناپائیداری کا اظہار ہو)

کاو کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

غالب کہتے ہیں کہ تنہائی کے عذاب کی سخت جانی نہ پوچھیے بس یوں سمجھ لیجئے کہ انتہائی تکلیف دہ شام کا صبح کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ یعنی ایک مشکل کام انجام دینا ہے۔

ہوائے سیرِ گل آئینۂ بے مہریٔ قاتل
کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا

ہمارے سنگدل قاتل یعنی محبوب کو باغ میں جانا اور سیرِ گل کرنا اس لیے پسند ہے

کہ وہاں اسے سرخ پھول خون میں نہائے ہوئے دیکھ کر خوشی ہوتی ہے۔

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار
صحرا مگر بہ تنگیٔ چشم حسود تھا

غالب کہتے ہیں کہ قیس کی طرح کوئی اور سرگرم عمل ہوا ہی نہیں ورنہ اسے پتہ چل جاتا کہ نا قابل عبور سمجھا جانے والا صحرا تو چشم حاسد کی طرح تنگ اور مختصر ہے۔

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد
سرگشتۂ خمار رسوم و قیود تھا

غالب کہتے ہیں کہ کوہکن (فرہاد) نے جان دینے کے لیے تیشہ استعمال کیا جو اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ ابھی اس کا عشق خام تھا کیونکہ عشق میں فنا ہونے کے لیے رسوم وقیود کے تحت کسی آلے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

ڈھانپا کفن نے داغ عیوب برہنگی
میں ورنہ ہر لباس میں ننگ وجود تھا

غالب کہتے ہیں کہ انسان بنیادی طور پر ایک حیوان ہے۔ تمام تر تہذیبی قدروں کے باوجود انسان ابھی تک اپنی حیوانیت پر قابو نہیں پا سکا۔ وہ تو ہر تہذیبی لباس میں ننگ وجود رہا ہے۔ صرف کفن نے اس کی حیوانیت کی پردہ پوشی کی ہے یعنی موت نے انسان کو حیوانیت کے اظہار سے روکا ہے۔

لیتا ہوں مکتب غم دل میں سبق ہنوز
لیکن یہی کہ 'رفت' گیا اور 'بود' تھا

فکرِ غالب کے مطابق اس شعر کا مفہوم عام مطلب سے بالکل مختلف ہے وہ کہتا ہے کہ میں ہنوز مکتب عشق (غم دل) سے یہ درس لیتا رہتا ہوں کہ غموں کا سبب معلوم کر کے ان کو (بھگا) رفت و بود کر سکوں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کبھی غم کو اپنے اوپر طاری نہیں ہونے دیتا۔

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

یہ شعر غالب کے سائنسی شعور اور معراج فکر کی غمازی کرتا ہے۔ انسان کی ترقی اس کی خواہشوں اور تمناؤں کی آئینہ دار ہے۔ تمام دشت امکاں اس کا صرف ایک قدم ہے (جیسے کہ چاند پر انسان کا پہلا قدم) لیکن اس کی جستجو اسے بیقرار رکھتی ہے کہ وہ ارتقا کا دوسرا قدم کہاں رکھے۔

شوق ہر رنگ رقیبِ سرو ساماں نکلا
قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

قیس کے عشق کا تقاضہ حصول لیلیٰ تھا جس کے لیے وہ ذرائع کا محتاج نہیں تھا یہاں تک کہ اسے اپنے جسم کے کپڑوں کا بھی ہوش نہیں تھا اور وہ تصویر اترواتے وقت بھی ننگا ہی رہا۔

اہلِ بینش نے بہ حیرت کدۂ شوخیٔ ناز
جوہرِ آئینہ کو طوطیِ بسمل باندھا

اہلِ نظر یعنی سائنسدانوں اور فلسفیوں کی نگاہ میں یہ تمام کائنات ایک ایسا آئینہ ہے جس میں قدرت کے حسن کی نیرنگیاں جلوہ گر ہیں۔

کچھ نہ کی اپنے جنونِ نارسا نے ورنہ یاں
ذرہ ذرہ روکشِ خورشید عالمتاب تھا

خود ہمارے ہی جذبہ عمل کی کمی نے ہم کو زندگی میں ناکام رکھا ورنہ قدرت نے ہر ذرے میں توانائی کے وہ خزانے بھر دیے تھے جو سورج کے مدمقابل ہو سکتے ہیں۔

نہ ہو گا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا
حبابِ موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا

انسانوں کی نمائندگی کرتے ہوئے غالب کہتے ہیں کہ تھکاوٹ کے باوجود جستجو اور ارتقاء کا سفر جاری رہے گا اور اس کے ذوق میں کمی نہیں آئے گی۔

یک الف بیش نہیں صیقل آئینہ ہنوز
چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا

انسان کی تہذیب کا آئینہ ابھی تک 'یک الف' سے زیادہ صیقل نہیں ہوسکا، یعنی ابھی بھی پوری طرح صاف نہیں ہوسکا حالانکہ انسان نے جب سے تہذیب کا جامہ زیب تن کیا ہے وہ اسے بہتر بنانے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔

اب میں ہوں اور ماتم یک شہر آرزو
توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا

اے میرے محبوب تو نے میرا دل نہیں توڑا بلکہ اس آئینہ دل کو توڑا ہے جس میں تیری ہی تصویر جلوہ افروز تھی۔ اس طرح تمناؤں کی کثرت سے مزین جس شہر آرزو کو برباد کر دیا اب میں اس کا ماتم کرتا رہوں گا۔

سراپا رہن عشق و ناگزیر الفت ہستی
عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

انسانی زندگی مکمل طور پر عشق سے مرقوم ہے۔ یہ عشق اپنی ذات سے بھی ہے اور اپنے محبوب سے بھی۔ عشق محبوب کی آگ میں وہ اپنے مفادات کو بھی قربان کر دیتا ہے۔ اس طرح وہ جذبۂ عشق کی عبادت بھی کرتا ہے۔ اور اپنے وجود کے فنا ہوانے کا افسوس بھی۔

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینۂ باد بہاری کا

کوئی لطیف شے اس وقت تک جلوہ پیدا نہیں کرسکتی جب تک وہ کسی کثافت کے

ساتھ نہ مل جائے۔ اس کو سائنس نے بھی ثابت کر دیا ہے مثلاً توانائی بھی بغیر مادی لباس کے ناقابلِ ادراک ہے۔ اسی طرح چمن بھی بادِ بہاری کی لطافت کو کثیف مظہر ہے۔ اور اس تمام کائنات میں روحِ مطلق موجود ہے۔ مگر وہ اس قدر لطیف ہے کہ بلا مادی وجود اختیار کیے ظاہر نہیں ہو سکتی ہم اس کا ادراک نہیں کر سکتے مگر جب وہ چمن کائنات میں ظاہر ہو گئی تو اس کا حسن ہر ایک کے لیے قابلِ دید ہوگا۔

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل
کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

بلبل کا کاروبارِ زندگی تو پھولوں سے عشق ہے مگر پھول کھل کر گویا اس پر ہنس کر طنز کر رہے ہیں کہ ان کی حیاتِ مختصر کے باوجود بلبل کا عشق یقیناً اس کے دماغ کا خلل ہے۔

حیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

ایسا جامۂ تہذیب جو عشاقِ انسانیت کے ہاتھوں ہر وقت چاک ہوتا رہے، بہت ہی قابلِ افسوس ہے۔ ایسا معاشرہ جس میں عام انسانوں کے لیے مسرتوں کا فقدان ہو، جہاں وسائلِ حیات کی تقسیم غیر منصفانہ ہو اور جس کی تہذیبی اقدار میں خرابی کی ایک صورت مضمر ہو کہ اس میں رہنے والی اکثریت زندگی کی بنیادی ضرورتوں سے محروم ہو، ایسا جامہ تہذیب وہ بدقسمت نظام ہے جس کی تقدیر میں خود اسی معاشرے کی انقلابی شخصیتوں کے ہاتھوں چاک ہونا لکھا ہوا ہے، اور وہ معاشرہ ہر وقت انقلابات کی زد میں رہے گا اور اس میں سلامتی اور استحکام ناپید ہوگا۔

عرض کیجیے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

اس شعر میں کہا گیا ہے کہ انسان کے اندیشے کی استعداد میں جو گرمی، اور

حرارت ہے اس کا اظہار ناممکن ہے۔ بس یوں سمجھئے کہ اس کے خیالات میں وحشت کی کیفیت پیدا ہو جائے تو پھر اس کے تخریبی جوہر سے جو آگ پیدا ہو گی وہ صحرا کو بھی جلا کر خاک کر دے گی۔

حقیقت میں یہ کہا جا رہا ہے کہ انسانی ذہن کی طاقت اور صلاحیت کا بیان ناممکن ہے کیونکہ جیسے جیسے تحقیق اور تجربات کے ساتھ علم میں اضافہ ہوتا جائے گا اس کی صلاحیتوں کے جوہر اجاگر ہوتے جائیں گے، اور اگر مثبت اور تعمیری اقدار کی وجہ سے وہ صحراؤں کو مٹا کر گلشن تعمیر کر سکتی ہے تو اس کی وحشت اور تخریبی صلاحیت صحراؤں کو جلا کر خاکستر بھی کر سکتی ہے۔

زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی
کیوں ترا راہ گزر یاد آیا

روایتی مفہوم سے ہٹ کر اگر ہم غور کریں تو بات سمجھ میں آتی ہے کہ ہمارے معاشرے کے مراعات یافتہ اور اہل ثروت طبقات کی زندگی اس قدر پر مسرت راہوں سے گزرتی ہے کہ محروم افراد کے لیے ان کا تصور بھی ناممکن ہے۔ غالب کو بھی شاہوں اور جاگیرداروں کی محفل میں شریک ہونے کا موقع ملا۔ اس کے پس منظر میں وہ کہتے ہیں کہ ہمارے لیے محرومی کی زندگی برداشت کر لینا گو مشکل ہے مگر بہر حال یہ دن کسی نہ کسی طرح گزر ہی جاتے مگر ایک ہی معاشرے میں دو طبقات کی زندگیوں کا یہ تضاد ہمارے لیے ناقابل برداشت ہے۔

غالب ۔ بحیثیت ایک تاریخ داں

ہیرو ڈوٹس اور تھوسی ڈائڈس یونان کے دو ایسے تاریخ نویس ہیں جو دنیائے تاریخ کے بنیاد گزار تصور کیے جاتے ہیں ان کے بعد مسلم دنیا کا ایک اہم نام ابن خلدون کا ہے۔ جس نے اسے فلسفۂ تاریخ بنا کر اس کا دائرہ کار وسیع کیا۔ اس کی شاہکار تصنیف مقدمہ ابن خلدون اساسی حیثیت کی حامل ہے۔ جس کا اعتراف فلپ ہٹی نے اپنی کتاب 'عربوں کی تاریخ' میں کیا ہے۔ لیکن عہدِ مغلیہ میں برصغیر کی تاریخ صرف شاہی خاندانوں تک محدود ہو کر رہ گئی تھی جس کی مثال 'آئین اکبری' اور 'تزک جہانگیری' جیسی نام نہاد تاریخی کتابوں کی صورت میں ملتی ہے۔ معروف عصری تاریخ نویس ڈاکٹر مبارک علی کی تحریر کا اقتباس اس بات کی تصدیق کرتا ہے:

> "طالب علمی کے زمانے میں ہمیں جو تاریخ پڑھائی گئی، وہ سیاسی تاریخ تھی کہ جس میں شاہی خاندانوں کا ذکر تھا، جنگوں کی تفصیلات تھیں، سلطنت کے انتظامی امور کے بارے میں بتایا جاتا تھا اور تھوڑا بہت دربار کے کلچر پر روشنی ڈالی جاتی تھی۔ وہ شعراء علماء یا دربار کی زینت ہوتے تھے یا فنِ تعمیر کے سلسلے میں شاہی محلات اور یادگاروں کی تعمیر۔ اس تاریخ میں کہیں عام لوگ نہیں ہوتے تھے، نہ ان کی طرز زندگی کے

بارے میں کوئی ذکر ہوتا تھا۔"

اس طرح تاریخ فقط شاہی قصے کہانیوں اور ظلم و بربریت کی داستان ہوتی تھی جس سے شاید عوام کو شاہی جاہ و جلال اور رعب و دبدبہ جتا کر دہلایا اور ڈرایا جاتا تھا۔ اس طرح مسلم برصغیر کی تاریخ نویسی علم و فلسفہ کے ساتھ مذاق نظر آتی ہے۔

بہت سے انگریز مورخوں نے، جو ۱۸ ویں اور ۱۹ ویں صدی میں برصغیر آئے تھے، مقامی تاریخ نویسوں کی نااہلی کا ذکر کیا ہے۔ اسی سلسلے میں ایس ٹی سورلے تحریر کرتا ہے:

"زیادہ تر مقامی تاریخ نویسوں نے محلاتی تذکروں اور روزناموں کو تاریخ کے طور پر تحریر کیا ہے۔ ان کو عوام اور غریبوں کی زندگیوں سے کوئی غرض نہیں ہے۔ انہوں نے جاگیرداروں کی معاشی ابتری کے بارے میں کوئی بات تحریر نہیں کی۔ غیر ترقی یافتہ ملکوں کی تاریخ میں یہ خرابی عام طور پر نظر آتی ہے۔"

سورلے کے اس بیان میں بے معنویت یا تعصب کا کوئی پہلو نظر نہیں آتا کیوں کہ بیان حقائق پر مبنی ہے۔ مگر غالب جیسے باشعور شخص نے جب اپنے دور کی تاریخ 'دستنبو' کے نام سے رقم کی تو ان کے دور کی عصری صورت حال کچی تصویر نظر آئی۔ انہوں نے شاعری اور خطوط نویسی کی طرح اس میں بھی اجتہاد سے کام لیا اور اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا۔ بلکہ یوں کہا جائے تو بہت درست ہوگا کہ اردو تاریخ نویسی میں انقلاب برپا کر دیا اور اسے نئی جہت عطا کی۔ مگر 'دستنبو' کو انگریزوں کے ساتھ غالب کی وفاداری کی دستاویز قرار دیا گیا ہے۔ جس میں باغیوں کے ظلم و ستم کی داستان بیان کی گئی ہے اور چار ماہ چار روز بعد باغیوں کی پسپائی اور انگریزوں کی حکومت قائم ہونے پر اظہار خوشی کیا گیا ہے اور باغیوں کو جو سزائیں دی گئی ہیں انہیں منصفانہ جتایا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالب نے 'دستنبو' میں غدر دہلی کی تاریخ اس نقطہ نظر سے لکھی ہے کہ انگریز حکومت کو غالب کی وفاداری پر کوئی شک

نہ رہ جائے۔ 'دستنبو' ضمیمہ الف پر پیش کر دی گئی ہے۔ مگر یہ ان کی مورخانہ شخصیت کا ایک رُخ ہے لہٰذا ضرورت اس بات کی تھی کہ ۱۸۵۷ء کے متعلق غالب کا ردِ عمل مکمل طور پر سامنے آ جائے۔ لہٰذا ان کے خطوط کا مطالعہ ضروری تھا جس میں انہوں نے غدر کی حقیقی تاریخ کو رقم کیا ہے۔ یہ کام خواجہ حسن نظامی نے 'غالب کا روزنامچہ غدر' مرتب کر کے بخوبی انجام دیا ہے۔ اس طرح 'دستنبو' کی یک پہلوئی تصویر بھی مکمل ہو گئی ہے۔ نظیر لدھیانوی نے لکھا ہے:

> ''روزنامچہ غدر میں جو کچھ بھی ہے، غالب کے قلم سے نکلا ہوا ہے۔ حواشی کے سوا خواجہ حسن نظامی نے اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھا۔ البتہ انہوں نے غالب کے اردو خطوط سے وہ ٹکڑے نکال کر ایک خاص ترتیب کے ساتھ سانچے میں ڈھال دیے ہیں۔ جہاں جہاں ہنگامہ ۱۸۵۷ء کا تذکرہ ان خطوط میں آیا ہے، وہاں سے وہ ٹکڑا لے لیا گیا ہے۔ کتاب کی ترتیب اس سلیقے سے ہوئی ہے کہ یہ بکھرے ہوئے اجزاء پڑھنے والے کو ایک مکمل روزنامچہ ہی معلوم ہوتے ہیں۔''

خواجہ صاحب نے اپنی اس مرتب کردہ کتاب میں لکھا ہے کہ ہندوستان کی عالمگیر تباہی پر عمومیت کے ساتھ اور دلی کی تباہی پر خصوصیت کے ساتھ غالب نے خون کے آنسو بہائے ہیں۔ مقتولوں اور مجبوروں کا انہوں نے بڑا ماتم کیا ہے۔ اس طرح غالب کی شخصیت پر سے مصلحت پسندی کا داغ کسی قدر صاف ہو گیا ہے۔ انہی کے مصرع میں تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ:

''اب وہ ہیں اور ماتمِ یک شہر آرزو''

ضمیمہ۔ الف

غدر دہلی کے افسانوں کا ساتواں حصہ

غالب کا روزنامچۂ غدر

۵۷ء

نہایت دردناک بالکل سچے اور خاص میرزا غالب مرحوم کے ہاتھ سے لکھے
ہوئے مفصل حالات جو دہلی و اہل دہلی کو غدر ۱۸۵۷ء میں پیش آئے اور جن کے
آخر میں غالب کی مشہور و معروف تاریخ غدر

"دستنبو"

کا

اردو ترجمہ

شامل ہے اور جس کو پوری جستجو سے مصورِ فطرت

حضرت مولانا خواجہ حسن نظامی دہلوی

نے مرتب کیا

نومبر ۱۹۲۱ء میں کارکن خواجہ ڈپو دہلی نے
ٹھاکر داس اینڈ سنز کے دلی پرنٹنگ ورکس دھلی میں چھپوا کر شائع کیا

غالب کے خاص قدردان

جناب ڈاکٹر سید محمود صاحب پی ایچ ڈی بیرسٹر بانکی پور کے نام اس کتاب کو منسوب کیا جاتا ہے کیونکہ وہ غالب کے ہاتھ سے لکھے اور دماغ سے نکلے ہوئے ایک ایک لفظ کے عاشق ہیں اور کلامِ غالب پر ایک لاجواب مقدمہ لکھ چکے ہیں۔

حجرہ رین بسیرا
درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین
اولیاء محبوب الٰہی دہلی

حسن نظامی
یکم نومبر ۱۹۲۱ء

غالب کا روزنامچۂ غدر

۱۸۵۷ء

غدرِ دہلی کے افسانوں کا ساتواں حصہ

دیباچہ

غدر ۱۸۵۷ء کے حالات چھ حصوں میں شائع کر چکا ہوں۔ ہر حصہ میں ایک مخصوص بات غدر کے متعلق ہے۔ پہلے حصہ میں وہ قصے ہیں جن کو میں نے بہادر شاہ کے خاندان کی عورتوں، بچوں اور مردوں کی آپ بیتی کیفیت کو ان سے سن کر یا دوسری جگہ سے معلوم کر کے اپنے طریقہ بیان کے اضافہ سے قلم بند کیا۔ اور کئی بار یہ کتاب چھپی۔

دوسرے حصہ میں انگریزوں کی خودنوشت کیفیت ہے۔ یعنی غدر میں ان پر جو مصیبتیں پڑیں ان کو انہوں نے لکھ لیا۔ اس کا نام انگریزوں کی بپتا ہے اور اس کے بھی کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔

تیسرے حصہ میں محاصرۂ دہلی کی وہ خط و کتابت ہے جو انگریزی فوج کے انگریز افسروں نے محاصرۂ دہلی کے مقام پر پنجاب کے انگریز افسروں سے کی۔

چوتھے حصہ میں بہادر شاہ بادشاہ کے مقدمہ کی مفصل روئداد ہے۔

پانچویں میں وہ خفیہ خطوط ہیں جو غدر کے زمانہ میں بادشاہ نے لوگوں کو لکھے۔

چھٹے میں اخبارات کے وہ مضامین ہیں جو زمانہ غدر میں شائع ہوئے اور جن کو اسباب غدر میں ایک سبب قرار دیا گیا۔

اب یہ ساتواں حصہ میرے خیال میں سب حصوں سے زیادہ دلچسپ، موثر اور دردناک سمجھا جائے گا۔ گو آج کل پہلے حصہ کو جو میرا لکھا ہوا ہے، بہت پسند کیا جاتا ہے مگر حق یہ ہے کہ جب غالب کا یہ روزنامچہ شائع ہوگا تو میرا لکھا ہوا پہلا حصہ اس کے سامنے ماند ہو جائے گا۔ کیونکہ میرے لکھے ہوئے حصہ میں قصہ کا مبالغہ ہے۔ اور بہت سی باتیں درد کا اثر بڑھانے کو محض فرض لکھی گئی ہیں۔ میں نے یہ مضامین جو پہلے حصہ میں جمع کر کے شائع کیے ہیں تاریخی حیثیت سے انہیں بلکہ ہندوستانیوں کو عبرت دلانے اور دنیا کا انجام اور نتیجہ دکھانے کے لیے مختلف مواقعوں پر لکھے اور مختلف رسائل واخبارات میں شائع کرائے تھے۔ اس لیے ان میں کسی قسم کی تاریخی اہمیت نہیں ہے۔ اور یہی وجہ تھی کہ میں نے ان کا نام "افسانے" رکھا ہے تا کہ ان کو تاریخی واقعات نہ سمجھ لیا جائے۔

غالب کے روزنامچہ میں ایک حرف بھی فرض نہیں ہے۔ بلکہ چشم دید اصلی حالات کی تصاویر ہیں۔ اور پھر بیان ایسا صاف، ستھرا اور اعلیٰ ہے کہ میری عبارت اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتی۔

غالب کے اس روزنامچہ سے دہلی کی عمارتوں، دہلی کے نامور آدمیوں، دہلی کی قدیمی معاشرت، دہلی کے پرانے احساسات کا اتنا بڑا تاریخی ذخیرہ حاصل ہوتا ہے کہ جو کسی غدر دہلی کی تاریخ میں نہیں ملے گا۔

ایک بات نہایت ہی اہم اس روزنامچہ سے ظاہر ہوگی اور وہ یہ ہے کہ غدر کی تاریخ لکھنے والے عموماً یا تو انگریز تھے اور یا انگریزوں کے زیر اثر مورخ اس واسطے اُس میں واقعات کا ایک ہی رُخ دکھایا گیا ہے۔ مگر غالب کے روزنامچہ سے تصویر کا دوسرا اور بہت ہی پوشیدہ رخ بھی ظاہر ہو جائے گا اور مورخوں کو اس سے بہت مدد ملے گی۔

یہ روزنامچہ کہاں سے آیا:

لوگوں کو حیرت ہوگی کہ غالب کا یہ روزنامچہ کہاں سے آ گیا۔ پہلے تو کبھی اس کا ذکر بھی نہیں سنا تھا۔ اس واسطے میں اس حقیقت کو بیان کو دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ غالب نے غدر کا کوئی خاص روزنامچہ نہیں لکھا تھا۔ نہ غالباً ان کو روزنامچہ لکھنے کی عادت تھی میں نے یہ روزنامچہ خود تصنیف کیا ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ اس تصنیف میں ایک حروف بھی میرا نہیں ہے اور سب غالب کے قلم سے نکلا ہوا ہے۔

اس معمہ اور چیستان کا حل یہ ہے کہ غالب کے خطوط میں جہاں جہاں غدر کا ذکر ضمناً آیا تھا میں نے پوری تلاش و محنت سے اس کو الگ کر لیا۔ اور ایسے طریقے سے چھانٹا کہ روزنامچہ کی عبارت معلوم ہونے لگی۔ بس میرا کمال اسی قدر ہے کہ میں نے بغیر بیشی الفاظ کے خطوط کو روزنامچہ بنا دیا اور کوئی شخص اس کو پڑھ کر خطوط کا شبہ نہیں کر سکتا۔

غالب کے مکتوبات مطبوعہ و غیر مطبوعہ میں غدر کی کیفیت ایسی دبی ہوئی پڑی تھی کہ کوئی شخص اس کی خوبی و اہمیت کو محسوس نہ کر سکتا تھا اور خطوں کی ذیل میں ان عبارتوں کو بھی بے توجہی سے پڑھ لیا جاتا تھا۔

میں نے اس ضرورت کو محسوس کیا کہ اردو زبان میں عذر دہلی کی یہ لاثانی تاریخ جو موتیوں سے بھی زیادہ بیش قیمت ہے۔ اس طرح دبی ہوئی نہ پڑی رہے۔ اس لیے اس کو علیحدہ کرنا شروع کیا۔ اور کہیں کہیں اپنے حاشیے بھی لکھے تا کہ آج کل کے لوگوں کو دہلی کی بعض مقامی باتوں سے واقفیت ہو جائے اور جس چیز کا مطلب سمجھ میں نہ آئے حاشیہ کی مدد سے سمجھ لیں۔

کوشش کی باوجود غالب کی تحریروں میں بعض باتیں ایسی ہیں جن کا حل میں بھی نہ کر سکا۔ دوسرے ایڈیشن کے موقع پر مزید تحقیق کی توفیق خداتعالیٰ نے دی تو اس کمی کو پورا کر دیا جائے گا۔

ایک نہایت مشکل کام:

روزنامچہ کی تیاری میں یہ پیش آیا کہ بعض مکتوبات پر غالب نے تاریخ اور سنہ لکھے ہیں اور بعض پر صرف تاریخ اور دن ہے مگر سنہ نہیں ہے۔ اور بعض پر نہ سنہ ہے اور نہ تاریخ ہے۔ اس واسطے ترتیب کا فرض ادا کرنا مشکل ہو گیا۔ کیونکہ کچھ معلوم نہیں ہو سکتا کہ پہلی عبارت کون سی ہے اور دوسری کون سی۔ ناظرین خود اپنی سمجھ سے اس مشکل کو حل کر سکتے ہیں۔

دوسری مشکل:

اس روزنامچہ میں یہ ہے کہ بعض مضامین اور واقعات مکرر بلکہ کئی کئی بار لکھے گئے ہیں۔ خصوصاً پنشن کے حالات بہت جگہ آئے ہیں۔ ان کو میں نے اس لیے قائم رکھا اور کم نہیں کیا کہ گو واقعہ ایک ہی ہے مگر طرز ادا میں ہر جگہ نئی قسم کی خوبی ہے اور غالب نے اپنے ہر مخاطب کو ایسے لطف سے کیفیت لکھی ہے کہ نیا مضمون بنا دیا ہے اور پھر کمال یہ ہے کہ واقعات میں کمی بیشی نہیں ہونے دی۔ جس سے غالب کی صدق بیانی پر پوری روشنی پڑتی ہے۔

حسن نظامی

محرم ۱۳۴۰ھ

غالب کا روزنامچہ غدر ۱۸۵۷ء

غالب کا نسب نامہ:

میں قوم کا ترک سلجوقی ہوں۔ دادا میرا ماوراء النہر سے شاہ عالم کے وقت میں ہندوستان آیا۔ سلطنت ضعیف ہو گئی تھی۔ صرف پچاس گھوڑے نقارہ نشان سے شاہ عالم کا نوکر ہوا۔ ایک پرگنہ سیر حاصل ذات کی تنخواہ اور رسالے کی تنخواہ میں پایا۔ بعد انتقال اس کے جو طوائف الملوکی کا بازار گرم تھا وہ علاقہ نہ رہا۔ باپ میرا عبداللہ بیگ خاں بہادر لکھنؤ جا کر نواب آصف الدولہ کا نوکر رہا۔ بعد چند روز حیدرآباد جا کر نواب نظام علی خاں کا نوکر ہوا۔ تین سو سوار کی جمعیت سے ملازم رہا کئی برس وہاں رہا۔ وہ نوکری ایک خانہ جنگی کے بکھیڑے میں جاتی رہی۔ والد نے گھبرا کر الور کا قصد کیا۔ راؤ راجہ بختاور سنگھ کا نوکر ہوا۔ وہاں کسی لڑائی میں مارا گیا۔ نصیر اللہ بیگ خاں میرا چچا حقیقی مرہٹوں کی طرف سے اکبر آباد کا صوبہ دار تھا۔ اس نے مجھے پالا۔ ۱۸۰۶ء میں جرنیل لیک صاحب کا عمل ہوا۔ صوبہ داری کمشنری ہو گئی اور صاحب کمشنر ایک انگریز مقرر ہوا۔ میرے چچا کو جرنیل لیک صاحب نے سواروں کی بھرتی کا حکم دیا۔ چار سو سواروں کا برگیڈ ہوا۔ ایک ہزار روپیہ ذات کا اور لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپیہ سال کی جاگیر حین حیات علاوہ سالِ بھر مرزبانی کے تھی، کہ بمرگ ناگاہ مر گیا۔ رسالہ برطرف ہو گیا۔ ملک کے عوض نقدی

مقرر ہوگئی۔ وہ اب تک پاتا ہوں۔ پانچ برس کا تھا جو باپ مر گیا۔ آٹھ برس کا تھا جو چچا مر گیا۔ ۱۸۳۰ء میں کلکتہ گیا۔ نواب گورنر جنرل سے ملنے کی درخواست کی۔ دفتر دیکھا گیا۔ میری ریاست کا حال معلوم کیا گیا۔ ملازمت ہوئی۔ سات پارچے اور جیغہ۔ سرپیچ۔ مالائے مروارید یہ تین رقم کا خلعت ملا۔ زاں بعد جب دلی میں دربار ہوا۔ مجھ کو بھی خلعت ملتا رہا بعد غدر بجرم مصاحبت بہادر شاہ دربار و خلعت دونوں بند ہو گئے۔ میری بریت کی درخواست گزری۔ تحقیقات ہوتی رہی۔ تین برس بعد چنڈ چھٹا۔ اب خلعت معمولی ملا۔

☆☆☆

یہ خلاصہ ہے غالب کے نسب نامہ اور زندگی کے بڑے بڑے واقعات کا اتنے اختصار سے اتنی بڑی لائف کا ماحصل لکھ دینا، معمولی بات نہیں ہے، یہ قدرت خدا نے غالب کے قلم کو دی تھی۔

ترک اہلِ سیف ہوتے ہیں اہلِ قلم نہیں ہوتے:

برٹش گورنمنٹ کے موجودہ متعصب اور عاقبت کے اندیشہ سے بے بہرہ وزیراعظم مسٹر لائڈ جارج نے خلافت ڈپوٹیشن ہندوستان کے اراکین سے کہا تھا کہ ترکوں کو تلوار نچانے کے سوا اور آتا ہی کیا ہے۔ ان میں کوئی قلمی بہادر پیدا نہیں ہوا اس کے جواب میں غالب وخسرو کو پیش کیا جا سکتا ہے جو دونوں دہلی درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا میں دفن ہیں کہ امیر خسرو بھی ترک لاچین تھے۔ اور غالب بھی ترک سلجوقی تھے جیسا کہ اس عبارت میں انہوں نے خود لکھا ہے۔ اب غالب وخسرو کے کمالات علمی وشعری اور فضائل فلسفہ وادراک حسِ انسانی کو دیکھنا چاہیے۔ ان کی لاجواب تصنیفات کو پڑھنا چاہیے۔ انگلش قوم کے علماء وفلاسفرز میں جو بات افرادی تھی وہ ان میں مجموعی تھی۔ یعنی انگریزوں میں ایک خاص فن کا کوئی ماہر ہوتا تھا اور اس فن کے سبب اس کی عزت ہوتی۔ اور غالب وخسرو مجموعہ کمالات تھے کہ متعدد فضائل ان کے اندر تھے۔

تو کیا ہندوستان کے یہ دو مشہور ترک ہندوستانی وفد خلافت کی طرف سے لائڈ جارج کو یہ جواب نہیں دے سکتے کہ ترک صاحب سیف بھی ہوتے ہیں اور صاحب قلم بھی۔تم کو واقفیت حاصل کیے بغیر زبان سے اتنی بڑی بات کہہ دینی مناسب نہ تھی کہ تم ساری برطانوی قوم کے قائم مقام ہو۔

☆☆☆

غالب کا حلیہ:

جب میں جیتا تھا تو میرا رنگ چمپئی تھا۔اور دیدہ ور لوگ اس کی ستائش کیا کرتے تھے۔اب جو کبھی مجھ کو اپنا وہ رنگ یاد آتا ہے تو چھاتی پر سانپ سا پھر جاتا ہے۔

جب ڈاڑھی مونچھ میں بال سفید آ گئے تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے۔اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے۔ناچار مسی بھی چھوڑ دی۔اور داڑھی بھی تاکہ اس بھونڈے شہر (دہلی) میں ایک وردی ہے عام، ملا، حافظ، بساطی، نیچہ بند، دھوبی، سقہ، بھٹیارہ، جولاہہ، کنجڑا منہ پر ڈاڑھی سر پر بال۔فقیر نے جس دن داڑھی رکھی اسی دن سر منڈایا۔

☆☆☆

اس سے معلوم ہوا جوانی میں بہت طرح دار جوان تھے۔داڑھی منڈاتے تھے اور اس وقت کے دستور کے موافق دانتوں پر مسی بھی ملتے تھے۔

☆☆☆

غالب کی ازلی طبیعت:

علم و ہنر سے عاری ہوں۔لیکن پچپن برس سے محو سخن گزاری ہوں۔مبدء فیاض کا مجھ پر احسان عظیم ہے۔ماخذ میرا صحیح اور طبع میری سلیم ہے۔فارسی کے ساتھ ایک مناسب

ازلی اور سرمدی لایا ہوں۔ مطابق اہل پارس کے منطق کا بھی مزہ ابدی لایا ہوں۔ مناسبت خداداد۔ تربیت استاد۔ حسن وقبح۔ ترکیب پہچانتے، فارسی کے غوامض جاننے لگا۔

غالب کا مجموعہ کلام:

میرا کلام کیا نظم کیا نثر۔ کیا اردو کیا فارسی۔ کبھی کسی عہد میں میرے پاس فراہم نہیں ہوا۔ دو چار دوستوں کو اس کا التزام تھا کہ وہ مسودات مجھ سے لے کر جمع کر لیا کرتے تھے۔ سوان کے لاکھوں روپے کے گھر لٹ گئے۔ جس میں ہزاروں روپے کے کتب خانے بھی گئے۔ اسی میں وہ مجموعہ ہائے پریشاں بھی غارت ہوئے۔

غدر کی نسبت غالب کی تصنیف:

میں نے آغاز یازدہم مئی ۱۸۵۷ء سے یکم جولائی ۱۸۵۸ء تک روداد شہر اور اپنی سرگزشت یعنی ۱۵ مہینے کا حال نثر میں لکھا ہے اور اسکا التزام کیا ہے کہ دساتیر کی عبارت یعنی پارسی قدیم لکھی جائے اور کوئی لفظ عربی نہ آئے۔ جو نظم اس نثر میں درج ہے۔ وہ بھی بے آمیزش لفظ عربی ہے۔ ہاں اشخاص کے نام نہیں بدلے۔

☆☆☆

یہ کتاب دستنبو کا ذکر ہے۔ آگے بھی جگہ جگہ اس کی کیفیت مذکور ہوئی ہے اور غالباً اسی کتاب کو دیکھنے کے بعد انگریزی حکام اعلیٰ کو غالب کی قدر ہوئی اور شروع بیزاری، نفرت اور حقارت اور شبہ جاتا رہا جس کا ذکر کئی جگہ آیا ہے۔ کیونکہ دستنبو دیکھنے سے پہلے گورنر اور دیگر حکام انگریزی غالب کو معمولی شاعر ار بھاٹ خیال کرتے ہوں گے اور بہادر شاہ کا سکہ کہنے کے سبب اور قلعہ میں جانے آنے کی وجہ سے ان پر پورا شبہ باغیانِ غدر سے میل جول کا ہو گا۔ مگر جب کتب دستنبو پڑھی گئی ہوگی اور اس سے غالب کی قابلیت اور غدر سے بے تعلقی ظاہر ہوئی ہوگی تب گورنر اور حکام انگریزی نے پنشن جاری کی ہوگی۔

☆☆☆

غالب چشتی نظامی تھے شیعہ نہ تھے:

میاں نصیرالدین اولاد میں سے ہیں شاہ محمد اعظم صاحب کی۔ وہ خلیفہ تھے مولوی فخرالدین صاحب کے۔ اور میں مرید ہوں اس خاندان کا۔

☆☆☆

غالب کی نسبت شہرت ہے کہ وہ اثنا عشری شیعہ تھے۔ اور مکتوبات میں انہوں نے خود بھی ایک جگہ لکھا ہے کہ میں اثنا عشری ہوں۔ مگر یہاں وہ لکھتے ہیں کہ میں مولوی فخر الدین صاحب کے خاندان کا مرید ہوں۔ جو چشتیہ نظامیہ سلسلہ کے مشہور بزرگ تھے۔ درگاہ حضرت خواجہ قطب الدین صاحب میں ان کا مزار ہے اور وہ فرزند تھے حضرت مولانا نظام الدین اورنگ آبادی کے اور غالب کے اکثر احباب اور لہارو کا خاندان بھی حضرت مولانا فخر صاحب مذکور کے سلسلہ میں مرید تھے۔ میاں کالے صاحب انہی مولانا فخر صاحب کے پوتے تھے۔ جو بہادر شاہ کے پیر سمجھے جاتے اور اسی وجہ سے ان کی املاک و جائیداد کی ضبطی ہوئی جیسا کہ غالب نے اسی روزنامچہ میں لکھا ہے۔

پس اگر غالب چشتی نظامی سلسلہ میں مرید تھے تو شیعہ کیونکر ہو سکتے تھے۔ کیونکہ شیعہ مرید نہیں ہوا کرتے۔ مگر انہوں نے خود لکھا ہے کہ میں اثنا عشری ہوں۔ اس مشکل کا حل یہ ہے کہ چشتی نظامی فقرا اور ان کے مریدین محبت اہل بیت میں بہت غلو رکھتے ہیں۔ اور بارہ اماموں سے بھی تعلق خاص رکھتے ہیں۔ اس بنا پر غالب نے اپنے آپ کو اثنا عشری یعنی بارہ ائمہ کا ماننے والا لکھا ورنہ وہ شیعہ نہ تھے۔ شیعہ ہوتے تو مرنے کے بعد علی گنج شاہ مرداں کے قبرستان میں دفن ہوتے جو صفدر جنگ کے قریب ہے اور جہاں اس وقت کے تمام شیعہ امراء دفن ہوا کرتے تھے۔ اور اب بھی ہوتے ہیں۔ سنیوں خصوصاً چشتیوں نظامیوں کے قبرستان میں دفن ہونا اور درگاہ حضرت سلطانجی صاحب میں جو نظامیہ سلسلہ کے بانی ہیں ان کی میت کا لایا جانا ظاہر کرتا ہے کہ وہ سنی تھے۔ شیعہ نہ تھے۔ ان کی قبر بھی سنی

طریقہ کی بنائی گئی ہے۔ یعنی اس پر اونچا اونٹ کے کوہان کی صورت کا خشتی تعویذ بنایا گیا ہے۔ شیعوں کی قبریں زمین کے برابر ہوتی ہیں۔ ابھرا ہوا یا اوٹ کے کوہان کی شکل کا تعویذ ان کے ہاں نہیں بنایا جاتا۔ غالب کی قبر پر تاریخ میر مجروح کی کہی ہوئی کندہ ہے۔ جو غالبؔ کے شاگرد اور شیعہ مذہب رکھتے تھے۔ وہ تاریخ یہ ہے:

کل میں غم و اندہ میں باخاطر محزوں
تھا تربت استاد پہ بیٹھا ہوا غمناک
دیکھا جو مجھے فکر میں تاریخ کی مجروحؔ
ہاتف نے کہا گنج معانی ہے تہِ خاک

۱۲۸۵ھ

☆☆☆

تباہی قلعہ کی پیشن گوئی:

مشاعرہ یہاں شہر میں کہیں نہیں ہوتا۔ قلعہ میں شہزادگانِ تیموریہ جمع ہو کر کچھ غزلخوانی کر لیتے ہیں۔ میں کبھی اس محفل میں جاتا ہوں اور کبھی نہیں جاتا۔ اور یہ صحبت خود چندروزہ ہے۔ اس کو دوام کہاں؟ کیا معلوم ہے اب کے نہ ہو اور اب کے ہو تو آئندہ نہ ہو۔

☆☆☆

یہ تحریر غدر سے پہلی کی ہے۔ لال قلعہ اور اس کے باشندوں کی نسبت جس انداز سے لکھتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شہزادوں کے اطوار اور ملک کی سیاست کے رُخ کو دیکھ کر غالب نے سمجھ لیا تھا کہ اب یہ رونق چندروز کی مہمان ہے گو غدر کی خبر غالبؔ کو نہ تھی کہ غیب کا علم نہ جانتے تھے۔ پھر بھی آثار و قرائن سے انہوں نے سمجھا لیا تھا کہ انگریز اب اس بادشاہی کھلونہ کو سامنے سے ہٹا دینا چاہتے ہیں۔ جب ہی تو انہوں نے صاف صاف لکھ دیا کہ "یہ صحبت چندروزہ ہے۔ اس کو دوام کہاں؟" اور یہ لکھ کر تو انہوں نے پیش گوئی کا کمال

ظاہر کر دیا کہ "کیا معلوم اب کے نہ ہو۔ اور اب کے ہو تو آئندہ نہ ہو۔" گویا غالب کو قلعہ کی تباہی کا اتنا یقین تھا کہ ایک دو سال کی قید بھی انہوں نے لگا دی۔

☆☆☆

اب دہلی میں کون رہتا ہے؟

کہتے ہیں دلی بڑا شہر ہے۔ ہر قسم کے آدمی وہاں بہت ہوں گے۔ مگر اب یہ وہ دلی نہیں ہے بلکہ ایک کمپ ہے۔ مسلمان اہلِ حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ۔ باقی سراسر ہنود و معزول بادشاہ کے ذکور جو بقیۃ السیف ہیں۔ وہ پانچ پانچ روپے مہینہ پاتے ہیں۔ اناث میں سے جو پیرزن ہیں۔ وہ کٹنیاں۔ اور جوانیں کسبیاں۔ امرائے اسلام میں سے اموات گنو، حسن علی خاں بہت بڑے باپ کا بیٹا سو روپے کا پنشن دار، سو روپے مہینہ کا روزینہ دار بن کر نامراد بن گیا۔ میر ناصر الدین۔ باپ کی طرف سے پیرزادہ نانا اور نانی کی طرف سے امیر زادہ مظلوم مارا گیا۔ آغا سلطان بخشی محمد علی خاں کا بیٹا جو خود بھی بخشی ہو چکا ہے۔ بیمار پڑا۔ نہ دوا نہ غذا۔ انجام کار مر گیا۔ ناظر حسین مرزا جس کا بڑا بھائی مقتولوں میں آ گیا ہے۔ اس کے پاس ایک پیسہ نہیں۔ ٹکے کی آمد نہیں۔ مکان اگرچہ رہنے کو مل گیا ہے۔ مگر دیکھیے چھٹا رہے یا ضبط ہو جائے۔ بڈھے صاحب ساری املاک بیچ کر نوش جان کر کے بیک بینی و دو گوش بھر تپور چلے گئے۔ ضیاء الدین کی پانسو روپیہ کی املاک واگزاشت ہو کر پھر قرق ہو گئی۔ تباہ خراب پھر لاہور گیا۔ وہاں پڑا ہوا ہے۔ دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ قصہ کوتاہ قلعہ اور جھجر اور بہادر گڑھ اور بلب گڑھ اور فرخ نگر کم و بیش تیس لاکھ روپیہ کی ریاستیں مٹ گئیں۔ شہر کی عمارتیں خاک میں مل گئیں۔ ہنر مند آدمی کیوں پایا جائے۔ جو حکما کا حال ہے وہ بیان واقع ہے۔

☆☆☆

جو لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ اب دہلی میں نہ صاحب اخلاق و مروت ہیں نہ علم و ہنر والے ہیں۔ نہ اُمراء ہیں، نہ شعراء ہیں۔ نہ پہلے سے علماء و فقرا نظر آتے ہیں۔ ان کو

غالب کی یہ تحریر پڑھنی چاہیے کہ غدر نے ان سب کا خاتمہ کر دیا۔ اور ایسا تباہ کیا کہ آج تک اس شہر میں وہ پہلی سی بات پیدا نہ ہو سکی۔

اب دہلی میں دہلی والے کہاں ہیں؟ پردیسی لوگ آباد ہیں۔ دہلی والے یا تو پھانسیوں پر لٹک گئے یا جلاوطن ہو گئے۔ پھر اس غریب شہر کو بدنام کرنا اور اس کو قدیمی ناموری اور شہرت کی نظر سے دیکھنا بے عقلی نہیں تو کیا ہے؟

غالبؔ نے یہ تحریر ایسے درد سے لکھی ہے کہ دل پاش پاش ہوا جاتا ہے۔ غم کا نقشہ مجسم ہو کر آنکھوں کے راستہ دل میں گھسا چلا آتا ہے۔

☆☆☆

ہندوستان غدر کے بعد:

ہندوستان کا قلمرو بے چراغ ہو گیا۔ لاکھوں مر گئے۔ جو زندہ ہیں ان میں سینکڑوں گرفتارِ بندِ بلا ہیں۔ جو زندہ ہے اس میں مقدورِ زندگی نہیں۔

اب دہلی میں ساہوکار کے سوا کوئی امیر نہیں ہے:

حسن علی خاں، نواب حامد علی خاں، حکیم احسن اللہ خاں، سوان کا یہ حال ہے کہ روٹی ہے تو کپڑا نہیں۔ لہٰذا یہاں کی اقامت میں تذبذب۔ خدا جانے کہاں جائیں۔ سوائے ساہوکاروں کے یہاں کوئی امیر نہیں ہے۔

☆☆☆

غدر کے بعد غالب نے دہلی کے مسلمان امراء کی تباہی کا جو جگہ جگہ نقشہ دکھایا ہے وہ آج تک اصلی خط و خال میں موجود ہے کہ خاندانی مسلمان امیر ایک نہیں۔ ساہوکار امیر ہزار ہیں۔ خواہ ہندو ہوں یا مسلمان۔ تجارت کا تمول نظر آتا ہے۔ حکومت کی موروثی امیری خواب و خیال ہو گئی۔

نواب فرخ میرزا کا بچپن:

پرسوں فرخ میرزا آیا اس کے ساتھ اس کا باپ بھی تھا۔ پوچھا کیوں صاحب میں تمہارا کون ہوں۔ اور تم میرے کون ہو۔ ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا۔ حضرت آپ میرے دادا اور میں آپ کا پوتا ہوں۔ پھر میں نے پوچھا کہ تمہاری تنخواہ آئی؟ کہا جناب عالی آ کا جان کی تنخواہ آ گئی ہے۔ میری نہیں آئی میں نے کہا لوہارو جائے تو تنخواہ پائے۔ کہا حضرت میں تو آ کا جان سے روز کہتا ہوں کہ لوہارو چلو اپنی حکومت چھوڑ کر دلی کی رعیب میں کیوں مل گئے۔ سبحان اللہ بالشت بھر کا لڑکا اور یہ فہم درست اور طبع سلیم۔ میں اس کی خوبی خو اور فرخی سیرت پر نظر کر کے اس کو فرخ سیر کہتا ہوں۔

☆☆☆

یہ نواب فرخ مرزا والی لوہارو کا ذکر ہے۔ جن کو برٹش گورنمنٹ سے سر کا خطاب ہے اور توپوں کی سلامی دی جاتی ہے۔ اور اعلیٰ درجے کے والیانِ ریاست کے برابر اعزاز دیا جاتا ہے۔ درمیان قد ہے۔ گورا رنگ، کٹوراسی آنکھیں۔ بڑی اور چڑھی ہوئی داڑھی۔ بال سفید ہو گئے ہیں۔ نہایت خلیق و ملنسار رئیس ہیں۔ اردو ایسی بولتے ہیں کہ آدمی بیٹھا حیرت سے منہ دیکھا کرے۔ مولانا شبلی حسرت سے کہا کرتے تھے کہ فرصت ہو تو فرخ میرزا کی باتیں سنے کہ اصل اردو ان کی باتوں میں ہے۔

غالب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ فرخ میرزا بچپن سے ہونہار تھے۔ ایک فقرہ تو اس غضب کا غالب سے کہا کہ آج کل لوگ سنیں تو متعجب ہوں۔ کیونکہ جنگ یورپ کے زمانہ میں جب نواب فرخ میرزا بصرہ گئے تو عوام نے مشہور کر دیا کہ وہ انگریزوں کی مدد کرنے گئے ہیں اور انہوں نے اسلامی حکومت کے درد کی پروا نہ کی۔ غالب کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ فرخ میرزا طفلی سے ذاتی اور اسلامی حکومت کی خوبی کو محسوس کرتے تھے

جب ہی تو انہوں نے کہا "اپنی حکومت چھوڑ کر دلی کی رعیت میں کیوں مل گئے۔"

مگر آفرین ہے فرخ میرزا کی بلاغت پر اس وقت بھی پہلو بچا کر بات منھ سے نکالی۔ دلی کی رعیت کہا انگریزی رعیت نہ کہا۔

☆☆☆

اینٹ سے اینٹ بجادی:

کل پنجشنبہ ۲۵ مئی کو اول روز پہلے بڑے زور کی آندھی آئی۔ پھر خوب مینھ برسا۔ وہ جاڑا پڑا کہ تمام کرہ شہر زمہریر ہو گیا۔ بڑے دریبہ کا دروازہ ڈھایا گیا۔ قابل عطار کے کوچہ کا بقیہ مٹایا گیا۔ کشمیری کٹڑہ کی مسجد زمین کا پیوند ہو گئی۔ سڑک کی وسعت دو چند ہو گئی۔ اللہ اللہ گنبد مسجدوں کے ڈھائے جاتے ہیں اور ہنود کی ڈیڑھیوں کی جھنڈیوں کے پرچم لہراتے ہیں۔ ایک شیر زور آور اور پلٹن بندر پیدا ہوا ہے۔ مکانات جا بجا ڈھاتا پھرتا ہے فیض اللہ خاں بنگش کی حویلی پر جو گلدستے ہیں جس کو عوام گمزی کہتے ہیں۔ ان میں سے ہلا ہلا کر ایک ایک کی بنا ڈھا دی۔ اینٹ سے اینٹ بجادی۔ واہ رے بندر یہ زیادتی اور پھر شہر کے اندر۔ ریگستان کے ملک سے ایک سردار زادہ کثیر العیال عسیر الحال عربی، فارسی، انگریزی تین زبانوں کا عالم دلی میں وارد ہوا ہے۔ بلیماروں کے محلہ میں ٹھیرا ہے۔ بحسب ضرورت حکام شہر سے مل لیا ہے۔ باقی گھر کا دروازہ بند کیے بیٹھا رہتا ہے۔ گاہ گاہ نہ ہر شام و پگاہ غالب علی شاہ کے تکیہ پر آ جاتا ہے۔

☆☆☆

تم سے گورنمنٹ کو ملاقات کبھی منظور نہیں:

غدر کے رفع ہونے اور دہلی کے فتح ہونے کے بعد میرا پنشن کھلا۔ چڑھا ہوا روپیہ دام دام ملا۔ آئندہ کو بدستور بے کم وکاست جاری ہوا۔ مگر لارڈ صاحب کا دربار اور خلعت جو معمولی ومقرری تھا مسدود ہو گیا۔ یہاں تک کہ صاحب سکرٹری بھی مجھ سے نہ ملے

اور کہلا بھیجا کہ اب گورنمنٹ کو تم سے ملاقات بھی منظور نہیں۔ میں فقیر متکبر مایوس دائمی ہو کر اپنے گھر بیٹھ رہا۔ اور حکام شہر سے بھی ملنا موقوف کر دیا۔ بڑے لارڈ صاحب کے ورود کے زمانہ میں نواب لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب بھی دلی آئے۔ دربار کیا۔ خیر کرو مجھ کو کیا ناگاہ دربار کے تیسرے دن بارہ بجے چپراسی آیا۔ اور کہا کہ نواب لفٹنٹ گورنر نے یاد کیا ہے۔ سوار ہو گیا پہلے صاحب سیکرٹر بہادر سے ملا۔ پھر نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ تصور میں کیا بلکہ تمنا میں بھی جو بات نہ تھی وہ حاصل ہوئی یعنی عنایت سے۔ اخلاق سے اخلاق۔ وقت رخصت خلعت دیا اور فرمایا کہ یہ ہم تجھ کو اپنی طرف سے ازراہ محبت دیتے ہیں۔ اور مژدہ دیتے ہیں کہ لارڈ صاحب کے دربار میں بھی تیرا نمبر اور خلعت کھل گیا۔ انبالہ دربار میں شریک ہو۔ خلعت پہن باوجود اس کے کہ حکام گورنمنٹ نے کہہ دیا تھا کہ ملاقات بھی منظور نہیں پھر بھی غالب کے استقلال اور لگاتار جدوجہد نے اس کبھی نہیں کے قلعہ کو فتح کر لیا اور ملاقاتیں ہونے لگیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ انگریزی آئین میں قطعی فیصلہ، طے شدہ اور کبھی نہیں۔ بھی بدل جاتے ہیں۔ اگر سامنے والا مسلسل جدوجہد کرتا رہے۔

مسٹر مارلے نے کہا تھا۔ تقسیم بنگال طے شدہ امر ہے۔ اس کی منسوخی محال ہے۔ مگر بنگالیوں کی کوشش نے اس کو منسوخ کرا کے چھوڑا۔

☆☆☆

غالب کی چند کتب:

پنج آہنگ کے دو چھاپے ہیں۔ ایک بادشاہی چھاپہ خانہ کا اور ایک منشی نورالدین کے چھاپہ خانہ کا۔ پہلا ناقص ہے۔ دوسرا سراسر غلط ہے۔ ضیاء الدین خاں جاگیردار لوہارو میرے سمی بھائی اور میرے شاگرد رشید ہیں۔ جو نظم و نثر میں نے کچھ لکھا وہ انہوں نے لیا اور جمع کیا۔ چنانچہ کلیات نظم فارسی چون پچپن جز و اور پنج آہنگ اور مہر نیم روز اور دیوان ریختہ

سب مل کر سو سوا سو جزو مطلّے اور مذہب اور انگریزی ابری کی جلدیں الگ الگ کوئی ڈیڑھ سو دوسو روپے کے صرف میں بنوائیں۔ میری خاطر جمع کہ کلام میرا سب ایک جا نوہم ہے۔ پھر ایک شاہزادہ نے اس مجموعہ نظم ونثر کی نقل کی۔ اب دو جگہ میرا کلام اکٹھا ہوا۔ کہاں سے یہ فتنہ برپا ہوا اور شہر لٹے۔ وہ دونوں جگہ کا کتاب خانہ خوانِ یغما ہو گیا ہر چند میں نے آدمی دوڑائے۔ کہیں سے اُن میں سے کوئی کتاب ہاتھ نہ آئی۔ وہ سب قلمی ہیں۔ جناب ہنری اسٹورٹ ریڈ صاحب کو ابھی میں خط نہیں لکھ سکتا۔ ان کی فرمائش ہے۔ اردو کی نثر انجام پائے تو اس کے ساتھ ان کو خط لکھوں۔ مگر اردو میں میں اپنے قلم کا زور کیا صرف کروں گا۔ اور اس عبارت میں معانی نازک کیونکر بھر دوں گا۔

☆☆☆

باوجود اس کسر نفسی کے غالب کی اردو میں وہ زور ہے کہ آج تک باوجود ترقی اردو کے کوئی شخص ان کا ہمسر اردو لکھنے میں پیدا نہیں ہوا۔

مقتولوں اور مجبوروں کی یاد:

غم مرگ میں قلعہ نامبارک سے قطع نظر کر کے۔ اہل شہر کو گنتا ہوں۔ مظفر الدولہ۔ میر ناصر الدین۔ مرزا عاشور بیگ میرا بھانجا اس کا بیٹا۔ احمد مرزا۔ اُنیس برس کا بچہ۔ مصطفےٰ خاں ابن اعظم الدولہ اس کے دو بیٹے ارتضےٰ خاں اور مرتضےٰ خاں۔ قاضی فیض اللہ۔ کیا میں ان کو اپنے عزیزوں کے برابر نہیں جانتا تھا۔ اے لو بھول گیا۔ حکیم رضی الدین خاں۔ میر احمد حسین میرن صاحب خدا ان کو جیتا رکھے۔ کاش یہ ہوتا کہ جہاں ہوتے وہاں خوش ہوتے گھر ان کے بے چراغ۔ وہ خود آوارہ۔ سجاد اور اکبر کے حال کا جب تصور کرتا ہوں کلیجہ ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہے۔ کہنے کو ہر کوئی ایسا کر سکتا ہے مگر میں علیؑ کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ ان اموات کے غم میں اور زندوں کے فراق میں عالم میری نظر میں تیرہ و تار ہے۔

فقیر اور ہتھیار نہ آئے:

بھائی فضلو عربسرا میں رہتے ہیں۔ پرسوں سے آئے ہوئے ہیں۔ دوڑتے پھرتے ہیں۔ عرضیاں دیتے پھرتے ہیں۔ کوئی سنتا نہیں۔ آمدورفت کا ٹکٹ موقوف ہو گیا۔ فقیر اور ہتھیار جس پاس ہو وہ نہ آئے۔ اور باقی ہندو مسلمان عورت مرد۔ سوار پیادہ جو چاہے چلا جائے چلا آئے۔ مکررات کو شہر میں رہنے نہ پائے۔ وہ شوروغل تھا کہ سڑکیں نکلیں گی۔ اور گوروں کی چھاؤنی بنے گی۔ کچھ بھی نہ ہو۔ مرپٹ کر ایک جان نثار خاں کے چھتے کی سڑک نکلی ہے۔ دلی والوں نے لکھنو کا خاکہ اڑا رکھا ہے۔ کہتے ہیں کہ لاکھوں مکان ڈھا دیے۔ اور صاف میدان کر دیا۔ میں جانتا ہوں ایسا نہ ہوگا۔

☆☆☆

امنِ عام کے بعد بھی فقیر اور ہتھیار والے کا شہر میں داخلہ سے ممنوع ہونا ظاہر کرتا ہے کہ حکام انتظامی ضرورت سے ایسا کرنے پر مجبور تھے۔ کیونکہ بغاوت کے وقت اکثر باغیوں نے فقیروں کے لباس میں دورہ کر کے غدر کی آگ بھڑکائی تھی۔

☆☆☆

امام باڑہ کا انہدام:

آغا باقر کا امام باڑہ اس سے علاوہ کہ خداوند کا عزاخانہ ہے ایک بنائے قدیم۔ رفیع مشہور۔ اس کے انہدام کا غم کس کو نہ ہوگا۔ یہاں دو سڑکیں دوڑتی ہیں۔ ایک ٹھنڈی سڑک اور ایک آہنی سڑک۔ محل ان کا الگ الگ۔ اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ گوروں کا بارک بھی شہر میں بنے گا۔ اور قلعہ کے آگے جہاں لال ڈگی ہے۔ ایک میدان نکالا جائے گا۔ محبوب کی دکانیں بھیلیوں کے گھر فیل خانہ، بلاقی بیگم کے کوچہ تک سوائے لال ڈگی اور دو چار کنوؤں کے آثار عمارت باقی نہ رہے گی۔ آج جاں نثار خاں کے چھتے کے مکان ڈھنے

شروع ہو گئے کیوں میں دلی کے ویرانہ سے خوش نہ ہوں۔ جب اہلِ شہر ہی نہ رہے۔ شہر کو کیا چولھے میں ڈالوں۔

پشم نہیں اُکھیڑ سکتا:

زباں زدِ خلق ہے کہ قدیم نوکروں سے باز پرس نہیں مشاہدہ اس کے خلاف ہے۔ اے لوکئی دن ہوئے کہ حمید خاں گرفتار آیا ہے۔ پاؤں میں بیڑیاں۔ ہاتھوں میں ہتھکڑیاں۔ حوالات میں ہے دیکھیے کہ حکم اخیر کیا ہو۔ صرف نوندے رائے کی مختار کاری پر قناعت کی گئی۔ جو کچھ ہوتا ہے وہ ہو رہے گا۔ ہر شخص کی سرنوشت کے موافق حکم ہو رہے ہیں۔ نہ کوئی قانون ہے نہ قاعدہ ہے۔ نہ نظیر کام آئے نہ تقریر پیش جائے۔ ارتضے خاں ابن مرتضے خاں کی پوری دو سو روپے کی پنشن کی منظوری کی رپورٹ گئی۔ اور ان کی دو بہنیں سو سو روپے مہینہ پانے والیوں کو حکم ہوا کہ چونکہ تمہارے بھائی مجرم تھے تمہاری پنشن ضبط۔

بطریقِ ترحم دس روپے مہینہ تم کو ملے گا۔ ترحم یہ ہے تو تغافل کیا قہر ہوگا۔ میں خود موجود ہوں اور حکام صدر کا روشناس پشم نہیں اکھیڑ سکتا۔ ۵۳ برس کا پنشن۔ تقرر اس کا تجویز لارڈ لیک و بمنظوری گورنمنٹ۔ اور پھر نہ ملا ہے نہ ملے گا خیر احتمال ہے ملنے کا۔

☆☆☆

پشم کا لفظ آج کل بے تہذیبی میں سمجھا جاتا ہے مگر اس زمانہ میں سب لکھتے اور بولتے تھے۔ غالب نے لکھا تو دستورِ عام کے سبب لکھا۔ ورنہ ان کی عادت فحش نویسی کی نہ تھی۔

☆☆☆

سب کچھ تم:

اب تو فکر یہ پڑی ہے ہوئی ہے کہ رہیے کہاں۔ اور کھائیے کیا؟ مولانا کا حال معلوم ہوا۔ مرافعہ میں حکم دوام حبس بحال رہا۔ بلکہ تاکید ہوئی کہ جلد دریائے شور کی طرف روانہ کرو۔ ان کا بیٹا ولایت میں اپیل چاہتا ہے۔ کیا ہوتا ہے جو ہونا تھا سو ہو لیا۔ انا للہ و انا

علیہ راجعون۔ وہ دہلی اردو اخبار کا پرچا اگر مل جائے تو بہت مفید مطلب ہے۔ ورنہ خیر کچھ محل خوف وخطر نہیں ہے۔ حکام صدر ایسی باتوں پر نظر نہ کریں گے۔ میں نے سکہ کہا نہیں۔ اگر کہا تو اپنی جان اور حرمت بچانے کو کہا۔ یہ گناہ نہیں۔ اور اگر گناہ بھی ہے تو کیا ایسا سنگین ہے کہ ملکہ معظمہ کا اشتہار بھی اس کو نہ مٹا سکے۔ سبحان اللہ! گولہ انداز کا بارود بنانا اور توپیں لگانی اور بنک گھر اور میگزین کا لوٹنا معارف ہو جائے اور شاعر کے دو مصرعے معاف نہ ہوں؟ ہاں صاحب گولہ کا بہنوئی مددگار ہے۔ اور شاعر کا سالہ بھی جانب دار نہیں۔

ایک لطیفہ پرسوں خوب ہوا۔ حافظ ممّوں بے گناہ ثابت ہو چکے۔ رہائی پا چکے۔ حاکم کے سامنے حاضر ہوا کرتے ہیں۔ املاک اپنی مانگتے ہیں۔ قبض وتصرف تو ان کا ثابت ہو چکا ہے۔ صرف حکم کی دیر۔ پرسوں وہ حاضر ہیں۔ مثل پیش ہوئی حاکم نے پوچھا کہ حافظ محمد بخش کون ہے؟ عرض کیا کہ میں۔ پھر پوچھا کہ حافظ ممّوں کون؟ عرض کیا کہ میں۔ اصل نام میرا محمد بخش ہے۔ ممّوں ممّوں مشہور ہوں۔ فرمایا کچھ بات نہیں۔ حافظ محمد بخش بھی تم۔ اور حافظ ممّوں بھی تم۔ سارا جہان بھی تم۔ جو دنیا میں ہے وہ بھی تم۔ ہم مکان کس کو دیں۔ مثل داخل دفتر ہوئی۔ میاں ممّوں اپنے گھر چلے آئے۔

☆☆☆

بات معمولی تھی۔ حاکم کو اس کا سمجھنا دشوار نہ تھا کہ حافظ محمد بخش نام تھا اور لوگ ممّوں کہتے تھے۔ پھر جو جائیداد نہ دی گئی تو غالباً کوئی اور وجہ ہوگی۔ ورنہ اتنی سی بات پر حقدار کو اس کے حق سے محروم کرنا سمجھ میں نہیں آتا۔

☆☆☆

احکام قضا وقدر:

سنا ہے کہ ایک محکمہ لاہور میں معاوضہ نقصانِ رعایا کے واسطے تجویز ہوا ہے۔ اور حکم

یہ ہے کہ جو رعیت کا مال کالوں نے لوٹا ہے۔ البتہ اس کا معاوضہ بحساب وہ یک سرکار سے ہو گا۔ یعنی ہزار روپے کے مانگنے والے کو سو روپے ملیں گے۔ اور جو گوروں کے وقت کی غارتگری ہے وہ ہدر اور ہجل (اس کے معنی معاف اور ناقابلِ گرفت کے ہیں) ہے۔ اس کا معاوضہ نہ ہوگا شاید یہ وہی کشتہ ہوں۔ مکانات حامد علی خاں تو مدت سے ضبط ہو کر سرکار کا مال ہو گئے۔ باغ کی صورت بدل گئی۔ محلسرا اور کوٹھی میں گورے رہتے تھے۔ اب پھاٹک اور سرتا سر دکانیں گرا دی گئیں۔ سنگ و خشت کا نیلام کر کے روپیہ داخلِ خزانہ ہوا۔ جب بادشاہ اودھ کی املاک کا وہ حال ہو تو رعیت کی املاک کو کون پوچھتا ہے۔ جو احکام کہ دلی میں صادر ہوئے ہیں وہ احکامِ قضا و قدر ہیں ان کا مرافعہ کہیں نہیں۔ گویا ہم نہ کبھی کہیں کے رئیس تھے نہ جاہ و حشم رکھتے تھے۔ نہ املاک رکھتے تھے۔

دہلی کی چنگی کے پہلے ملازم:

آج کل یہاں پنجاب احاطہ کے بہت حاکم فراہم ہیں۔ پون ٹوٹی کے باب میں کونسل ہوئی۔ پرسوں ۷ نومبر سے جاری ہوگئی سالگ رام خزانچی۔ چھنا مل مہیش داس ان تینوں شخصوں کو یہ کام بطریق امانی سپرد ہوا ہے۔ غلہ اور اُپلے کے سوا کوئی چیز ایسی نہیں کہ جس پر محصول نہ ہو۔ آبادی کا حکم عام ہے خلق کا اژدحام ہے۔ آگے حکم تھا کہ مالکانِ مکان رہیں کرایہ دار نہ رہیں۔ پرسوں سے حکم ہو گیا کہ کرایہ دار بھی رہیں۔ مگر کرایہ سرکار کو دیں۔ حکام بے پروا۔ مختار کار۔ عدیم الفرصت، میں پاشکستہ۔ محمد قلی خاں کبھی یہاں۔ کبھی وہاں وقت پر موقوف ہے۔ حکیم احسن اللہ خاں کے مکانات شہر ان کو مل گئی اور یہ حکم ہے کہ شہر سے باہر نہ جاؤ۔ دروازہ سے باہر نہ نکلو۔ اپنے گھر میں بیٹھے رہو نواب حامد علی خاں کے مکانات سب ضبط ہو گئے۔ وہ قاضی کے حوض پر کرایہ کی مکانات میں مع منکوحہ کے رہتے ہیں۔ باہر جانے کا حکم ان کو بھی نہیں۔ مرزا الٰہی بخش کو حکم کراچی بندر جانے کا ہے۔ انہوں نے زمین پکڑی ہے۔ سلطان جی میں رہتے ہیں۔ عذر کر رہے ہیں۔ دیکھیے یہ جر اٹھ

جائے یا یہ خود اٹھ جائیں۔

☆☆☆

لالہ سالگرام و چھنامل صاحب اور مہیش داس صاحب جن کا ذکر پون ٹوٹی کی ابتدائی خدمت میں آیا بعد میں بہت نامور ہوئے۔ مہیش داس کے نام سے ایک محلہ آباد ہے۔ لالہ سالگ رام و چھنامل کی اولاد و تیل کے کٹرہ میں بڑے کروفر سے رہتی ہے اور دہلی کے عظیم رئیسوں میں اس کا شمار ہے۔ اس کے افراد کی گورنمنٹ میں بڑی عزت ہے۔ خطابات ہیں۔ لاکھوں روپے سال کی آمدنی ہے۔ بہت صاف ستھرے، گورے چٹے اور قدامت کی شان کے یہ لوگ ہیں۔

☆☆☆

تصوف اور نجوم:

آرائش مضامین شعر کے واسطے کچھ تصوف کچھ نجوم لگا رکھا ہے۔ ورنہ سوائے موزونی طبع کے یہاں اور کیا رکھا ہے۔ بہر حال علم نجوم کے قاعدہ کے موافق جب زمانہ کے مزاج میں فساد کی صورتیں پیدا ہوتی ہیں تب سطح فلک پر یہ شکلیں دکھائی دیتی ہیں جس برج میں یہ نظر آئے اس کا درجہ و دقیقہ دیکھتے ہیں۔ ہزار طرح کی چال ڈالتے ہیں۔ تب ایک حکم نکالتے ہیں۔ شاہجہاں آباد میں بعد غروب آفتاب اُفق غربی شہر پر نظر آتا تھا۔ اور ان دنوں میں آفتاب اول میزان میں تھا۔ تو یہ سمجھا جاتا تھا کہ یہ صورت عقرب میں ہے۔ درجہ و دقیقہ کی حقیقت نامعلوم رہی۔ بہت دن شہر میں اس ستارہ کی دھوم رہی۔ اب وہ دس بارہ دن سے نظر نہیں آتا۔ بس میں اتنا جانتا ہوں کہ یہ صورتیں قہر الٰہی کی ہیں۔ اور دلیلیں ملک کی تباہی کی۔ قرآن النحسین پھر کسوف۔ پھر خسوف۔ پھر یہ صورت پر کدورت۔

عیاذاً باللہ پناہ بخدا۔ یہاں پہلی نومبر کو بدھ کے دن حسب الحکم حکام کوچہ و بازار میں روشنی ہوئی۔ اور شب کو کمپنی کا ٹھیکہ ٹوٹ جانا اور قلمرو ہند کا بادشاہی عمل میں آنا سنایا گیا۔

نواب گورنر جنرل لارڈ کیننگ بہادر کو ملکہ معظمہ انگلستان نے فرزندِ ارجمند خطاب دیا۔ اور اپنی طرف سے نائب اور ہندوستان کا حاکم کیا۔ میں قصیدہ پہلے ہی اس تہنیت میں لکھ چکا ہوں۔

میں نے گیارہویں مئی ۱۸۵۷ء سے اکتیسویں جولائی ۱۸۵۸ء تک روداد غدر نثر میں بعبارت فارسی ناآمیختہ بعربی لکھی ہے۔ اور وہ پندرہ سطر کے مسطر سے چھ جزو کی کتاب آگرہ کو مفید الخلائق میں چھپنے کو گئی ہے۔ دستنبو اس کا نام رکھا ہے۔ اور اس میں صرف اپنی سرگزشت اور اپنے مشاہدہ کے بیان سے کام رکھا ہے۔

دلی پر پانچ لشکروں کا حملہ:

پانچ لشکر کا حملہ پے در پے اس شہر میں ہوا۔ پہلا باغیوں کا لشکر۔ اس میں اہلِ شہر کا اعتبار لٹا۔ دوسرا لشکر خاکیوں کا۔ اس میں جان و مال و ناموس و مکان و مکین، آسمان و زمین وآثارِ ہستی سراسر لٹ گئے۔ تیسرا لشکر کال کا۔ اس میں ہزارہا آدمی بھوکے مرے۔ چوتھا لشکر ہیضہ کا۔ اس میں بہت سے پیٹ بھرے مرے۔ پانچواں لشکر تپ کا۔ اس میں تاب و طاقت نہ پائی اب تک اس لشکر نے شہر سے کوچ نہیں کیا۔ میرے گھر دو آدمی تپ میں مبتلا ہیں ایک بڑا لڑکا۔ ایک داروغہ۔ خدا ان دونوں کو جلد صحت دے۔

مغل خاں غدر سے کچھ دن پہلے مستسقی ہو کر مر گئے۔ ہے ہے۔ کیونکر لکھوں۔ حکیم رضی الدین خاں کو قتلِ عام میں ایک خاکی نے گولی مار دی۔ اور احمد حسین خاں ان کے چھوٹے بھائی اسی دن مارے گئے۔ طالع یار خاں کے دونوں بیٹے ٹونک سے رخصت لے کر آئے تھے۔ غدر کے سبب جانہ سکے۔ یہیں رہے۔ بعد فتح دہلی دونوں بے گناہوں کو پھانسی ملی۔ طالع یار خاں ٹونک میں ہیں۔ زندہ ہیں پر یقین ہے مردہ سے بدتر ہوں گے۔ میر چھوٹم نے بھی پھانسی پائی۔ حال صاحبزادہ میاں نظام الدین کا یہ ہے کہ جہاں سب اکابر

شہر کے بھاگے تھے وہاں وہ بھی بھاگ گئے تھے۔ بڑودہ میں رہے۔ اورنگ آباد میں رہے حیدرآباد میں رہے۔ سال گزشتہ یعنی جاڑوں میں یہاں آئے۔ سرکار سے ان کی صفائی ہوگئی لیکن صرف جان بخشی۔ روشن الدولہ کا مدرسہ جو عقب کوتوالی چبوترہ ہے وہ اور خواجہ قاسم کی حویلی جس میں مغل علی خان مرحوم رہتے تھے وہ اور خواجہ صاحب کی حویلی یہ املاک خاص حضرت کالے صاحب کی اور کالے صاحب کے بعد میاں نظام الدین کی قرار پا کر ضبط ہوئی۔ اور نیلام ہو کر روپیہ سرکار میں داخل ہو گیا۔ ہاں قاسم جان کی حویلی جس کے کاغذ میاں نظام کی والدہ کے نام کے ہیں وہ ان کو یعنی میاں نظام الدین کی والدہ کو مل گئی۔ فی الحال میاں نظام الدین پاک پٹن گئے ہیں۔ شاید بھاول پور بھی جائیں گے۔

☆☆☆

غدر کے بعد جب انگریز پنجاب سے فوج لے کر دہلی پر چڑھے تو ان کی فوج کی وردی خاکی تھی۔ اس واسطے شہر میں خاکی کا لفظ ایک اصطلاح بن گیا تھا۔ خاکی کا ذکر درحقیقت انگریز کا ذکر سمجھا جاتا تھا۔

میاں نظام الدین صاحب میاں کالے صاحب کے فرزند تھے۔ ان کی جائیداد اورنگ آباد دکن میں بھی ہے۔ میاں صیف الدین وغیرہ اس پر قابض ہیں۔ چالیس ہزار سالانہ کی آمدنی ہے۔ میاں عبدالصمد صاحب دہلوی نے جو میاں نظام الدین صاحب کے نواسہ ہیں اس جاگیر کا دعویٰ کیا ہے اور آج کل حیدرآباد میں اس کا مقدمہ چل رہا ہے۔

☆☆☆

غدر نہیں خدا کا قہر:

غلہ کی گرانی، آفت آسمانی، امراض و موتی بلائے جانی۔ انواع و اقسام کے اوہام و شبور شائع چارہ ناسودمند و سعی ضائع۔ میں نہیں جانتا کہ ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو پھر دن چڑھے وہ

فوج باغی میرٹھ سے دلی آئی تھی یا خود قہر الٰہی کا پے در پے نزول ہوا تھا۔ بقدر خصوصیت سابق دلی ممتاز ہے۔ ورنہ سر تا سر قلمرو ہند میں فتنہ و بلا کا دروازہ بار ہے۔ اناللہ

لوٹ کی کتابیں کھتریوں میں:

کتاب کوئی سی ہو اس کا پتہ کیونکر لگے۔ لوٹ کا مال کھتریوں میں بک گیا۔ اور اگر سڑک پر بکا تو میں کہاں جو دیکھوں:

بردل نفس اندوہ گیتی بسر آرید
گیرید کہ گیتی ہمہ یکسر بسر آمد

یہاں کا قصہ مختصر یہ ہے کہ قصہ تمام ہوا۔

غدر کے بعد ایک چھوٹا سا فساد:

دلی کا حال تو یہ ہے:

گھر میں تھا کیا جو ترا غم اُسے غارت کرتا
وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرت تعمیر سو ہے

یہاں دھرا کیا ہے جو کوئی لوٹے گا۔ چند روز گوروں نے اہل بازار کو ستایا تھا۔ اہل قلم اور اہل فوج نے باتفاق رائے ہمہ گیر ایسا بندوبست کیا کہ وہ فساد مٹ گیا۔ اب امن وامان ہے۔

میاں کالے صاحب کی خانہ ویرانیاں:

حضرت شیخ کا کلام اور صاحبزادہ شاہ قطب الدین ابن مولانا فخر الدین کا بھلا حال؟ ایں دفتر را گاؤ خورد و گاؤ را قصاب برد و قصاب در راہ مرد۔ بادشاہ کے دم تک یہ باتیں تھیں۔ خود میاں کالے صاحب کا گھر اس طرح تباہ ہوا کہ جیسے جھاڑو دی۔ کاغذ کا پرزا سونے کا تار، پشمینہ کا بال باقی نہ رہا۔ شیخ کلیم اللہ جہان آبادی رحمۃ اللہ علیہ کا مقبرہ اُجڑ

گیا۔ کیا ایک اچھے گاؤں کی آبادی تھی۔ ان کی اولاد کے لوگ تمام اس موضع میں سکونت پذیر تھے۔ اب ایک جنگل ہے۔ اور میدان میں قبر۔ اس کے سوا کچھ نہیں وہاں کے رہنے والے اگر کوئی سے بچے ہوں گے تو خدا ہی جانتا ہوگا کہ کہاں ہیں۔ ان کے پاس شیخ کا کلام بھی تھا۔ کچھ تبرکات بھی تھے۔ اب جب یہ لوگ ہی نہیں تو کس سے پوچھوں کیا کروں۔ کہیں سے یہ مدعا حاصل نہ ہو سکے گا۔

☆☆☆

حضرت شیخ کلیم اللہ جہان آبادی کا مزار پریڈ کے میدان میں جامع مسجد کے شرق کی طرف دو سو قدم کے فاصلہ پر میدان میں واقع ہے۔ پہلے چونہ کا چبوترہ تھا اب سید عبدالغنی کلیمی سجادہ نشین کی سعی سے سنگ مرمر کی سلیں فرش میں لگائی گئی ہیں۔ یہ علاقہ اب تک فوجی قبضہ میں ہے اور یہاں سایہ کی جگہ بنانے کا حکم نہیں ہے۔ نمازی اور زائر نماز و زیارت کے وقت دھوپ کی تکلیف اٹھاتے ہیں۔ پہلے یہاں بڑی بڑی عمارتیں تھیں۔ حضرت شیخ کلیم اللہ سلسلہ چشتیہ نظامیہ کے بڑے نامور اور صاحب تصنیف بزرگ گزرے ہیں۔ تفسیر کلیمی، مرقع، کشکول کلیمی، عشرہ کاملہ، مالا بدنی التصوف، مکتوبات کلیمی وغیرہ ان کی یادگار کتابیں ہیں۔ حضرت شیخ یحیٰی مدنی چشتی کے خلیفہ تھے۔ اور حضرت نظام الدین اورنگ آبادی انہی کے خلیفہ اورنگ آباد میں مدفون ہیں۔

میاں کالے صاحب کا نام میاں نصیر الدین تھا۔ جو میاں قطب الدین صاحب کے بیٹے اور حضرت مولانا فخر الدین صاحب کے پوتے تھے۔ بہادر شاہ ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ کیونکہ ان کے والد کے مرید اور دادا کے منظور نظر تھے۔ ملکہ بیگم ایک شہزادی سے انہوں نے نکاح بھی کیا تھا۔ قاسم جان کی گلی میں حکیم اجمل خاں صاحب کے محلّہ سے غرب کی طرف کالے صاحب کی حویلی مشہور ہے۔ جس میں آج کل پنجابی تاجر دہلی کے رہتے ہیں۔ اور جائیداد کا ذکر غالب نے کیا ہے۔ اب ان کے نواسہ میاں عبدالصمد

صاحب پنڈت کے کوچہ میں رہتے ہیں۔اور دہلی کے فقراء میں مشہور درویش ہیں۔

☆☆☆

دہلی کے مفتی اعظم کی بیچارگی:

جناب مولوی صدر الدین صاحب بہت دن حوالات میں رہے۔کوٹ میں مقدمہ پیش ہوا۔روبکاریاں ہوئیں۔آخر صاحبانِ کورٹ نے جان بخشی کا حکم دیا۔نوکری موقوف جائیداد ضبط۔ناچار خستہ و تباہ لاہور گئے فنانشل کمشنر اور لفٹنٹ گورنر نے ازراہِ ترحم نصف جائیداد واگزاشت کی۔اب نصف جائیداد پر قابض ہیں۔اپنی حویلی میں رہتے ہیں۔کرایہ پر معاش کا مدار ہے۔اگرچہ یہ امداد ان کے گزارے کو کافی ہے کس واسطے کہ ایک آپ اور ایک بی بی تیس چالیس روپیہ کی آمد لیکن چونکہ امام بخش چپراسی کی اولاد ان کی سرت ہے اور وہ دس بارہ آدمی ہیں۔لہٰذا فراغ بالی سے نہیں گزرتی۔ضعف پیری نے بہت گھیر لیا ہے۔عشرہ ثامنہ کے اواخر میں ہیں۔خدا سلامت رکھے۔بہت غنیمت ہیں۔

☆☆☆

مفتی صدر الدین صاحب صدر الصدور دہلی کے اکابر علما و شرفا میں تھے۔حویلی صدر الصدور کا تختہ بھی میونسپل کمیٹی کی طرف سے لکھا ہوا ایک دیوار پر نظر آتا ہے۔اور جاننے والے کو رلاتا ہے۔مٹیا محل کے سامنے ان کا مکان تھا۔جس میں خان بہادر غلام محمد حسن خاں رجسٹرار مرحوم کی سکونت تھی۔اور اب ان کی اولاد رہتی ہے۔

اللہ اللہ مسلمانوں کی غربا پروری کس شان کی تھی کہ مٹنے اور مٹائے جانے کے بعد بھی جبکہ نوے برس کے قریب عمر تھی اور صرف چالیس روپے مہینہ گزر اوقات کے لیے باقی بچا تھا۔مگر اپنے چپراسی کے کنبہ کو پالتے تھے۔

گردش ایام کا قیدی لفافہ بناتا تھا:

اللہ اللہ! یہ دن بھی یاد رہیں گے مجھ کو اکثر اوقات لفافے بنانے میں گزرتے تھے۔ اگر خط نہ لکھوں گا تو لفافے بناؤں گا۔ غنیمت ہے کہ محصول آدھ آنہ ہے ورنہ مزہ معلوم ہوتا۔

بقیہ السیف کا فکر:

بعد قتل ہونے دس آدمی کے کہ دو اس میں عزیز بھی تھے۔ یہ سب وہاں سے نکالے گئے۔ مگر صورت نہیں معلوم کہ کیونکر نکلے۔ پیادہ یا سوار تھے۔ تنگدست یا مالدار۔ مستورات کو تو تھیں دیدی تھیں۔ ذکور کا حال کیا ہوا۔ اور پھر وہاں سے نکلنے کے بعد کیا ہوا۔ کہاں رہے اور کہاں رہیں گے۔ سرکار انگریزی کی طرف سے مورد تفقد و ترحم ہیں یا نہیں۔ رنگ کیا نظر آتا ہے۔ جبر کسر کی توقع ہے یا نہیں۔ یہ سب اللہ کو معلوم ہے۔

☆☆☆

اب کوئی دوست میرے سامنے نہ مرے:

یا اللہ اب احباب میں سے کوئی میرے سامنے نہ مرے۔ کیا معنی کہ جو میں مروں کوئی میرا یاد کرنے والا اور مجھ پر رونے والا بھی تو دنیا میں ہو۔ مصطفےٰ خاں خدا کرے مرافعہ میں چھوٹ جائے ورنہ حبس ہفت سالہ کی تاب اس ناز پروردہ میں کہاں۔ احمد حسین میکش مخنوق ہوا۔ (پھانسی ہوئی) گویا اس نام کا آدمی شہر میں تھا ہی نہیں۔ پنشن کی درخواست دے رکھی ہے۔ بشرط اجرا بھی میرا کیا گزارہ ہوگا۔ ہاں دو باتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ میری صفائی اور بے گناہی کی دلیل ہے۔ دوسرے یہ کہ موافق قول عوام چولہے کا دلدر نہ ہوگا۔

☆☆☆

نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ بے نظیر شاعر اور خاندانی امیر تھے۔ نواب محمد اسحٰق خاں

مرحوم سابق سیکریٹری علی گڑھ کالج ان کے صاحبزادے تھے جنہوں نے ان کے کلام کا مجموعہ چھاپا ہے۔اور جو "خواجہ ڈپو دہلی" میں بکتا ہے۔اس میں غدر کے حالات بھی ہیں اور رہائی کا تذکرہ بھی ہے۔

نواب مصطفیٰ خاں اور ان کے لڑکے نواب محمد اسحٰق خاں اپنے خاندان سمیت درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء میں دفن ہیں۔درگاہ کی بڑی مسجد کے گوشہ شمال اور سماع خانہ کے غرب میں یہ قبرستان واقع ہے۔کتبے لگے ہوئے ہیں۔

☆☆☆

جب شراب پر پہرہ لگا:

یہاں کا حال: زمیں سخت ہے آسماں دور ہے، جاڑا خوب پڑ رہا ہے۔تونگر غرور سے، مفلس سردی سے اکڑ رہا ہے۔آبکاری کے بندوبست جدید نے مارا۔عرق کے نہ کھینچنے کی قید شدید نے مارا۔ادھر انسداد دروازۂ آبکاری ہے۔اُدھر ولایتی عرق کی قیمت بھاری ہے۔انا اللہ وانا الیہ راجعون۔مولوی فضلِ رسول صاحب حیدرآباد گئے ہیں۔مولوی غلام امام شہید آگے سے وہاں ہیں۔محی الدولہ محمد یار خان سورتی نے ان صورتوں کو وہاں بلایا ہے۔پر یہ نہ معلوم کہ وہاں ان کو کیا پیش آیا ہے۔

دوستوں سے ملنے میں بھی دشواری تھی:

حکیم صاحب پر سے وہ سپاہی جوان پر متعین تھا، اُٹھ گیا۔اور ان کو حکم ہو گیا کہ اپنی وضع پر رہو۔مگر شہر میں رہو باہر جانے کا اگر قصد کرو تو پوچھ کر جاؤ۔اور ہر ہفتہ میں ایک بار کچہری میں حاضر ہوا کرو۔چنانچہ وہ کچے باغ کے پچھواڑے مرزا جاگن کے مکان میں آ رہے۔صفدر میرے پاس آیا تھا یہ اس کی زبانی ہے۔جی ان کے دیکھنے کو چاہتا ہے مگر از راہِ احتیاط جا نہیں سکتا۔مرزا بہادر بیگ نے بھی رہائی پائی۔اب اس وقت سُنا ہے کہ وہ

خانصاحب کے پاس آئے ہیں یقین ہے کہ بعد ملاقات باہر چلے جائیں گے۔ یہاں نہ رہیں گے۔

مٹنے والوں کے گھروں میں کون رہتا تھا:

قاسم جان کی گلی میر خیراتی کے پھاٹک سے فتح اللہ بیگ خاں کے پھاٹک تک بے چراغ ہے۔ ہاں اگر آباد ہے تو یہ ہے کہ غلام حسن خاں کی حویلی ہسپتال ہے۔ اور ضیاء الدین خاں کے کمرے میں ڈاکٹر صاحب رہتے ہیں۔ اور کالے صاحب کے مکانوں میں اور ایک صاحب عالیشان انگلستان تشریف رکھتے ہیں۔ ضیاء الدین خاں اور ان کے بھائی مع قبائل اور عشائر لوہارو ہیں۔ لال کنوئیں کے محلہ میں خاک اڑتی ہے۔ آدمی کا نام نہیں۔ بھتی کی دکھان میں کتے لوٹتے ہیں۔

مجھے عوام کے نقشہ میں نہ لکھ:

روز اس شہر میں اک حکم نیا ہوتا ہے
کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا ہوتا ہے

میرٹھ سے آ کر دیکھا کہ یہاں بڑی شدت ہے۔ اور یہ حالت ہے کہ گوروں کی پاسبانی پر قناعت نہیں ہے۔ لاہوری دروازہ کا تھانہ دار مونڈھا بچھا کر سڑک پر بیٹھتا ہے جو باہر کے گورے کی آنکھ بچا کر آتا ہے اس کو پکڑ کر حوالات میں بھیج دیتا ہے۔ حاکم کے ہاں پانچ پانچ بید لگتے ہیں۔ یا دو دو روپیہ جرمانہ لیا جاتا ہے۔ آٹھ دن قید رہتا ہے۔ اس سے علاوہ سب تھانوں پر حکم ہے کہ دریافت کرو کون بے ٹکٹ مقیم ہے اور کون ٹکٹ رکھتا ہے۔ تھانوں میں نقشے مرتب ہونے لگے۔ یہاں کا جمعدار میرے پاس بھی آیا۔ میں نے کہا بھائی! تو مجھے نقشے میں نہ رکھ۔ میری کیفیت کی عبارت الگ لکھ۔ عبارت یہ ہے کہ اسد اللہ خاں پنشن دار ۱۸۵۰ء سے حکیم پٹیالے والے کے بھائی کی حویلی میں رہتا ہے۔ نہ کالوں

کے وقت میں کبھی گیا اور نہ گوروں کے زمانے میں نکلا۔ اور نکالا گیا۔ کرنیل برون صاحب بہادر کے زبانی حکم پر اس کی اقامت کا مدار ہے۔ اب تک کسی حاکم نے وہ حکم نہیں بدلا۔ اب حاکم وقت کو اختیار ہے۔ پرسوں یہ عبارت جمعدار نے نقشہ کے ساتھ کوتوالی میں بھیج دی ہے۔ کل سے یہ حکم نکلا کہ یہ لوگ شہر سے باہر مکان دکان کیوں بناتے ہیں۔ جو مکان بن چکے ہیں انہیں ڈھا دو۔ اور آئندہ کو ممانعت کا حکم سنا دو۔ اور یہ بھی مشہور ہے کہ پانچ ہزار ٹکٹ چھاپے گئے ہیں۔ جو مسلمان شہر میں اقامت چاہے بقدر مقدور نذرانہ دے۔ اس کا اندازہ مقرر کرنا حاکم کی رائے پر ہے روپیہ دے اور ٹکٹ لے۔ گھر برباد ہو جائے، آپ شہر میں آباد ہو جائیں آج تک یہ صورت ہے۔ دیکھیے شہر کے بسنے کی کون مہورت ہے۔ جو رہتے ہیں وہ بھی اخراج کیے جاتے ہیں۔ یا جو باہر پڑے ہیں وہ شہر میں آتے ہیں الملک للہ والحکم للہ۔

☆☆☆

کیسی بیکسی میں وہ لوگ تھے جنہوں نے غدر کے بعد کا یہ دم گھونٹنے والا تماشہ دیکھا۔ اور کیسے نادان ہم لوگ ہیں کہ پھر بے امنی کی تمنائیں کرتے ہیں۔ انسان متلون مزاج اور جلدی بھول جانے والا واقع ہوا ہے۔ امن کی برابر دنیا میں کوئی چیز اچھی نہیں ہے۔

☆☆☆

سوسائٹی کی بربادی کا ماتم:

اس چرخ کج رفتار کا برا ہو۔ ہم نے اس کا کیا بگاڑا تھا۔ ملک و مال۔ جاہ و جلال کچھ نہیں رکھتے تھے۔ ایک گوشہ و توشہ تھا۔ چند مفلس و بےنوا ایک جگہ فراہم ہو کر کچھ ہنس بول لیتے تھے:

سو بھی نہ تو کوئی دم دیکھ سکا اے فلک
اور تو یہاں کچھ نہ تھا ایک مگر دیکھنا

یہ شعر خواجہ میر درد کا ہے۔کل سے مجھ کو میکش بہت یاد آتا ہے۔ وہ صحبتیں اور تقریریں۔ آنسوؤں سے پیاس نہیں بجھتی۔ یہ تحریر تلافی اس تقریر کا نہیں کر سکتی۔

☆☆☆

میکش کے پھانسی پانے کے بعد عالم غم والم میں یہ تحریر لکھی گئی ہے۔ہائے کتنا درد حروف کے کلیجہ میں بھرا ہے۔ پڑھ کر کلیجہ منہ کو آتا ہے۔

☆☆☆

دہلی سے انتہائی محبت اس کے اجڑنے کی خاک بھی آنکھوں میں:

آنکھوں کے غبار کی وجہ یہ ہے جو مکان دلی میں ڈھائے گئے اور جہاں جہاں سڑکیں نکلیں۔ جتنی گرد اڑی اس سب کو از راہ محبت اپنی آنکھوں میں جگہ دی۔

☆☆☆

دہلی سے محبت کرنے کی یہ انتہائی مثال غالب نے لکھی ہے۔ کہ آنکھیں دکھنے آئیں تو اس کا سبب یہ قرار دیا کہ دہلی کے مکان اُجاڑے گئے اور ان کے مٹنے سے خاک اُڑی تو اس کو آنکھوں میں بٹھالیا۔ گو اس کے اثر سے آنکھیں دکھنے لگیں۔

اپنے وطن سے محبت اس طرح کیا کرتے ہیں۔ کوئی آج کل کے محبان وطن کو غالب کے یہ چند لفظ سنا دے۔

☆☆☆

غالب کو کنوؤں کا غم:

اب اہل دہلی ہندو ہیں یا اہل حرفہ ہیں۔ یا خاکی ہیں یا پنجابی ہیں۔ یا گورے ہیں۔ لکھنو کی آبادی میں کچھ فرق نہیں آیا۔ ریاست تو جاتی رہی۔ باقی ہر فن کے کامل لوگ

موجود ہیں۔ خس کی ٹٹی، پڑ واہوا۔ اب کہاں؟ لطف تو وہ اُسی مکان میں تھا۔ اب میر خیراتی کی حویلی میں وہ چھت اور سمت بدلی ہوئی ہے۔ بہر حال میگزرد۔ مصیبت عظیم یہ ہے کہ قاری کا کنواں بند ہو گیا۔ لال ڈگی کے کنوئیں یک قلم کھاری ہو گئے۔ خیر کھاری ہی پانی پیتے۔ گرم پانی نکلتا ہے پرسوں میں سوار ہو کر کنوؤں کا حال دریات کرنے گیا تھا۔ مسجد جامع سے راجگھاٹ دروازہ تک بے مبالغہ ایک صحرا لق ودق ہے۔ اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں وہ اگر اٹھ جائیں تو ہوا کا امکان ہو جائے۔ مرزا گوہر کے باغیچہ کے اس جانب کوئی بانس نشیب تھا۔ اب وہ باغچہ کے صحن کے برابر ہو گیا۔ یہاں تک کہ راجگھاٹ کا دروازہ بند ہو گیا۔ فصیل کے کنگورے کھلے رہتے ہیں۔ باقی سب ڈٹ گیا۔ آہنی سڑک کے واسطے کلکتہ دروازہ سے کابلی دروازہ تک میدان ہو گیا۔ پنجابی کٹرہ، دھوبی واڑہ، رامجی گنج سعادت خان کا کٹرہ۔ جرنیل کی بی بی کی حویلی۔ رامجی داس گودام والے کے مکانات۔ صاحب رام کا باغ۔ حویلی۔ ان میں سے کسی کا پتہ نہیں ملتا۔ قصہ مختصر شہر صحرا ہو گیا تھا۔ اب جو کنوئیں جاتے رہے اور پانی گوہر نایاب ہو گیا تو یہ صحرا صحرائے کربلا ہو جائے گا۔ اللہ اللہ دلی والے اب تک یہاں کی زبان کو اچھا کہے جاتے ہیں۔ واہ رے حسن اعتقاد اردو بازار نہ رہا۔ اردو کہاں۔ دلی کہاں۔ واللہ اب شہر نہیں ہے کیمپ ہے۔ چھاؤنی ہے۔ نہ قلعہ، نہ شہر، نہ بازار۔ نہ نہر۔

☆☆☆

اس عبارت میں غالب نے دہلی کی ان شاندار عمارات کی بربادی کا نقشہ کھینچا ہے جن میں سے اکثر کے نام بھی اب دہلی والے واقف نہیں۔ اور میں بھی نہیں بتا سکتا کہ وہ کہاں تھیں۔

معلوم ہوتا ہے غالب کو سب سے زیادہ کنوؤں کے بند کر دینے کا صدمہ ہے۔ وہ یہ سن کر کہ کنوئیں بند کیے جا رہے ہیں خود گھر سے نکلتا کہ اپنی آنکھ سے دیکھیں۔ حالانکہ ان کا گھر سے نکلنا آجکل کی طرح کوئی معمولی بات نہ تھی۔ مشرق والے خصوصاً ہندوستان اور

دہلی والے کنوؤں کے پانی کو بہت پسند کرتے ہیں۔ اور ان کونلوں کے پانی سے کسی قسم کی محبت نہیں ہے۔ حضرت اکبرالہ آبادی (مرحوم) بھی ایک جگہ لکھتے ہیں:

حرف پڑھنا پڑا ہے ٹائپ کا
پانی پینا پڑا ہے پائپ کا
پیٹ چلتا ہے آنکھ آئی ہے
شاہ ایڈورڈ کی دہائی ہے

انگریزوں نے حفظِ صحت کے خیال سے کنوئیں بند کیے تھے کہ ان کا پانی جلد خراب ہو جاتا ہے۔ مگر اہلِ مشرق اپنی پرانی عادت کے خلاف کسی مصلحت کو قبول کرنا نہیں چاہتے۔

تحریر کے شروع میں غالب نے دہلی کی آبادی کے بارے میں سچ لکھا ہے کہ غدر کے بعد ایسی جماعتیں وہاں آ کر آباد ہو گئی تھیں جن کو زبان اور تہذیب و علم سے کچھ سروکار نہ تھا۔ اس لیے آج کل دہلی کی بگڑی ہوئی زبان پر اعتراض کرنا بھی فضول ہے کہ یہ زبان اہلِ دہلی کی نہیں ہے وہ تو پھانسی پا گئے اور جو لوگ یہ زبان بولتے ہیں وہ دہلی والے نہیں ہیں۔ پردیسی ہیں۔

☆☆☆

دہلی کی بہاروں کا فشار اور غالب کی آہِ شرر بار:

دہلی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر ہے۔ قلعہ، چاندنی چوک، ہر روز مجمع بازار مسجد جامع کا ہر ہفتہ سیر جمنا کے پل کی۔ ہر سال میلہ پھول والوں کا۔ یہ پانچوں باتیں اب نہیں۔ پھر کہو دلی کہاں۔ ہاں کوئی شہر قلمرو ہند میں اس نام کا تھا۔ نواب گورنر جنرل بہادر ۱۵ دسمبر کو یہاں داخل ہوں گے۔ دیکھیے کہاں اترتے ہیں اور کیونکر دربار کرتے ہیں۔ آگے کے درباروں میں اتنے جاگیردار تھے کہ ان کا الگ الگ دربار ہوتا تھا۔ جھجر، بہادر گڑھ، بلب گڑھ، فرخ نگر۔ دوجانہ، پاٹودی، لوہارو۔ چار معدوم محض ہیں۔ جو باقی رہے اس میں سے

دوجانہ ولوہارو تحت حکومت ہانسی حصار پاٹودی حاضر۔ اگر ہانسی حصار کے صاحب کمشنر بہادر ان دونوں کو یہاں لے آئے تو تین رئیس ورنہ ایک رئیس۔ دربار عام والے مہاجن لوگ سب موجود۔ اہل اسلام میں سے صرف تین آدمی باقی ہیں۔ میرٹھ میں مصطفےٰ خاں سلطان جی میں مولوی صدرالدین خاں، بلی ماروں میں سگ دنیا موسوم اس تینوں مردود مطرود محروم ومغموم:

توڑ بیٹھے جبکہ ہم جام و سبو پھر ہم کو کیا
آسماں سے بادۂ گلفام گر برسا کرے

جان نثار خاں کے چھتے کا ڈھنا۔ خان چند کے کوچہ کا سڑک بننا۔ بلاقی بیگم کے کوچہ کا مسمار ہونا۔ جامع مسجد کے گرد ستر ستر گز میدان نکلنا۔ اور غالب افسردہ دل۔

☆☆☆

دہلی کی پانچ بہاروں کا کس درد سے ذکر کرتے ہیں۔ چاندنی چوک کی وہ رونق جاتی رہی۔ قلعہ میں گورے آباد ہوگئے۔ جمنا کے پل کی سیر کا اب کسی کو خیال بھی نہیں آتا۔ پہلے وہاں آٹھویں دن میلہ لگتا تھا۔ جامع مسجد کے سامنے شام کو اب بھی بازار لگتا ہے۔ مگر پہلی سی بہار نہیں ہے۔ پھول والوں کی سیر اب بھی سال بسال ہوتی ہے لیکن اگلی سی آن بان کہاں۔

جھجر والے نواب اور بلب گڑھ کے راجہ نے غدر کے بعد دہلی میں پھانسی پائی۔ جھجر ضلع رہتک میں شامل ہوا۔ اور بہادر گڑھ بھی۔ اور بلب گڑھ ضلع گڑگانوہ کو دے دیا گیا۔

یہ عبارت غالباً ۱۸۵۸ء کے آخر میں لکھی گئی ہے۔ کیونکہ گورنر نے میرٹھ میں دربار دسمبر ۱۸۵۸ء میں کیا تھا جس کا ذکر غالب نے کیا ہے۔

آخر کی عبارت اس قدر دردناک ہے کہ پتھر کا کلیجہ رکھنے والا بھی بے اختیار رو دے گا۔ خبر نہیں غالب کے دل پر کیا کیا اثر یہ انقلابات پیدا کرتے ہوں گے۔ جب ہی تو ان کے قلم سے یہ مجروح کرنے والے الفاظ نکلے۔

☆☆☆

برٹش طرز حکومت پر چوٹ:

سنتے ہیں کہ نومبر میں مہاراجہ کو اختیار ملے گا مگر وہ اختیار ایسا ہوگا جیسے خدا نے خلق کو دیا ہے۔ سب کچھ اپنے قبضۂ قدرت میں رکھا۔ آدمی کو بدنام کیا ہے۔

☆☆☆

یہاں مہاراجہ الور کے اختیار کا ذکر کرتے ہیں۔ مگر برطانوی آئین سلطنت پر ایک پُرلطف ضرب بھی لگاتے ہیں۔ کہ وہ والیانِ ریاست کو ایسا اختیار دیتا ہے کہ جیسا خدا نے بندوں کو اختیار دے دیا کہ مجبور بھی ہیں اور مختار بھی۔

غالب نے اس وقت یہ عبارت لکھی کہ مشرقی آئین سلطنت لوگوں کے دل و دماغ پر مسلط تھے اور خلقت انہی کو اچھا سمجھتی تھی۔ آج وہ زندہ ہوتے تو مان جاتے کہ پرانا دستور امن کے لیے اتنا مفید نہ تھا جتنا نیا آئین ثابت ہوا۔ والیانِ ریاست کو مطلق العنان کر دینے کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ وہ ہمیشہ بغاوتیں کرتے رہتے تھے۔ اور سلطنت کو بھی دشواریاں پیش آتی تھیں اور رعایا بھی تباہ ہوتی تھی۔ انگریزوں کے آئین جدید نے اس خرابی کا قطعی سد باب کر دیا۔ اور اب غدر ۵۷ء کے بعد سے کسی ریاست کو سرکشی و بغاوت کا حوصلہ نہ ہو سکا اور ملک میں امن قائم ہو گیا۔ اس واسطے ہر شخص برٹش آئین کے اس عاقلانہ حصہ کو امن کے خیال سے پسند کرتا ہے اور یہ بُرائی کی چیز نہیں سمجھی جاتی۔

☆☆☆

تاج محل کی رہائی:

چوک میں بیگم کے باغ کے دروازہ کے سامنے حوض کے پاس جو کنواں تھا اس میں سنگ و خشت و خاک ڈال کر بند کر دیا بیماروں کے دروازہ کے پاس کئی دوکانیں ڈھا کر راستہ چوڑا کر لیا شہر کی آبادی کا حکم خاص و عام کچھ نہیں ہے۔ پنشن داروں سے حاکموں کا

کام کچھ نہیں۔ تاج محل۔ مرزا قیصر۔ مرزا جواں بخت کے سالے ولایت علی بیگ اور جیپور کی زوجہ ان سب کی الہ آباد سے رہائی ہوگئی۔ دیکھیے کیمپ میں رہیں یا لندن جائیں۔ خلق نے ازروئے قیاس جیسا کہ دلی کے خبر تراشوں کا دستور ہے یہ بات اڑا دی ہے۔ سو سارے شہر میں مشہور ہے کہ جنوری شروع سال ۱۸۵۹ء میں عموماً شہر میں اباد کیے جاویں گے۔

☆☆☆

یہ عبارت ۱۲ دسمبر ۱۹۵۸ء کی لکھی ہوئی ہے۔ تاج محل بہادر شاہ کی بیگم تھیں۔ زینت محل کا کمرہ لال کنوئیں اور فراش خانہ کے وسط میں سربازار واقع ہے۔ اس کے شاندار دارواز ہ پر بہادر شاہ کی کہی ہوئی اور خاص ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تاریخ کندہ ہے۔ یہ عالیشان عمارت آجکل مہاراجہ پٹیالہ کے قبضہ میں ہے۔ غدر کے ایام میں جو امداد انہوں نے انگریزی فوج کی کی تھی اس کے انعام میں یہ مکان ان کو دیا گیا تھا۔

تاج محل خوبصورت مکان کٹرہ خوش حال رائے میں تھا۔ جو ہندوؤں کے مشہور محلہ مالی واڑہ کے قریب واقع ہے۔ یہ مکان اب بھی موجود ہے اور اس میں دہلی کے مشہور ساہوکار لالہ کشن داس رہتے ہیں جن کے ہاں چاندی سونے کا بیپار ہوتا ہے۔ لالہ صاحب نے اس کی قدامت کی خوبصورتی کو بھی باقی رکھا ہے اور جدید خوشنما اضافے بھی کیے ہیں۔ مگر زینت محل کے کمرہ میں ریاست پٹیالہ نے کوئی ترقی نہیں کی بلکہ سابق کے آثار میں بھی بوسیدگی واقع ہو رہی ہے اور یہ تاریخی مکان چند دن کا مہمان ہے۔

☆☆☆

جامع مسجد کی رہائی:

مسجد جامع واگزاشت ہوئی چتلی قبر کی طرف سڑھیوں پر کبابیوں نے دوکانیں بنا لیں۔ انڈا، مرغی، کبوتر بکنے لگا۔ دس آدمی مہتمم ٹھہرے مرزا الٰہی بخش۔ مولوی صدر الدین۔

تفضل حسین خاں تین یہ۔ سات اور۔ ۷ نومبر ۱۴ جمادی الاوّل سال حال جمعہ کے دن ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ قید فرنگ وقید جسم سے رہا ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

جامع مسجد دہلی کے واگزاشت کرانے میں خان بہادر شیخ الٰہی بخش صاحب مرحوم رئیس میرٹھ نے دو لاکھ روپیہ یا اسی کے قریب سرکار کو دیا تھا اس کو رہا کیا گیا تھا۔ فتح دہلی کے بعد جامع مسجد میں گورے سپاہی رہتے تھے۔

جامع مسجد ایامِ غدر میں باغیوں کا مرکز بھی گئی تھی۔ جب انگریزی فوج نے پہلا دھاوا شہر پر کیا تو وہ جامع مسجد تک آ گئی تھی۔ مگر جمعہ کی نماز کے لیے جو مسلمان اس وقت وہاں جمع ہوئے تھے انہوں نے باہر نکل کر فوج کا مقابلہ کیا۔ اور ایسے لڑے کہ فوج کو کشمیری دروازہ تک واپس جانا پڑا اور دوسرے دن دوبارہ حملہ کر کے دہلی فتح کر لی۔ جمعہ کی لڑائی میں میرے والد موجود تھے۔ ان سے میں نے یہ قصہ سُنا۔ اور یہی وجہ جامع مسجد کے قبضہ فوجی کی تھی۔

☆☆☆

میکش پھانسی سے پہلے:

میکش چمن میں ہے۔ باتیں بناتا پھرتا ہے سُلطانجی میں تھا۔ اب شہر میں آ گیا ہے دو تین بار میرے پاس بھی آیا۔ پانچ سات دن سے نہیں آیا۔ کہتا تھا بی بی کو اور لڑکے کو بہرام پور میر وزیر علی کے پاس بھیج دیا ہے خود یہاں لوٹ کی کتابیں خریدتا ہے۔

یہ تحریر اُس وقت کی ہے جبکہ میکش زندہ تھے۔ اور غدر کی شرکت کا ان پر الزام نہ لگایا گیا تھا۔ درگاہ حضرت سلطان جیؒ میں رہتے تھے۔ مگر بعد میں ان کو بغاوت کے شبہ میں گرفتار کیا گیا۔ اور پھانسی دی گئی۔ اسی روزنامچہ میں غالب نے کہیں اس کا ذکر کیا ہے۔ میکش کے باپ گولی سے قتل ہوئے اور ان کو پھانسی دی گئی۔

☆☆☆

کشمیری کٹڑہ کی مسماری:

کشمیری کٹڑہ گر گیا ہے۔ وہ اونچے اونچے در، اور وہ بڑی بڑی کوٹھریاں دوررویہ نظر نہیں آتیں کہ کیا ہوئیں۔

پریڈ کے میدان کو دربار ۱۹۱۱ء کے ایام میں جب ہموار کیا جا رہا تھا تو سینکڑوں مکانات کے آثار دبے ہوئے نکلتے تھے۔ یہاں تک کہ چارپائیوں کے پایۂ آٹا گوندھنے کے کونڈے اور گھڑوں کے برتنے کی چیزیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب یہاں کے بازار اور محلے مسمار کیے گئے تو رہنے والوں کا سامان بھی اس میں دب گیا۔

خیال یہ تھا کہ گنجان محلوں اور بزاروں کا توڑنا ہوا صاف کرنے کے لیے تھا۔ مگر ۱۱ء میں یہ نشانیاں دیکھ کر کہا جاتا تھا کہ مسماری جوشِ انتقام سے بھی تعلق رکھتی تھی جب ہی تو اس بے دردی سے خانہ داری کے اسباب کو بھی ملیا میٹ کر دیا گیا۔ اور یہی وجہ ہے کہ غالب جب اس تباہی کا ذکر لکھتے ہیں تو ان کا قلم آنسو بہاتا جاتا ہے۔

☆☆☆

جب دہلی پر ٹیکس لگائے گئے:

شہر میں "پون ٹوٹی" کوئی چیز ہے وہ جاری ہوگئی ہے، سوائے اناج اور اُپلے کے کوئی چیز ایسی نہیں جس پر محصول نہ لگا ہو۔ جامع مسجد کے گرد پچیس فیٹ گول میدان نکلے گا۔ دکانیں۔ حویلیاں ڈھائی جاویں گی۔ دارالبقا فنا ہو جائیگی۔ رہے نام اللہ کا۔ خان چند کا کوچہ شاہ بولا کے بڑھ تک ڈھے گا۔ دونوں طرف سے پھاوڑہ چل رہا ہے۔

پون ٹوٹی (چنگی) کوئی چیز ہے۔ کہہ کر غالب نے تڑپا دیا۔ طعن کا نہایت پر لطف انداز ہے۔ سوائے اناج اور اُپلے کے ہر چیز پر ٹیکس (محصول) لگ جانا غالب جیسے شخص نے یقیناً نہایت حقارت سے محسوس کیا ہوگا چار پانچ فقروں میں نئی حکومت کے طرزِ حکمرانی کو

بیان کر دینا غالب ہی کا کام تھا۔

☆☆☆

دہلی کے غارت شدہ بازار:

شہر ڈھ رہا ہے۔ بڑے بڑے نامی بازار خاص بازار۔ اردو بازار اور خانم کا بازار کہ ہر ایک بجائے خود ایک قصبہ تھا اب پتہ بھی نہیں کہ کہاں تھے صاحبان مکنہ دو دو کانیں نہیں بتا سکتے کہ ہمارا مکان کہاں تھا اور دکان کہاں تھی۔ برسات بھر مینھ نہیں برسا۔ آب تیشہ اور کلند کی طغیانی سے مکانات گر گئے۔ غلہ گراں ہے۔ موت ارزاں ہے۔ موے کے مول اناج بکتا ہے ماش کی دال آٹھ سیر۔ باجرہ بارہ سیر۔ گیہوں ۱۳ سیر۔ چنے ۱۶ سیر گھی ڈیڑھ سیر۔

☆☆☆

یہ تینوں بازار دریا گنج (فیض بازار) کی سڑک کے خاتمہ سے شروع ہوتے تھے۔ جہاں اب پردہ باغ۔ ایڈورڈ پارک۔ وکٹوریہ ہسپتال کی پریڈ کا میدان واقع ہے۔

اس وقت کی گرانی جس کا حال لکھ کر غالب حیران ہیں آجکل کی گرانی کے مقابلہ میں ارزانی ہے۔ اب ماش کی دال ۳ سیر۔ گندم ۴ سیر باجرہ ۴ سیر اور گھی آدھ سیر ہے۔

☆☆☆

بہادر شاہ پر سکہ کہنے کا الزام:

سکہ کا وار تو مجھ پر ایسا چلا کہ جیسے کوئی چھرا یا کوئی گراب۔ کس سے کہوں کس کو گواہ لاؤں۔ یہ دونوں سکے ایک وقت میں کہے گئے ہیں۔ یعنی جب بہادر شاہ تخت پر بیٹھے تو ذوق نے یہ دونوں سکے کہہ کر گزارے بادشاہ نے پسند کیے۔ مولوی محمد باقر (غالباً مولانا محمد حسین آزاد کے والد یا کوئی عزیز ہوں گے ان کے اردو اخبار کا ذکر غدر کے اکثر حالات میں آتا ہے) جو ذوق کے معتقدین میں تھے۔ انہوں نے اپنی دلی اردو اخبار میں یہ دونوں سکے چھاپے۔ اس کے علاوہ ابھی وہ لوگ بھی موجود ہیں کہ جنہوں نے اس زمانہ میں مرشد آباد اور کلکتہ میں یہ سکے

سنے ہیں۔ اوران کو یاد ہیں۔ اب یہ دونوں سکے سرکار کے نزدیک میرے کہے ہوئے اور گزرانے ہوئے ثابت ہوئے۔ میں نے ہر چند قلمرو ہند میں دلی اُردو اخبار کا پرچہ ڈھونڈھا کہیں ہاتھ نہ آیا۔ یہ دھبہ مجھ پر رہا۔ پنشن بھی گئی۔ اور وہ ریاست کا نام ونشان خلعت و دربار بھی مٹا۔

☆☆☆

سکہ کی حقیقت لکھنے میں جو سادہ پُر اثر اور شاعرانہ تلازمہ برتا گیا ہے وہ زبان غالب کا بہترین نمونہ ہے ناظرین غور سے دیکھیں۔

داغ دار دہلی:

رفع فتنہ وفساد اور بلا ہیں مسلم۔ یہاں کوئی طرح آسائش کی نہیں ہے۔ اہل دہلی عموماً بڑے ٹھہر گئے۔ یہ داغ ان کی جبین حال سے عموماً مٹ نہیں سکتا۔

☆☆☆

دہلی میں مارشل لا:

رہنا شہر میں بے حصول اجازت حاکم احتمال ضرر رکھتا ہے۔ اگر خبر نہ ہو تو نہ ہو۔ اگر خبر ہو جائے تو البتہ قباحت ہے۔ دہلی کی عملداری میرٹھ وآگرہ اور بلاد شرقیہ کے مثل نہیں ہے۔ یہ پنجاب احاطہ میں شامل ہے۔ نہ قانون نہ آئین۔ جس حاکم کی جو رائے میں ہو وہ ویسے ہی کرے۔

☆☆☆

غالب نے مارشل لا کے چہرہ کو جگہ جگہ جس اختصار اور جس احتیاط مگر جس بیباکی سے لکھا ہے وہ آجکل کے سیاست نگاروں کے لیے قابل تقلید ہے۔

امن کے اشتہار کے بعد:

حکم عفو تقصیر عام ہو گیا ہے۔ لڑنے والے آتے جاتے ہیں اور آلات حرب و پیکار و دیگر توقیع آزادی پاتے ہیں۔

☆☆☆

یہ عبارت ۱۰ نومبر ۱۸۵۹ء کو لکھی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سب باغیوں کو امن مل گیا تھا۔ مگر اس کے بعد ۱۸۵۹ء اور ۶۰ء تک غالب کی بعض تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ دہلی کے اندر مسلمانوں کو بغیر ٹکٹ کے آنے کی اجازت نہ تھی۔ غالباً انتظاماً بعض حکام مقامی نے ایسا کیا ہوگا۔ ورنہ ملکہ وکٹوریہ امن عام کا اشتہار دے چکی تھیں جو ۱۸۵۸ء میں شائع ہو گیا تھا۔

☆☆☆

امدادی خرچ:

چند اشخاص کو اس بائیس مہینے میں سال بھر کا روپیہ بطریق مدد خرچ مل گیا باقی چڑھے ہوئے روپے کے باب میں اور آئندہ ماہ بماہ ملنے کے واسطے ابھی کچھ حکم نہیں ہوا۔ سوال امیر خسرو کی پہیلی ہے ''چیل بسولا کیئی تو کا ہے پھنکوں راب'' علی بخش خاں پچاس روپے مہینا پاتے تھے۔ بائیس مہینے کے گیارہ سو روپے ہوتے ہیں۔ ان کو چھ سو روپے مل گئے۔ باقی روپیہ چڑھا رہا۔ آئندہ ملنے میں کچھ کلام نہیں غلام حسن خاں سو روپے مہینے کا پنشن دار۔ بائیس مہینے کے بائیس سو روپے ہوتے ہیں، اس کو بارہ سو ملے۔ دیوان کشن لال کا ڈیڑھ سو روپے مہینہ بائیس مہینے کے تین ہزار تین سو ہوتے ہیں۔ اس کو اٹھارہ سو ملے۔ منا جمعدار دس روپے مہینے کا سکھ پلیبر سال بھر کے ایک سو بیس لے آیا۔ اسی طرح چندرہ سولہ آدمیوں کو ملا ہے آئندہ کے واسطے کسی کو کچھ حکم نہیں۔ مجھ کو پھر مدد خرچ نہیں ملا۔ جب کئی خط پر خط لکھے تو آخیر خط پر صاحب کمشنر بہادر نے حکم دیا کہ سائل کو بطریق مدد خرچ سو روپیہ بطا دیں میں نے وہ سو روپے نہ لیے۔ اور پھر صاحب کمشنر بہادر کو خط لکھا کہ میں باسٹھ روپے آٹھ آنے مہینا پانے والا ہوں۔ سال بھر کے ساڑھے سات سو روپے ہوتے ہیں سب پنشن داروں کو سال بھر کا روپیہ کیسے ملتے ہیں۔ مثل اوروں کے مجھے بھی سال بھر کا روپیہ مل

جاوے۔ ابھی اس میں کچھ جواب نہیں ملا۔ آبادی کا یہ رنگ ہے کہ ڈھنڈھورا پٹوا کر ٹکٹ چھپوا کر اجرٹن صاحب بہادر بطریق ڈاک کلکتہ چل گئے۔ دلی کے حقاجو باہر پڑے ہوئے ہیں منہ کھول کر رہ گئے۔ اب جب وہ سعادوت کریں گے تب شاید آبادی ہو گی۔ یا کوئی اور نئی صورت نکل آئے۔

☆☆☆

یہ تحریر فروری ۱۹۵۹ء کی ہے۔ اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۸۵۸ء میں اشتہار امن کے بعد بھی حکام انتظامی نے دہلی کے آباد ہونے میں احتیاط کی تھی۔

☆☆☆

دربار میں غالب تھے یا مہاجن:

رگ قلم کی خونابہ فشانی دیکھو۔ گورنر اعظم نے میرٹھ میں دربار حکم دیا۔ صاحب کمشنر بہادر دہلی نے سات جاگیرداروں میں سے جو تین بقیۃ السیف تھے ان کو حکم دیا اور دربار عام میں سے سوائے میرے کوئی نہ تھا۔ یا چند مہاجن۔ مجھ کو حکم نہ پہنچا۔ جب میں نے استدعا کی تو جواب ملا کہ اب نہیں ہو سکتا۔ میں اپنی عادت قدیم کے موافق خیمہ گاہ میں پہنچا۔ مولوی اظہار حسین خاں صاحب بہادر سے ملا چیف سکرٹر بہا بہادر کو اطلاع کی۔ جواب آیا کہ فرصت نہیں میں سمجھا کہ اس وقت فرصت نہیں۔ دوسرے دن پھر گیا میری اطلاع کے بعد حکم ہوا کہ ایام غدر میں تم باغیوں سے اختلاط رکھتے تھے۔ اب گورنمنٹ سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟ اُس دن چلا آیا۔ دوسرے دن میں نے انگریزی خط ان کے نام لکھ کر ان کو بھیجا۔ مضمون یہ کہ باغیوں سے میرا اختلاط مظنۂ محض ہے۔ امیدوار ہوں کہ اس کی تحقیقات ہو۔ تاکہ میری صفائی اور بیگناہی ثابت ہو۔ یہاں کے مقامات پر جواب نہ ہوا۔ اب ماہِ گزشتہ یعنی فروری میں پنجاب کے ملک سے جواب آیا کہ لارڈ صاحب بہادر فرماتے

ہیں کہ ہم تحقیقات نہ کریں گے۔ پس یہ مقدمہ طے ہوا۔ دربار وخلعت مسدود۔ پنشن موقوف۔ وجہ نامعلوم۔ لاوجود الا اللہ ولا موثر فی الوجود الا اللہ۔ ۱۸۵۵ء میں نواب یوسف علی خاں بہادر والی رامپور کہ میرے آشنائے قدیم ہیں۔ اس سال ۱۸۵۵ء میں میرے شاگرد ہوئے۔ ناظم ان کو تخلص دیا گیا۔ بیس پچیس غزلیں اُردو کی بھیجتے، میں اصلاح دے کر بھیج دیتا۔ کچھ روپیہ ادھر سے آتا رہتا۔ قلعہ کی تنخواہ جاری انگریزی پنشن کھلا ہوا۔ ان کے عطایا فتوح گنے جاتے تھے۔ جب یہ دونوں تنخواہیں جاتی رہیں تو زندگی کا مدار ان کے عطیہ پر رہا۔ بعد فتح دہلی وہ ہمیشہ میرے مقدم کے خواہاں رہتے تھے۔ میں عذر کرتا تھا۔ جب جنوری سن ۶۰ء میں گورنمنٹ سے وہ جواب پایا کہ اوپر لکھ آیا ہوں تو میں آخر جنوری میں رامپور گیا۔ چھ سات ہفتے وہاں رہ کر دلی آیا۔

☆☆☆

غالب کے استقلال نے فتح پائی:

۱۸۶۰ء میں لارڈ صاحب بہادر نے میرٹھ میں دربار کیا۔ صاحب کمشنر بہادر دہلی کو ساتھ لے گئے۔ میں نے آنا کہ میں بھی چلوں۔ فرمایا کہ نہیں جو لشکر میرٹھ سے دلی میں آیا موافق اپنے دستور کے روز ورود لشکر مخیم میں گیا۔ میر منشی صاحب سے ملا۔ ان کے خیمہ سے اپنے نام کا ٹکٹ صاحب سکرٹر بہادر کے پاس بھیجا۔ جواب آیا کہ تم غدر کے زمانہ میں بادشاہی باغی کی خوشامد کیا کرتے تھے۔ اب گورنمنٹ کو تم سے ملنا منظور نہیں میں گدا مبرم اس حکم پر ممنوع نہ ہوا۔ جو لارڈ صاحب بہادر کلکتہ پہنچے۔ میں نے قصیدہ حسب معمول قدیم بھیج دیا۔ مع اس حکم کے واپس آیا کہ آپ یہ چیزیں ہمارے پاس نہ بھیجا کرو۔ میں مایوس مطلق ہو کر بیٹھ رہا۔ اور حکام شہر سے ملنا ترک کیا۔ واقع اواخر ماہ گزشتہ یعنی فروری ۱۸۶۲ء میں نواب لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب دلی آئے۔ اہالیانِ شہر صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر صاحب

کمشنر کے پاس دوڑے اور اپنے نام لکھوائے۔ میں تو یگانہ محض اور مطرود حکام تھا۔ جگہ سے نہ ہلا۔ کسی سے نہ ملا۔ دربار ہوا، ہر ایک کامگار ہوا، شنبہ ۸ فروری کو آزادانہ منشی من پھولنگھ صاحب کے خیمہ میں چلا گیا۔ اپنے نام کا ٹکٹ صاحب سکرٹر بہادر پاس بھیجا بلایا گیا۔ مہربان پاکر نواب صاحب کی ملازمت کی استدعا کی۔ وہ بھی حاصل ہوئی۔ دو حاکم جلیل القدر کی وہ عنایتیں دیکھیں جو میرے تصور میں بھی نہ تھیں۔ بقیہ روداد یہ ہے کہ دوشنبہ دوم مارچ کو سواد شہر مخیم خیام گورنری ہوا۔ آخر روز میں اپنے شفیق قدیم جناب مولوی اظہار حسین خاں بہادر کے پاس گیا۔ اثنائے گفتگو میں فرمایا کہ ہمارا دربار و خلعت بدستور بحال و برقرار ہے۔ متحیرانہ میں نے پوچھا کہ حضرت کیونکر؟ حضرت نے کہا کہ حاکم حال نے ولایت سے آ کر تمہارے علاقہ کے سب کاغذ انگریزی و فارسی دیکھے۔ اور اجلاس کونسل حکم لکھوایا کہ اسد اللہ خاں کا دربار اور نمبر اور خلعت بدستور بحال و برقرار رہے۔ میں نے پوچھا کہ حضرت یہ امر کس اصل پر متفرع ہوا؟ فرمایا کہ ہم کو کچھ معلوم نہیں بس اتنا جانتے ہیں کہ یہ حکم دفتر میں لکھوا کر ۱۴ دن یا ۱۵ دن بعد ادھر کو روانہ ہوئے ہیں میں نے کہا سبحان اللہ

کارسازِ ما بفکرِ کارِ ما　　　فکرِ ما در کارِ ما آزارِ ما

شنبہ ۲۳ مارچ کو ۱۲ بجے نواب لفٹنٹ گورنر بہادر نے مجھ کو بلایا۔ خلعت عطا کیا۔ اور فرمایا کہ لارڈ صاحب بہادر کے ہاں کا دربار و خلعت بھی بحال ہے۔ انبالہ جاؤ گے تو دربار خلعت پاؤ گے۔ عرض کیا گیا حضور کے قدم دیکھے۔ خلعت پایا۔ لارڈ صاحب بہادر کا حکم سن لیا۔ نہال ہو گیا۔ اب انبالہ کہاں جاؤں جیتا رہا تو اور دربار میں کامیاب ہو رہوں گا۔

کارِ دنیا کسے تمام نہ کرد　　　ہر چہ گیرید مختصر گیرید

سر ولیم میور اور غالب:

پنشن قدیم اکیس مہینہ سے بند۔ اور میں سادہ دل فتوح جدید کا آرزومند۔ پنشن

کا احاطۂ پنجاب کے حکام پر مدار ہے۔ سوان کا یہ شیوہ اور یہ شعار ہے کہ نہ روپیہ دیتے ہیں، نہ جواب، نہ مہربانی، نہ عتاب خیر۔ اس سے قطع نظر کی۔ ۱۸۵۶ء سے بموجب تحریر وزیر اودھ عطیہ شاہی کا امیدوار ہوں۔ تقاضا کرتے ہوئے شرماؤں۔ اگر گنہگار ٹھہرتا تو گولی یا پھانسی سے مرتا۔ اس بات پر کہ میں بے گناہ ہوں مقید اور مقتول نہ ہونے سے آپ اپنا گواہ ہوں۔ پیشگاہ گورنمنٹ کلکتہ میں جب کوئی کاغذ بھجوایا ہے بقلم چیف سکرٹر بہادر اُس کا جواب پایا ہے۔ اب کی بار دو کتابیں بھیجی۔ ایک پیشکش گورنمنٹ اور ایک نظر نذر شاہی ہے، نہ اس کے قبول کی اطلاع۔ نہ اُس کے ارسال سے آگاہی ہے جناب ولیم میور صاحب بہادر نے بھی عنایت نہ فرمائی۔ ان کی بھی کوئی تحریر مجھ کو نہ آئی۔ یہ سب ایک طرف۔ اب خبریں ہیں مختلف۔ کہتے ہیں کہ چیف سکرٹر بہادر لفٹنٹ گورنر ہو گئے یہ کوئی نہیں کہتا کہ ان کی جگہ کون سے صاحب عالیشان چیف سکرٹر ہوئے۔ مشہور جناب ولیم میور صاحب بہادر صدر بورڈ میں تشریف لے گئے یہ کوئی نہیں کہتا کہ لفٹنٹ گورنر کے سیکرٹری کے کام کس کو دیے گئے۔

انگریزوں کے احسان کی یاد شریف ہندوستانی کے دل میں:

جناب آرنلڈ صاحب بہادر آج تشریف لے گئے۔ سنتا ہوں کہ کلکتہ جائیں گے میم اور بچوں کو ولایت بھیج کر پھر آئیں گے۔ مجھ سے وہ سلوک کر گئے ہیں۔ اور مجھ پر وہ احسان کر گئے ہیں کہ قیامت تک ان کا شکرگزار رہوں گا۔

غدر میں تم کہاں تھے:

خدا سب کا بھلا کرے۔ مجھ کو ڈپٹی کمشنر نے بلا بھیجا تھا۔ صرف اتنا ہی پوچھا کہ غدر میں تم اول تھے؟ جو مناسب ہوا وہ کہا گیا۔ دو ایک خط آمدہ ولایت میں نے پڑھائے۔ تفصیل لکھ نہیں سکتا۔ انداز ادا سے پنشن کا بحال و برقرار رہنا معلوم ہوتا ہے۔ مگر چندرہ مہینے پچھلے ملتے نظر نہیں آتے۔

غالب کی مفلسی کوتوالی میں:

یہ تو آفت دلی ہی پر ٹوٹ پڑی ہے۔ لکھنؤ کے سوا اور شہروں میں عملداری کی وہ صورت ہے جو غدر سے پہلے تھی۔ اب یہاں ٹکٹ چھاپے گئے ہیں۔ میں نے بھی دیکھے۔ فارسی عبارت یہ ہے:

''ٹکٹ آباد یدرونِ شہر دہلی بشرط ادخالِ جرمانہ''۔ مقدر روپے کی حاکم کی رائے پر ہے۔ آج پانچ ہزار ٹکٹ چھپ چکا ہے۔ کل اتوار یوم التعطیل ہے۔ پرسوں دوشنبہ سے دیکھیے یہ کاغذ کیونکر تقسیم ہوں۔ یہ تو کیفیت شہر کی ہے۔ میرا حال سنو بائیس مہینے کے بعد پرسوں کوتوال کو حکم آیا ہے کہ اسد اللہ خاں پنشن دار کی کیفیت لکھو۔ کہ وہ بے مقدور اور محتاج ہے کہ نہیں۔ کوتوال نے موافق ضابطہ کے مجھ سے چار گواہ مانگے ہیں۔ سو کل چار گواہ کوتوالی چبوترے جائیں گے۔ اور میری بے مقدوری ظاہر کر آئیں گے۔ کہیں یہ نہ سمجھنا کہ بعد ثبوت مفلسی چڑھا ہوا روپیہ مل جائے گا۔ اور آئندہ کو پنشن جاری ہو جائیگا۔

☆☆☆

کوتوالی میں اظہار مفلسی کے واقعہ کو کس رقت خیز انداز سے لکھا ہے کہ مجبوری سب کچھ کراتی ہے۔ اس پر بھی یہ یقین نہیں کہ نتیجہ مفید نکلے گا۔

☆☆☆

شرفا کی تصویر افلاس:

پنشن کا حال کچھ معلوم نہیں۔ حاکم خط کا جواب نہیں لکھتا۔ عملہ میں ہر چند تفحص کیجیے کہ ہمارے خط پر کیا حکم ہوا۔ کوئی کچھ نہیں بتاتا۔ بہر حال اتنا سنا ہے اور دلائل اور قرائن سے معلوم ہوا ہے کہ میں بے گناہ قرار پایا ہوں اور ڈپٹی کمشنر بہادر کی رائے میں پنشن پانے کا استحقاق رکھتا ہوں۔ پس اس سے زیادہ نہ مجھے معلوم نہ کسی کو خبر۔ میں کتابیں کہاں سے چھپواتا۔ روٹی کھانے کو نہیں۔ شراب پینے کو نہیں۔ جاڑے آتے ہیں۔ لحاف توشک کی فکر

ہے۔ کتابیں کیا چھپواؤں گا۔

☆☆☆

یہ غالب نے اپنا ہی حال نہیں لکھا بلکہ غدر کے بعد جو حالت شرفائے دہلی کی ہوگئی تھی اُس کی تصویر بھی دکھادی ہے۔

جو لوگ بے امنی کے خواستگار ہیں۔ ان حالات کو ذرا نظر عبرت سے پڑھیں۔

☆☆☆

گورنر جنرل نے غالب کی قدر دانی کی:

صاحب کمشنر بہادر دہلی یعنی جناب سانڈرس صاحب بہادر نے مجھ کو بلایا۔ پنجشنبہ ۲۴ فروری کو میں گیا۔ صاحب شکار کو سوار ہو گئے تھے۔ میں الٹا پھر آیا۔ جمعہ ۲۵ فروری کو گیا۔ ملاقات ہوئی۔ کرسی دی۔ بعد پرسشِ مزاج کے ایک خط انگریزی چار ورق کا اُٹھا کر پڑھتے رہے۔ جب پڑھ چکے تو مجھ سے کہا کہ یہ خط ہے منگوڈ صاحب حاکم اکبر صدر بورڈ پنجاب کا۔ تمہارے باب میں لکھتے ہیں کہ ان کا حال دریافت کر کے لکھو۔ سو ہم تم سے پوچھتے ہیں کہ تم ملکہ معظمہ سے خلعت کیا مانگتے ہو؟ حقیقت کہی گئی۔ ایک کاغذ آمدہ ولایت سے لے گیا تھا وہ پڑھوادیا۔ پھر پوچھا۔ تم نے کتاب کیسی لکھی ہے؟ اس کی حقیقت بیان کی۔ کہا ایک منگوڈ صاحب دیکھنے کو مانگتے ہیں اور ایک ہم کو دو۔ میں نے عرض کیا۔ کل حاضر کروں گا۔ پھر پنشن کا حال پوچھا۔ وہ گزارش کیا۔ اپنے گھر آیا۔ اور خوش آیا۔ حاکم پنجاب کو مقدمہ ولایت کی کیا خبر۔ کتابوں سے کیا اطلاع۔ پنشن کی پرسش سے کیا مدعا۔ یہ استفسار بحکم نواب گورنر جنرل ہوا ہے۔ اور یہ صورت مقدمہ فتح وفیروزی ہے۔

☆☆☆

کتاب دستنبو نے گورنر جنرل کے خیالات غالب کی طرف متوجہ کیے۔ جیسا کہ

میں نے ایک جگہ لکھا ہے۔ اس عبارت سے اس خیال کی مزید تائید ہوتی ہے۔

☆☆☆

۱۸۶۰ء میں املاک واگزاشت:

دربار لارڈ صاحب کا میرٹھ میں ہوا دلی کے علاقے کے جاگیردار بموجب حکم کمشنر دہلی میرٹھ گئے۔ موافق دستور قدیم مل آئے۔ غرضکہ پنجشنبہ ۲۹ دسمبر کو پہر دن چڑھے لارڈ صاحب یہاں پہنچے۔ کابلی دروازہ کی فصیل کے تلے ڈیرے ہوئے۔ اسی وقت توپوں کی آواز سنتے ہی میں سوار ہو گیا۔ میر منشی سے ملا۔ ان کے خیمہ میں بیٹھ کر صاحب سکرٹر کو خبر کروائی۔ جواب آیا کہ فرصت نہیں۔ یہ جواب سنکر نومیدی کی پوٹ باندھ کر لے آیا۔ ہر چند پنشن کے باب میں ہنوز لا و نعم نہیں مگر کچھ فکر کر رہا ہوں۔ دیکھوں کیا ہوتا ہے لارڈ صاحب کل یا پرسوں جانے والے ہیں۔ یہاں کچھ کلام و پیام نہیں۔ ممکن تحریر ڈاک میں بھیجی جائے گی۔ دیکھیے کیا صورت پیش آئے گی۔ مسلمانوں کی املاک کے واگزشت کا حکم عام ہو گیا ہے۔ جن کو کرایہ پر ملی ہے ان کو کرایہ معاف ہو گیا ہے۔ آج یکشنبہ یکم جنوری ۱۸۶۰ء ہے۔ پہر دن چڑھا ہے۔

☆☆☆

۱۸۵۵ء کے اعلان ملکہ وکٹوریہ سے صرف جاں بخشی ہوئی تھی۔ جائداد کی رہائی خصوصاً مسلمانوں کی املاک کی واگزاشت ۱۸۶۰ء میں ہوئی جیسا کہ غالب نے لکھا ہے۔

☆☆☆

گورنر غالب کے بسیار مہربان دوستان:

نواب لفٹنٹ گورنر بہادر غرب و شمال کو نسخہ دستنبو بسبیل ڈاک بھیجا تھا۔ اُن کا خط فارسی مشعر تحسین عبارت و قبول صدق ارادت و موادت بسبیل ڈاک آ گیا۔ پھر قصیدہ بہاریہ تہنیت و مدحت میں بھیجا گیا۔ اس کی رسید آ گئی۔ وہی خاص واحب بسیار مہربان دوستان

القاب اور کاغذ افشانی۔ ازاں بعد ایک قصیدہ جناب رابرٹ منٹگمری صاحب لفٹنٹ گورنر بہادر قلمرو پنجاب کی مدح میں بتوسط صاحب کمشنر بہادر دہلی گیا۔ اس کے جواب میں بھی خوشنودی نامہ بتوسط کمشنر بہادر کل مجھ کو آ گیا۔ پنشن ابھی تک مجھ کو نہیں ملی۔

☆☆☆

اس عبارت سے کئی باتیں نئی معلوم ہوئیں۔ ایک تو گورنر کا فارسی میں خط لکھنا۔ دوسرے مشرقی القاب سے مخاطب کرنا۔ تیسرے مشرقی یعنی افشانی کاغذ پر خط لکھا جانا۔ جس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ غدر کے بعد سے انگریزوں نے یہاں کے رسم و رواج کو کتنے زیادہ ترک کر دیا ہے۔ اور یہی وجہ اس کے غیر ہر دل عزیز ہو جانے کی ہے۔

غالب نے ہر جگہ پنشن کو مذکر لکھا ہے۔ مگر یہاں موئنث لکھتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوا کہ پنشن کا استعمال دونوں طرح جائز ہے۔

☆☆☆

سرجان لارنس اور غالب:

عرضی میری سرجان لارنس چیف کمشنر بہادر کو گزری۔ اس پر دستخط ہوئے کہ یہ عرضی مع کوائف ضمیمہ سائل بھیجا جائے اور یہ لکھا جائے کہ معرفت صاحب کمشنر دہلی کے پیش کرو۔ اب سرشتہ دار کو لازم تھا کہ میرے نام موافق دستور کے خط لکھتا۔ یہ نہ ہوا۔ وہ عرضی حکم چڑھی ہوئی میرے پاس آ گئی۔ میں نے خط صاحب کمشنر چارلس سانڈرس کو لکھا۔ اور وہ عرضی حکم چڑھی ہوئی اس میں ملفوف کر کے بھیج دی۔ صاحب کمشنر نے صاحب کلکٹر کے پاس یہ حکم چڑھا کر بھیجی کہ سائل کے پنشن کی کیفیت لکھو۔ اب وہ مقدمہ صاحب کلکٹر کے ہاں آیا ہے۔ ابھی صاحب کلکٹر نے تعمیل اس حکم کی نہیں کی۔ پرسوں تو اُن کے ہاں یہ روبکاری آئی ہے۔ دیکھیے کچھ مجھ سے پوچھتے ہیں یا اپنے دفتر سے لکھ بھیجتے ہیں۔ دفتر کہاں رہا جو اس کو دیکھیں گے۔ بہر حال یہ خدا کا شکر ہے کہ بادشاہی دفتر میں سے میرا نام کچھ شمول

فساد میں پایا نہیں گیا اور میں حکام کے نزدیک یہاں تک پاک ہوں کہ پنشن کی کیفیت طلب ہوئی ہے۔ اور میری کیفیت کا ذکر نہیں ہے یعنی سب جانتے ہیں کہ اس کو لگاؤ نہ تھا۔

☆☆☆

افلاس شاعری پر بھی غالب ہے:

ہمیشہ نواب گورنر جنرل کی سرکار سے دربار میں مجھ کو سات پارچے اور تین رقم جواہر خلعت ملتا تھا۔ لارڈ کیننگ صاحب میر اور بار و خلعت بند کر گئے ہیں۔ ناامید ہو کر بیٹھ رہا۔ اور مدت العمر کو مایوس ہو رہا۔ اب جو یہاں لفٹنٹ گورنر پنجاب آئے ہیں۔ میں جانتا تھا کہ یہ بھی مجھ سے نہ ملیں گے۔ کل انہوں نے مجھ کو بلا بھیجا۔ بہت ہی عنایت فرمائی اور فرمایا کہ لارڈ صاحب دلی میں دربار نہ کریں گے۔ میرٹھ ہوتے ہوئے اور میرٹھ میں ان اضلاع کے علاقہ داروں اور مالگزاروں کا دربار کرتے ہوئے انبالہ جائیں گے۔ دلی کے لوگوں کا دربار وہاں ہوگا تم بھی انبالہ جاؤ۔ شریک دربار ہو کر خلعت معمولی لے آؤ۔ کیا کہوں کہ کیا میرے دل پر گزری۔ گویا مردہ جی اٹھا مگر ساتھ اس مسرت کے یہ بھی سناٹا گزرا کہ سامانِ سفر انبالہ و مصارف بے انتہا کہاں سے لاؤں۔ اور طرہ یہ کہ نذر معمولی میری قصیدہ ہے۔ ادھر قصیدہ کی فکر۔ اُدھر روپیہ کی تدبیر۔ حواس ٹھکانے نہیں۔ شعر کام دل دماغ کا ہے۔ وہ روپیہ کی فکر میں پریشان۔ میرا خدا یہ مشکل بھی آسان کرے گا۔

☆☆☆

دن کی روٹی رات کی شراب:

بہ نسبت حکیم احسن اللہ خاں کے جوبات مشہور ہے۔ وہ محض غلط۔ ہاں مرزا الٰہی بخش جو شاہزادوں میں ہیں۔ ان کو حکم کرانچی بندر جانے کا ہے۔ اور وہ انکار کر رہے ہیں۔ دیکھیے کیا حکم ہو۔ حکیم کی کو اُن کی حویلیاں مل گئی ہیں۔ اب وہ مع قبائل ان مکانوں میں جا رہے ہیں اتنا حکم ان کو ہے کہ شہر سے باہر نہ جائیں۔ رہا میں:

تو بیکسی و غریبی ترا کہ می پرسد

نہ جزا۔ نہ سزا۔ نہ آفرین۔ نہ عدل۔ نہ ظلم۔ نہ لطف۔ نہ قہر۔ ۱۵ دن تک دن کو روٹی رات کو شراب ملتی تھی۔ اب صرف روٹی ملے جاتی ہے۔ شراب نہیں۔ کپڑا ایام تنعم کا بنا ہوا ابھی ہے۔ اس کی کچھ فکر نہیں۔

حکیم احسن اللہ خاں صاحب کی نسبت دلی میں مشہور ہوا تھا کہ وہ بھی جلا وطن کیے جائیں گے۔ اس کی طرف اشارہ ہے۔ میرزا الٰہی بخش کی جلاوطنی منسوخ ہوئی۔ اور وہ مرتے دم تک درگاہ حضرت سلطان جیؒ میں رہے۔ غالب کی قبر کے پاس ان کا شاندار مکان بنا۔ جو اب کھنڈر پڑا ہے۔ جلاوطنی ہی منسوخ نہیں ہوئی بلکہ بارہ سو روپے ماہوار پنشن بھی نسلاً بعد نسل دی گئی۔ جو ان کے بیٹوں میرزا سلیمان شکوہ عرف بڑے میرزا اور میرزا ثریا جاہ کے مرنے کے بعد ان کی بیگمات وورثا کو ملتی ہے میرزا الٰہی بخش اور اس کے لڑکے درگاہ حضرت سلطان جیؒ کے شرقی رُخ سنگِ سرخ کی جالیوں کے اندر دفن ہیں۔ میرزا الٰہی بخش آخر میں خیر خواہ سرکار ثابت ہوئے تھے۔ بہادر شاہ کے سمدھی تھے۔

☆☆☆

غدر کے دفتر شاہی میں غالب کا نام نہ تھا:

دفترِ شاہی میں میرا نام مندرج نہیں نکلا۔ کسی مخبر نے نسبت میرے کوئی خبر بدخواہی کی نہیں دی۔ حکام وقت میرا ہونا شہر میں جانتے ہیں۔ فراری نہیں ہوں۔ روپوش نہیں ہوں۔ بلایا نہیں گیا۔ دارو گیر سے محفوظ ہوں۔ کسی طرح کی باز پرس ہو تو بلایا جاؤں۔ مگر ہاں جیسا کہ بلایا نہیں گیا۔ خود بھی بروئے کار نہیں آیا۔ کسی حاکم سے نہیں ملا۔ خط کسی کو نہیں لکھا۔ کسی سے درخواستِ ملاقات نہیں کی۔ مئی سے پنشن نہیں پایا۔ یہ دس مہینے کیونکر گزرے ہوں گے انجام کچھ نظر نہیں آتا۔

غالب کی جان پٹیالہ کے سبب بچی:

میں حکیم محمد حسن خاں کے مکان میں نو دس برس سے کرایہ کو رہتا ہوں۔ اور یہاں قریب کیا بلکہ دیوار بدیوار ہیں گھر حکیموں کے اور وہ نوکر ہیں راجہ نرندر سنگھ بہادر والی پٹیالہ کے۔ راجہ نے صاحبانِ عالیشان سے عہد لے لیا تھا کہ بروقت غارت دلی یہ لوگ بچ رہیں۔ چنانچہ بعد فتح راجہ کے سپاہی یہاں آ بیٹھے اور یہ کوچہ محفوظ رہا۔ ورنہ میں کہاں اور یہ شہر کہاں۔ امیر غریب سب نکل گئے۔ جو رہ گئے۔ جو رہ گئے تھے وہ نکالے گئے۔ جاگیردار پنشن دار۔ دولتمند۔ اہلِ حرفہ کوئی بھی نہیں ہے۔ مفصل حال لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ ملازمانِ قلعہ پر شدت ہے۔ اور باز پرس اور دارو گیر میں مبتلا ہیں۔ مگر وہ نوکر جو اس ہنگام میں نوکر ہوئے ہیں اور ہنگامے میں شریک ہو رہے ہیں۔ میں غریب شاعر دس برس سے تاریخ لکھنے اور شعر کی اصلاح دینے پر متعلق ہوا ہوں۔ خواہی اس کو نوکری سمجھو خواہی مزدوری جانو۔ اس فتنہ و آشوب میں کسی مصلحت میں میں نے دخل نہیں دیا۔ صرف اشعار کی خدمت بجالاتا رہا۔ اور نظر اپنی بے گناہی پر شہر سے نکل نہیں گیا۔ میرا شہر میں ہونا حکام کو معلوم ہے۔ مگر چونکہ میری طرف بادشاہی دفتر میں سے یا مخبروں کی بیان سے کوئی بات پائی نہیں گئی۔ لہٰذا طلبی نہیں ہوئی ورنہ جہاں بڑے بڑے جاگیردار بلائے ہوئے یا پکڑے ہوئے آئے ہیں میری کیا حقیقت تھی۔ غرضکہ اپنے مکان میں بیٹھا ہوں۔ دروازہ سے باہر نہیں نکل سکتا۔ سوار ہونا اور کہیں جانا تو بہت بڑی بات ہے۔ رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آوے۔ شہر میں ہے کون جو آوے؟ گھر گھر بے چراغ پڑے ہیں۔ مجرم سیاست پاتے جاتے ہیں۔ جرنیلی بندوبست یازدہم مئی سے آج تک یعنی شنبہ پنجم دسمبر ۱۸۵۷ء تک بدستور ہے۔ کچھ نیک و بد کا حال مجھ کو نہیں معلوم۔ بلکہ ہنوز ایسے امور کی طرف حکام کو توجہ بھی نہیں۔ دیکھیے انجام کار کیا ہوتا ہے۔ یہاں باہر سے اندر تک کوئی بغیر ٹکٹ کے آنے جانے نہیں پاتا۔ ابھی دیکھا چاہیے مسلمانوں کی آبادی کا حکم ہوتا ہے یا نہیں؟

پنشن کی نسبت:

میں اجرائے پنشن سرکار انگریزی سے مایوس تھا بارے وہ نقشہ پنشن داروں کا جو یہاں سے بنگر صدر کو گیا تھا۔ اور یہاں کے حاکم نے نسبت میرے صاف لکھ دیا تھا کہ یہ شخص پانے کا مستحق نہیں ہے گورنمنٹ نے برخلاف یہاں کے حاکم کی رائے کے میری پنشن کے اجرا کا حکم دیا۔ اور وہ حکم یہاں آیا اور مشہور ہوا۔ میں نے بھی سُنا۔ اب کہتے ہیں کہ ماوآ بندہ یعنی مئی کی پہلی کو تنخواہ کا بٹنا شروع ہوگا۔ دیکھا چاہیے پچھلے روپے کے باب میں کیا حکم ہوتا ہے۔

دہلی کا دردناک مرثیہ:

بسکہ فعال ما یرید ہے
ہر سلحشور انگلستاں کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے
زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے
گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہر دہلی کا ذرہ ذرہ خاک
تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ اس کے یاں تک
آدمی واں نہ جا سکے یاں کا
میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا
وہی رونا تن و دل و جاں کا
گاہ جل کر کیا کیے شکوہ
سوزشِ داغہائے پنہاں کا

گاہ رو کر کہا کیے باہم
ماجرا دیدہ ہائے گریاں کا
اس طرح کے وصال سے غالب
کیا مٹے دل سے داغ ہجراں کا

☆☆☆

یہ مرثیہ محض شاعری نہیں بلکہ واقعاتِ غدر کی تاریخی تصویر ہے۔ چاندنی چوک میں پھانسیاں کھڑی ہوئی تھیں جن پر روزانہ سینکڑوں آدمیوں کو لٹکایا جاتا تھا مسلمانوں کے ساتھ خصوصیت سے سختی برتی جاتی تھی۔ انہی امور کو غالب نے غمناک انداز سے لکھا ہے۔

☆☆☆

انگریز بھی غالب کے شاگرد تھے:

جب سخت گھبراتا ہوں اور تنگ آتا ہوں تو یہ مصرعہ پڑھ کر چپ ہو جاتا ہوں
اے مرگ ساں تجھے کیا انتظار ہے

یہ کوئی نہ سمجھے کہ میں اپنی بے رونقی اور تباہی کے غم میں مرتا ہوں۔ جو دکھ مجھ کو ہے اُس کا بیان تو معلوم مگر اس بیان کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔ انگریزی قوم میں سے جوان روسیاہ کالوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے اس میں کوئی میرا امید گاہ تھا اور کوئی میرا شفیق اور کوئی میرا دوست اور کوئی میرا یار اور کوئی میرا شاگرد۔ ہندوستانیوں میں کچھ عزیز، کچھ دوست کچھ شاگرد، کچھ معشوق۔ سو وہ سب کے سب خاک میں مل گئے۔ ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے جو اتنے عزیزوں کا ماتم دار ہو اس کو زیست کیونکر نہ دشوار ہو۔ ہائے اتنے یار مرے کہ جواب میں مروں گا تو میرا کوئی رونے والا بھی نہ ہوگا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

☆☆☆

غالب کی انصاف پسندی دیکھنا۔ غدر کے مصائب کو بلا تعصب بیان کرتے ہیں۔ انگریزوں پر جو مظالم ہوئے ان کو بھی قلم پر لاتے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ غدر سے پہلے انگریز دیسی شعراء کے شاگرد ہوتے تھے۔ اور شرفا سے دوستیاں کرتے تھے۔ اب یہ باتیں کہانیاں ہو گئیں۔

☆☆☆

غالب انگریزوں کے خیر خواہ تھے:

حکم ہوا ہے کہ دوشنبہ کے دن پہلی تاریخ نومبر کو رات کے وقت سب خیر خواہان انگریز اپنے اپنے گھروں میں روشنی کریں اور بازاروں میں اور صاحب کمشنر بہادر کی کوٹھی پر بھی روشنی ہوگی۔

فقیر بھی اس تہیدستی میں کہ اٹھارہ مہینے سے پنشن مقرری نہیں پاتا، اپنے مکان پر روشنی کرے گا۔

☆☆☆

اس عبارت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے جو کہیں کہیں انگریزوں کے خلاف الفاظ استعمال کیے ہیں یہ اُس وقت کی عام زبان تھی ورنہ جشن میں شرکت، گھر پر روشنی کرنا صاف ظاہر کرتا ہے کہ وہ حکومت سے عناد نہ رکھتے تھے۔

تمام شد

جری عجلت رقم

۱۴ محرم ۱۳۳۰ھ

خلاصہ کتاب دستنبو کا ترجمہ

میں حامیانِ اردو کی طرف سے جناب میرزا یعقوب بیگ صاحب نامی ایم اے دہلوی کا شکرگزار ہوں کہ انہوں نے اپنے جدِ امجد دبیر الملک میرزا غالب کی مشہور کتاب دستنبو کا اردو ترجمہ کر دیا اور جس بے نظیر چیز کا کتاب ہذا کے شروع میں غالب نے جگہ جگہ ذکر کیا ہے وہ لباس اردو پہن کر ناظرین کے سامنے آ گئی۔

جناب نامی کا دادا جناب میرزا فتح اللہ بیگ المعروف بہ میرزا رجب بیگ مرحوم میرزا غالب کے چچازاد بھائی تھے۔ نامی صاحب میں بھی باوجود انگریزی کا اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے اپنے اجداد کی طرح سپاہیانہ ولولہ اور شاعرانہ نزاکت طبع پوری آن بان سے موجود ہے۔ انہوں نے کتاب دستنبو جس کے معنی گلدستہ کے ہیں، کا وہ تمام ضروری خلاصہ لے لیا ہے جس کا تعلق غدر کے احوال تاریخی سے تھا۔ اور کمال یہ ہے کہ ترجمہ ایسا سلیس اور صاف کیا کہ بالکل غالب کا رنگ معلوم ہوتا ہے اور مفہوم کتاب کی ادائیگی میں کسی قسم کی کمی بیشی نہیں ہوئی۔ غالبؔ نے ایام غدر میں یہ کتاب لکھی تھی جبکہ شرفاء اور خصوصاً مسلمانوں کا سانس خوف و مایوسی سے گھٹ رہا تھا۔ اس واسطے اگر ان کی رائے زنی میں مصلحت وقت کا پہلو زیادہ نمایاں نظر آئے تو موجودہ نسلوں کو اعتراض نہ کرنا چاہیے۔ کیونکہ غالب نے باوجود

نزاکت وقت بعض باتیں ایسی آزادی و بے باکی سے لکھ دیں کہ کوئی دوسرا لکھنا چاہتا تو دار و گیر کے اس ہولناک وقت میں نہ لکھ سکتا۔

دستنبو کا مروجہ نسخہ کشوری مطبع کا ہے جو ایسا غلط اور خراب کاغذ پر چھپا ہے کہ اس کا عدم وجود برابر ہے۔ مگر نامی صاحب نے اس کی صحت کی پوری جستجو فرمائی اور نواب سرفرخ میرزا صاحب رئیس لہارو کے بھائی مولینا ضمیر میرزا صاحب کی خاص کتب خانہ کی صحیح نسخہ سے غلطیاں درست کیں اور اس کے بعد ترجمہ کیا۔ دستنبو کا ترجمہ آسان نہ تھا کیونکہ وہ نہایت سخت فارسی میں ہے مگر نامی صاحب نے دو دن کے اندر اتنے مشکل کام کو آسان کر کے دے دیا۔ میں مکرر ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

حسن نظامی

۲۹ محرم ۱۳۴۰ھ

ضمیمہ۔ب

دستنبو کا اردو ترجمہ

۱۱مئی ۱۸۵۷ء

اس سال جس کا مادۂ تاریخی بہ رعایت تخرجہ ''رستخیز بے جا'' ہے اور اگر صاف صاف پوچھو تو ۱۶ رمضان ۱۲۷۳ھ کو پیر کے دن دوپہر کے وقت مطابق ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء اچانک دہلی کے قلعے اور فصیل کی دیواریں لرز اٹھیں جس کا اثر چاروں طرف پھیل گیا۔ میں زلزلے کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ اس دن جو بہت منحوس تھا، میرٹھ کی فوج کے کچھ بدنصیب اور شوریدہ سر سپاہی شہر میں آئے نہایت ظالم و مفسد اور نمک حرامی کے سبب سے انگریزوں کے خون کے پیاسے۔ شہر کے مختلف دروازوں کے محافظ جوان فسادیوں میں سازش ہوگئی ہو، شہر کی حفاظت کی شمہ داری اور حق نمک پر ہر چیز بھول گئے۔ ان بن بلائے یا مدعو کردہ مہمانوں کو خوش آمدید کہا۔ ان مدہوش سواروں اور اکھڑ پیادوں نے جب دیکھا کہ شہر کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ اور محافظ مہمان نواز ہیں۔ دیوانوں کی طرح اِدھر اُدھر دوڑ پڑے۔ جدھر کسی افسر کو پایا اور جہاں ان قابلِ احترام (انگریزوں) کے مکانات دیکھے جب تک ان افسروں کو مار نہیں ڈالا اور ان مکانات کو بالکل تباہ نہیں کر دیا۔ ادھر سے رُخ نہیں پھیرا۔

کچھ مسکین گوشہ نشین جن کو انگریزی حکومت کی مہربانی سے کچھ نان و نمک میسر تھا

شہر کے مختلف علاقوں میں ایک دوسرے سے دور زندگی کے دن گزار رہے تھے (ایسے مسکین وصلح پسند) جو تیر وتبر کے فرق سے ناواقف تھے اور اندھیری راتوں میں چوروں کے شور وغل سے ڈر جاتے تھے۔ جن کے ہاتھ تیر اور تلوار سے خالی تھے۔ سچ پوچھو تو ایسے لوگ ہر گلی کوچے کے، شہر کے ہر حصے میں ہیں یہ وہ لوگ نہیں جو لڑائی کے ارادے سے کمر کس کر تیار ہو سکیں۔ اس کے باوجود (کہ ایسے صلح پسند وخیر خواہ شہر کے ہر حصے اور ہر گلی کوچے میں تھے) اس وجہ سے کہ تیز بہنے والے پانی کو خس وخاشاک سے نہیں روکا جا سکتا۔ اپنے آپ کو مجبور سمجھ کر ہر شخص غمگین وماتم زدہ اپنے گھر میں بیٹھ رہا۔

مجبور وخانہ نشینی:

انہیں غم زدہ لوگوں میں سے ایک میں بھی ہوں، میں اپنے گھر میں بیٹھا ہوا تھا کہ شور وغوغا سنا۔ چاہتا تھا کہ کچھ معلوم کروں کہ اتنے میں شور مچ گیا کہ اندرون قلعہ صاحب اجنٹ بہادر اور قلعہ دار قتل کر دیے گئے ہر طرف سے پیادوں اور سواروں کے دوڑنے کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ زمین ہر طرف گل اندا موں (انگریزوں) کے خون سے رنگین ہو گئی۔ باغ کا ہر گوشہ ویرانی اور بربادی کے سبب سے بہاروں کا مدفن بن گیا۔

انگریزوں کے قتل پر اظہار افسوس:

افسوس وہ پیکر علم وحکمت، انصاف سکھانے والے، خوش اخلاق ونیک نام حاکم! اور صد افسوس وہ پری چہرہ نازک بدن خاتونیں جن کے چہرے چاندکی طرح چمکتے تھے اور جن کے بدن کچی چاندنی کی طرح دمکتے تھے! حیف وہ بچے جنہوں نے ابھی دنیا کو اچھی طرح دیکھا بھی نہیں تھا، جن کے ہنس مکھ چہرے گلاب ولالہ کے پھولوں کو شرماتے تھے اور جن کی خوش رفتاری کے سامنے ہرن اور کبک کی رفتار بدنما معلوم ہوتی تھی یہ سب ایک دم قتل وخون کے بھنور میں پھنس کر (بحر فنا میں) ڈوب گئے۔

(فنا کی) چنگاریاں برسانے والی وہ موت، شعلے جس کا سرمایہ ہیں جس کے ہاتھوں لوگ غمزدہ رہتے ہیں اور ماتمی لباس پہننے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اگر ان مقتولین کے سرہانے آہ وزاری کرے اور اس غم میں سیاہ پوش ہو جائے تو روا ہے۔ اگر آسمان (اس غم میں) غبار کی طرح منتشر ہو جائے اور زمین گرد باد کی طرح اپنی جگہ چھوڑ دے تو بجا ہے:

ای نو بہار چوں تن بسمل بخوں بغلت
ای روزگار چوں شب بی ماہ تار شو
ای آفتاب روئے بسیلی کبود کن
ای ماہتاب داغ دل روزگار تو

"اے موسم بہار! بسمل کی طرح خاک و خون میں مل جا، اے زمانے!
اندھیری رات کی طرح تاریک ہو جا! اے آفتاب! (اس غم میں)
اپنے رخساروں کو (پیٹ کر) نیلا کر لے اور اے چاند (غمگین)
زمانے کے دل کا داغ بن جا۔"

خدا خدا کر کے وہ منحوس دن ختم ہوا۔ ہر طرف گہرا اندھیرا پھیل گیا۔ ان سیاہ باطنوں اور بے رحم قاتلوں نے شہر میں جا بجا پڑاؤ ڈالا۔ اندرونِ قلعہ شاہی باغ کو گھوڑوں کا اصطبل بنایا اور نشیمن سلطانی کو خواب گاہ رفتہ رفتہ دور دور کے شہروں سے خبریں آئیں کہ مختلف فوجوں کے باغیوں نے ہر چھاؤنی میں افسروں کو قتل کر دیا ہے (اور نمک حراموں نے کھلم کھلا بغاوت کا شور مچا رکھا ہے) گروہ کے گروہ خواہ سپاہی ہوں یا زمیندار سب یک دل ہو گئے اور کسی طے شدہ پروگرام کے بغیر دور و نزدیک ہر جگہ ایک ہی کام کے لیے کمربستہ ہو گئے اور پھر کیسی مضبوطی سے کمریں کسی تھیں کہ صرف اس دریائے خون کی موجیں ہی ان کو کھول سکتی تھیں جو کمروں سے گزر جائے۔ (مختلف مقامات کے لوگ کسی قرارداد کے بغیر جس طرح ایک ہی کام یعنی قتل و خون میں لگ گئے تھے اس سے) ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جس

طرح جھاڑو کی بہت سی سینکوں کو ایک ہی بند سے باندھا جاتا ہے اسی طرح گنتی شمار سے باہر ان لڑنے والوں کی کمریں بھی ایک ہی ''کمر بند'' سے بندھی ہوئی ہیں۔

باغیوں کی مذمت:

بے شک ہندوستان کو آرام و آسائش سے اس حد تک خالی کرنے کے لیے اگر ان چیزوں کو ڈھونڈا جائے تو ایک گھاس کے تنکے کے برابر بھی نشان نہ ملے۔ ایسی ہی جھاڑو کی ضرورت تھی۔ بہت سے لشکر سرداروں کے بغیر تیار ہو گئے بہت سی فوجیں افسروں کے بغیر لڑائی کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ توپیں، گولہ بارود، چھرے غرض سارا سامان انگریزوں سے حاصل کیا، لڑائی کے سارے طریقے انگریزوں سے سیکھے اور انہیں دکھانے والوں اور مالکوں سے لڑنے کے لیے تیار ہو گئے۔

دل لوہے یا پتھر کا ٹکڑا نہیں ہے۔ کیسے نہ بھر آئے۔ آنکھیں رخنہ دیوار نہیں ہیں کہ آنسو نہ بہائیں۔ حکمرانوں کی موت کا غم منانا چاہیے اور ہندوستان کی ویرانی پر رونا چاہیے۔ شہر حاکموں سے خالی اور بندہ ہائے بے خداوند سے بھرا ہوا جیسے باغ، باغبان سے خالی اور درختان بے ثمر سے پُر ہو۔

لٹیرے ہر قسم کی پابندیوں سے اور سوداگر محصول ادا کرنے کی ذمہ داریوں سے آزاد، گھر ویرانے معلوم ہوتے ہیں اور مکانات (لوٹ مار کرنے والوں کے لیے) ''خوانِ مفت'' کا حکم رکھتے ہیں۔ جو لوگ گمنامی کے گوشوں سے چھپے ہوئے تھے وہ گروہ در گروہ خنجر بکف اپنی آرائش اور بے شرمی کا مظاہرہ کرتے پھرتے ہیں امن پسند اور نیک نہاد لوگ گھر سے بازار تک آتے ہوئے راستے میں بیسوں جگہ عاجزی اور مغلوبیت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو گئے۔ لٹیرے دن میں دلیری کے ساتھ لوٹ مار میں مصروف ہیں اور رات میں ریشمی بستروں پر محوِ خواب۔

شرفا کی تباہی:

بڑے بڑے اعلیٰ خاندان لوگوں کے گھروں میں چراغ جلانے کے لیے تیل نہیں اندھیری رات میں جب پیاس کی شدت بڑھتی ہے، بجلی چمکنے کے منتظر رہتے ہیں کہ یہ دیکھیں کہ کوزہ کہاں رکھا ہوا ہے اور پیمانہ کدھر ہے۔

(زمانے کی اس) بے نیازی و بے امتیازی کو کیا کہوں کہ وہ کم رتبہ لوگ جو سارا دن مٹی بیچنے کے لیے زمین کھودتے تھے۔ ان کو مٹی میں سونے کے ٹکڑے مل گئے اور جن لوگوں کی محفل میں رات میں آتش گل سے چراغ روشن رہتے تھے اندھیرے گھروں میں ناکامی و نامرادی کے غم میں مبتلا ہیں۔

کوتوال شہر کی زن و دختر کے علاوہ ساری نازنینانِ شہر کا زیور بزدل اور سیہ کار رہزنوں کے قبضے میں ہے۔ (زیور و آرائش سے معرا ہونے کے بعد) ان نازنینوں کا جو ہلکا سا انداز ناز باقی رہا تھا۔ اس کو ان نو دولت گدازادوں نے چھین لیا کہ ان کی خودنمائی کے کام آئے جو محبت کرنے والے پہلے نازنیان گل اندام کی ناز برداری کرتے تھے۔ اب ان بدخصلتوں کے ناز اٹھانے پر مجبور ہیں۔ ان بے سروپا لوگوں کے دماغوں میں غرور اس حد تک سما گیا ہے کہ اگر ان کی خودنمائی کے کام کا پتہ چلے تو معلوم ہوگا کہ کچھ بگولے چکر کھاتے پھر رہے ہیں اور چھچھورے ہر وقت اس طرح خود ناز خودنمائی میں محو رہتے ہیں گویا پانی کی سطح پر کچھ تنکے بہے چلے جا رہے ہیں بڑے بڑے عالموں اور ناموروں کی آبرو مٹی میں ملا دی گئی اور جن لوگوں کے پاس نہ دولت تھی نہ عزت۔ وہ بے اندازہ زر و جواہر اور عزت و آبرو کے مالک ہیں۔ جس کا باپ گلیوں کی خاک چھانتا پھرتا تھا۔ وہ ہوا کو اپنا خادم سمجھ رہا ہے۔ جس کی ماں پڑوسی کے گھر سے آگ مانگ کر لاتی تھی وہ آگ پر حکم چلانے کا مدعی ہے کہیں آگ اور ہوا پر حکومت کرنا چاہتے ہیں اور ہم ان پریشان حال لوگوں میں سے ہیں۔ جو

صرف سکون و آسائش کے چند لمحوں اور انصاف کے خواہش مند ہیں۔

درد دلم کے پیش تو افسانہ بیش نیست
چشم ستارہ رامژہ خوں چکاں دہد

"میرا درد بھرا حال تمہارے نزدیک ایک قصہ ہے۔ اور بس، لیکن اس کو سن کر ستاروں کی آنکھوں سے اشکِ خوں جاری ہو جائیں گے۔"

ڈاک کا نظام درہم برہم ہو گیا، جس کے سبب سے بہت سے کام رُک گئے۔ ہرکاروں نے آنا جانا بند کر دیا۔ ڈاک میں پیام بجنسہ پہنچانے کی گنجائش نہیں ہوتی ہاں خطوط کی آمد و رفت کا قاعدہ ہے۔ مگر اس محکمہ کی ایک شاخ (ٹیلی گراف) ہے کہ نہ مضراب کی جنبش بلکہ جنبش مضراب سے، جو اس سے پیدا ہوتی ہے۔ ہزاروں پیام (خبریں) اندر سے باہر نکلتے ہیں۔

غدر کی مذمت:

(جو لوگ) مذہب اور قانون کے بے حد پابند ہیں۔ انصاف کو نظر انداز نہ کریں اور بتائیں کہ اس سارے انتظام کا درہم برہم ہو جانا، خدا کی بخشی ہوئی دولت کا لٹ جانا، ڈاک کا نظام درہم برہم ہو جانا بڑا ظلم ہے۔

قیدیوں کی رہائی:

میں نے اس بات کا ذکر نہیں کیا۔ حالانکہ یہ بات بیان کرنے کے لائق تھی کہ یہ شہرت طلب جنگجو جس مقام سے چلے وہاں کے قید خانے کا دروازہ کھول دیا اور قیدیوں کو آزاد کر دیا۔ وہ پرانے قیدی جنھوں نے نئی نئی آزادی پائی تھی شاہی دربار میں آئے۔ سجدہ کیا اور کسی علاقے کی صوبیداری چاہی آقاؤں سے بھاگے ہوئے غیر وفادار غلاموں نے آستانِ شاہی کا بوسہ دیا اور کسی سربلند علاقے کی حکومت کے طلب گار ہوئے۔

کوئی نہیں کہتا اور میں بھی یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ہر خواہش مند کو حاضر ہونے کی اجازت اور ہر پناہ مانگنے والے کو پناہ کیوں دے دی جاتی ہے؟ بس یہ زمانے کی بوالعجبی ہے۔

تعداد فوج:

اب دہلی کے اندر اور باہر تقریباً ۵۰ ہزار سواروں اور پیادوں کی فوج پڑی ہوئی ہے صاحبانِ علم و دانش انگریزی حکام کے قبضے میں اس وسیع شہر کا کوئی علاقہ نہیں ہے۔ صرف شہر کے جانب مغرب۔ ایک پہاڑی پر ان کا قبضہ ہے یہ پہاڑی شہر سے کچھ زیادہ دور نہیں ہے۔ (انگریزوں نے) نہایت ہنر مندی سے اس جگہ پر مورچہ قائم کر کے ایک مضبوط قلعہ سا بنا لیا ہے اور اس کے چاروں طرف کئی اژدھا صفت، رعد خروش توپیں لگا دی ہیں اور استقلال کی مدد سے اس عالم پریشانی میں اطمینان (کی دولت) حاصل کر لی ہے۔

انگریزوں کی مورچہ بندی:

شہر کی فوج نے جو میگزین اسی شہر سے حاصل کیا تھا۔ اس میں سے چند توپیں شہر کی فصیل پر جما دی ہیں اور اس طرح اپنے آپ کو جنگجو سرداروں کا حریف فرض کر لیا ہے توپوں اور بندوقوں کے دھویں سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کالی گھٹا چھائی ہوئی ہے اور اس سے اولے برس رہے ہیں۔ رات دن دونوں طرف سے گولہ باری ہوتی ہے جیسے اوپر سے پتھر برس رہے ہوں۔ مئی جون کی گرمیاں ہیں۔ دھوپ کی تیزی روز بروز بڑھتی جا رہی ہے آفتاب پر برج ثور و جوزا میں بے طرح آتش فروزی میں مشغول ہے۔ معلوم ہوتا ہے خود بھی اسی آگ میں بھنا جا رہا ہے۔ جو لوگ سرد ہوادار مکانوں میں آرام و آسائش کے ساتھ رہتے تھے دن بھر دھوپ میں جلتے ہیں اور راتیں انہیں جلتے ہوئے پتھروں پر پیچ و تاب کے عالم میں بسر کرتے ہیں۔ اسفندیار اس میدانِ جنگ میں ہوتا تو روئیں تنی کے باوصف اس کی ہمت و جواں مردی ہوا ہو جاتی۔ اگر رستم اس داستان کو سن لیتا تو جی چھوڑ دیتا (شہر کی فوج

کے) مختلف مقامات سے آئے ہوئے سپاہی دن چڑھے شیر دل انگریزوں سے لڑنے کے لیے جاتے ہیں اور سورج ڈوبنے سے پہلے ہی واپس آ جاتے ہیں۔ بیرونِ شہر کی داستان شب و روز تو یہ تھی۔ اندرونِ شہر (کیا ہو رہا تھا اس سلسلے میں) ایک دن کا قصہ سننے کے لائق ہے:

در رگِ سازِ من نوائی ہست
کہ بہ بر غولہ اخگر اندازد!
زین نوائی شرر فشاں ترسم
کآتش اندر نواگرا نازد
سرگزشتی است بر زباں کہ زباں
بر من از خویش خنجر اندازد

"میرے سازِ دل کے تاروں میں وہ نغمے پنہاں ہیں جن سے چنگاریاں برستی ہیں۔ میں ڈرتا ہوں کہ مغنی ان کی زد میں نہ آ جائے۔ میری زبان پر وہ داستان ہے، جس سے میرے دل پر خنجر چلنے لگتے ہیں۔"

ایک شخص جس کے دماغ میں فرماں روائی و تکبر کے خیالات بھرے ہوئے تھے۔ درپردہ اپنے آقا اور مربی کا دشمن بن گیا۔ اس خیال سے کہ "اگر یہ واقف کار اور رازداں زندہ رہے گا تو میں نے جو خزانہ (ناجائز طریقوں سے) جمع کیا ہے، اس کا راز کھل جائے گا"۔ ہمیشہ نقصان پہنچانے کی تدبیریں سوچتا تھا اور یہ بات مشہور کر کے کہ حکیم احسن اللہ خاں "انگریزوں کے خیر خواہ اور طرفدار ہیں" فوج کے افسروں کو ان کی طرف سے بھڑکاتا رہتا ہے۔

حکیم احسن اللہ خان:

ایک دن کچھ لوگ (حکیم احسن اللہ خاں کو) قتل کرنے کے لیے ان کے محل پر

چڑھ دوڑے۔ حکیم صاحب اس وقت قلعے میں بادشاہ کے پاس تھے۔ چند آشفتہ سر قلعے میں گئے اور حکیم صاحب کو گھیر لیا۔ بادشاہ نے انتہائے محبت و بندہ پروری سے (حکیم صاحب کو بچانے کے لیے) اپنے آپ کو ان پر گرا دیا۔ اس طرح حکیم صاحب بچے جان تو بچ گئی لیکن یہ فتنہ اس وقت تک ختم نہیں ہوا جب تک کہ ان کا سارا گھر تباہ نہیں ہو گیا (حکیم صاحب کا گھر (جو خوبصورتی و آرائش میں) نگار خانہ چین کی طرح تھا لوٹ لیا گیا۔ ایوان کی چھت کو آگ لگا دی گئی۔ چھت کے شہتیر اور منقش تختے جل کر راکھ ہو گئے۔ دیواریں سیاہ پڑ گئیں۔ گویا وہ محل اس غم میں سیاہ پوش ہو گیا تھا۔

فریب مہرِ گردون مخور کہ ایں بے مہر
دہد فشار کسی را کہ در کنار کشد

"آسمان کی مہربانی سے دھوکا نہ کھانا۔ یہ بے وفا جس شخص کو آغوش
محبت میں جگہ دیتا ہے، اس کو کشمکش و عذاب میں مبتلا کر دیتا ہے۔"

برے سے برا غلام اپنے آقا سے اس طرح پیش نہیں آ سکتا۔ بشرطیکہ وہ ولدالحیض نہ ہو۔ یہ خبیث نمک حرام جس کے منہ پر چیچک کے داغ ہیں بے حیائی کے سبب سے جس کی آنکھیں پھیل گئی ہیں اور دہانہ فراخ ہو گیا ہے۔ اپنے آپ کو زہرہ و مشتری کی طرح سمجھتا ہے۔ ہر طرف کولہے مٹکاتا ہوا انداز دکھاتا ہوا گزرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ خوش خرامی میں کبک و تدرو کو شرماتا ہے۔ میں نے اس کا نام اس لیے نہیں لکھا کہ وہ ایک گداز ادہ گمنام ہے۔ میں اس پر لعنت بھیج کر جو داستان کہہ رہا تھا۔ اس کو پھر شروع کرتا ہوں۔

تفضّل حسین خان:

فوجیں ہر طرف سے آ کر جمع ہو رہی تھیں۔ بادشاہ کا نام لگا ہوا تھا۔ اس وجہ سے دور دور کے سرداران فوج اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ فرخ آباد کے نامور (سردار) تفضّل

حسین خان نے جن کو کبھی بادشاہ سے علاقے نیاز مندی نہیں تھا دوری سے آستان شاہی کو سجدہ کیا اور خط میں اپنے آپ کو نیاز مند قدیم لکھا۔

خان بہادر خان:

جان بہادر خان نے جو گمراہ شہرت طلب تھے۔ اور جو بریلی میں کچھ لشکر جمع کر کے سردار بن بیٹھا تھا۔ ایک سو ایک اشرفیاں نقرئی ساز و سامان سے آراستہ ہاتھی اور گھوڑا بارگاہ شاہی میں بھیجا۔

نواب یوسف علی خان:

چشم بد دور خورشید نشان نواب یوسف علی خان بہادر فرماں روائے رامپور نے جو اس علاقے میں باپ دادا کی جانشینی (کا حق ادا کر رہے ہیں) اور انگریزی حکومت کے ساتھ ان کا رشتہ دوستی اتنا مضبوط ہے کہ زمانہ ہزار برس میں بھی کسی طریقے سے اس کو نہیں توڑ سکتا، مجبوراً صرف زبانی پیام بھیج کر لوگوں کی زبان کو بند کیا۔

واقعات لکھنؤ:

لکھنؤ میں جب فوج نے (انگریزوں سے) رشتہ تعلق توڑ لیا (بیشتر) انگریز (دشمنی کی) اس آگ سے بچ کر دوسرے مقامات پر اپنے متعلقین کے پاس چلے گئے۔ (لیکن فوج کے) چند سرداروں نے کچھ لوگوں کو ساتھ لے کر بیلی گارد میں قیام کیا جو لکھنؤ کا ایک مشہور مقام ہے اور بہادری کے ساتھ دروازے بند کر لیے۔

شرف الدولہ نے جو بڑے واقف کار، اور معاملات کو سمجھنے والے تھے اور جو نوابان اودھ کے زمانے میں وزارت کے عہدے پر سرفراز تھے۔ اس کم تعداد لیکن باشان و شوکت گروہ (انگریز) کو نظر انداز کر کے واجد علی شاہ کے دس سالہ لڑکے کو تخت حکومت پر بٹھا دیا اور اس کو شہنشاہ ہندوستان کا وزیر اور اپنے آپ کو پیش کار اور نائب

وزیر فرض کرلیا۔ اس نامور شخص (شرف الدولہ) نے گویا ہما کو گرفتارِ دام کرلیا تھا۔ جب یہ سارا کام مکمل کرلیا۔ ایک منتخب شخص کو مناسب پیشکش کے ساتھ (دہلی) روانہ کردیا۔ قاصد آیا، دو روز آرام کیا پھر بارگاہ شاہی میں حاضر ہوا۔ دو صبا رفتار گھوڑے دو کوہ صفت ہاتھی، ایک سو اکیس اشرفیاں اور ایک سنہری کلاہ جو رنگ برنگ کے نایاب موتیوں سے مزین تھی، پیش کی، اور ایک جوڑ بازو بند جس میں ہیرے جڑے ہوئے تھے ملکہ کی خدمت میں محل میں بھیجا۔

یہ ساری وشوکت روشنی چراغ کی طرح (جلد ختم ہونے والی) تھی۔ گویا زمانے کی نظر بد اسی رونق کی منتظر تھی۔ حکومت اودھ کی اس پیشکش کے بعد آئینہ وسکندر اور جام جمشید کی ساری داستان ختم ہوگئی (باغی) فوج کے شوروغل سے نصیب کی آنکھیں کھلی ہی تھیں کہ پھر مند گئیں نہیں شہنشاہ کی قسمت کا ستارہ اتنی بلندی پر پہنچ گیا کہ دنیا والوں کی نگاہوں سے پنہاں ہوگیا۔

جائی کہ ستارہ شوخ چشمی ورزد
افسر، افسار، دگرزن، رزان ارزو
خوشید زا اندیشہ جادر گردش
برچرخ نہ بنی کہ چستان می لرزد

"جب قسمت کا ستارہ گردش میں آجاتا ہے تو تاج کی بھی کوئی قیمت نہیں رہتی، تم نہیں دیکھتے کہ تغیر کے خوف سے سورج آسمان پر کیسا کانپتا ہے۔"

۱۴ ستمبر

جس دن وہ سبز قدم قاصد آیا اور بادشاہ نے بندہ پروری فرمائی۔ اس کے کل کو پیر

کے دن قمری مہینے کی چوبیں اور ستمبر کی چودہ تاریخ کو پہاڑی کے دامن میں بیٹھے ہوئے (انگریزوں) نے شان وشکوہ کے ساتھ، کشمیری دروازے پر ایسا حملہ کیا کہ کالوں کی فوج کو بھاگتے ہی بنی۔

مئی گرز دہلی برون برد داد
ستمبر برود آورد داد
پس از چار ماہ وپس از چار روز
فرو زندہ شد مہر گیتی فروز
تہی گشت دہلی دیوانگان
بجروی گرفتند فرزانگان

"مئی کے مہینے میں اگر انصاف دہلی سے اٹھ گیا تھا تو ستمبر میں ظلم وستم کا دور ختم ہو گیا اور انصاف کا زمانہ واپس آ گیا چار مہینے چار دن کے بعد سورج آب وتاب کے ساتھ طلوع ہوا۔ دہلی دیوانوں سے خالی ہو گئی عقل مند (انگریزوں) نے بہادری کے ساتھ اس پر قبضہ کرلیا۔"

اگرچہ اا مئی سے ۱۴ ستمبر تک چار مہینے چار دن کا وقفہ ہے۔ لیکن اس بناء پر کہ پیر کے دن شہر (انگریزوں) کے ہاتھ سے نکلا تھا اور پیر ہی کے دن قبضے میں آیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ شہر کا ہاتھ سے نکل جانا اور پھر قبضے میں آ جانا، یہ دونوں کام ایک ہی دن میں ہوئے۔ مختصر یہ کہ فاتحین نے راستے میں جس شخص کو پایا قتل کر دیا۔ شہر کے عالی خاندان اور صاحب عزت وآبرو کی دولت کو بچانے کے لیے گھروں کے دروازے بند کر کے بیٹھ رہے۔

شہر میں بد باطن (باغیوں) کی جو فوج تھی اس میں سے کچھ لوگوں نے بھاگ جانے کی ٹھان لی اور کچھ لوگوں نے غرور میں آ کر لڑنے کی تیاری کی خبیث اور آوارہ لوگوں کا یہ گروہ شیر دل فاتحین سے الجھ پڑا۔ یہ لوگ اپنے خیال میں تو دشمنوں کو قتل کر

رہے تھے۔

لیکن میرے خیال میں وہ شہر کی عزت وآبرو کو برباد کر رہے تھے۔

دو تین دن تک کشمیری دروازے سے لے کر چوک تک تمام راستے میدان جنگ بنے رہے دہلی دروازہ، ترکمان دروازہ، اجمیری دروازہ یہ تینوں دروازے اس فوج کے قبضے میں رہ گئے مجھ مردہ دل کا غم کدہ (مکان) اوسط شہر میں کشمیری دروازے اور دہلی دروازے کے درمیان ہے اور میرے مکان سے ان دونوں دروازوں کا فاصلہ برابر ہے اگرچہ گلی کا دروازہ بند کرلیا گیا تھا۔ لیکن ابھی اتنا حوصلہ باقی تھا کہ دروازہ کھول کر باہر چلے جاتے تھے اور کھانے پینے کا سامان لے آتے تھے۔

انگریزوں کی فتح اور مظالم:

میں نے ابھی کہا کہ غضبناک شیروں (انگریزوں) نے شہر میں داخل ہوتے ہی بے سروسامان لوگوں کو قتل کرنے اور مکان کو جلانا جائز سمجھا۔ ہاں جس مقام کو لڑ کر فتح کرتے ہیں۔ لوگوں پر ایسی سختیاں کی جاتی ہیں۔

اسی غصے اور دشمنی کو دیکھ کر لوگوں کے منہ فق ہو گئے۔ بے شمار مرد عورتوں کے گروہ جن میں معمولی لوگ بھی تھے اور صاحب حیثیت بھی۔ ان میں پناہ گزیں ہو گئے۔ اس خیال سے کہ کسی مناسب وقت پر شہر میں واپس آجائیں گے یا کسی دوسرے شہر میں چلے جائیں گے۔

میرے دل پر نہ خوف ودہشت کا اثر ہوا اور نہ پائے استقلال کو جنبش ہوئی۔ میں نے کہا کہ میں گناہگار تو ہوں نہیں کہ سزا پاؤں، انگریز بے گناہوں کو قتل نہیں کرتے ہیں اور شہر کی آب وہوا ناسازگار نہیں ہے مجھے کیا پڑی ہے کہ ان بدخیالیوں کو دل میں جگہ دوں اور ادھر اُدھر بھاگتا پھروں۔

(اب) مکان کے ایک گوشے میں بے سروسامانی کے ساتھ بیٹھا ہوں۔ (اس

تنہائی میں) قلم میرا رفیق ہے۔ آنکھوں سے آنسو بہتے ہیں اور قلم سے دردناک الفاظ ٹپکتے ہیں۔

پر تہی دستم و بی برگ خدایا تا چند
بسخن شاد شوم کاین گہر از کان منست

''میں بالکل مفلس اور بے سروسامان ہوں۔ خاوند، کب تک یہ
سوچ سوچ کر خوش ہوتا رہوں گا کہ یہ جواہر (کلام) میری ہی
کان کے ہیں۔''

ازل کا لکھا ہوا بدل نہیں سکتا۔ ازل میں قسمتیں لکھی جا چکی ہیں۔ ہر ایک کو نوشتۂ قسمت کے مطابق سروسامان عطا کیا گیا ہے مصیبتیں اور راحتیں اسی حکم ازل کا نتیجہ ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ بے دلی و بے جگری کو چھوڑ کر جس طرح بچے ہر تماشے کو خوشی کے ساتھ دیکھتے ہیں۔ ہر لمحہ بدلنے والے زمانے کی حیرت افزا نیرنگیوں کو اس بڑھاپے میں خوشی کے ساتھ دیکھتا ہوں۔

۱۸ ستمبر:

جمعہ کے دن محرم کی ۲۶ تاریخ تھی اور ستمبر کی ۱۸ دن چڑھے دنیا کو خوشی بخشنے والا آفتاب عالم تاب برج سنبلہ کے ایک درجے میں پہنچ کر کسوف میں آ گیا اور اہل عالم کی چشم جہاں بین پر تاریکی نے ظلم ڈھایا۔ گمراہ باغی اندرون و بیرون شہر سے خنزیروں کی طرح بھاگنے لگے اور فاتحین نے شہر اور قلعے پر قبضہ کر لیا۔ کشت و خون اور پکڑ دھکڑ کی (آفت) اس گلی تک آ گئی۔ خوف سے لوگوں کے دل دہل گئے۔

کوچے کی دربندی:

اس گلی میں صرف دس بارہ گھر ہیں اور راستہ ایک ہی طرف سے ہے (گلی اندر سے بند ہے) گلی میں کوئی کنواں نہیں ہے۔ (اس گلی کے) زیادہ تر رہنے والے بچ گئے

ہیں (اس طرح کہ عورتیں بچوں کو چھاتی سے لگائے ہوئے تھیں اور مردوں کے کاندھوں پر سامان کی گٹھڑیاں تھیں۔ کچھ لوگ باقی رہ گئے تھے۔ ہم سب نے مل کر گلی کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ اور پتھر چن دیے گلی سر بستہ تو تھی ہی۔ در بستہ بھی ہو گئی۔ (ایک راستہ تھا، وہ بھی بند ہو گیا)

جاں اگر خستہ تراز تن بودم نیست شگفت
زاں کہ دل تنگ تراز گوشہ زندان منست

"میری روح جسم سے زیادہ خستہ و درماندہ ہو تو تعجب کی بات نہیں،
کیوں کہ میرا دل قید خانے کے گوشے سے بھی زیادہ تنگ ہے۔"

مہاراجہ پٹیالہ کی مدد:

(اتفاقاً) اس مصیبت میں کام بننے کی ایک صورت پیدا ہو گئی۔ فلک مرتبہ مریخ حشم راجہ نرندر سنگھ بہادر فرمانروائے پٹیالہ اس جنگ میں (انگریز) فاتحین کے ساتھ ہیں اور ان کی فوج شروع سے انگریزی لشکر کی مددگار ہے راجہ کے چند ملازمین خاص جوان اونچے عہدوں پر ہیں اور شہر کے نامور اور قابل عزت لوگوں میں سے ہیں (میری مراد) ہے کہ حکیم محمود خان، حکیم مرتضیٰ خان، حکیم غلام اللہ خان (سے) جو حکیم شریف خان جنت مکان کی اولاد میں ہیں۔ اس کوچے میں رہتے ہیں۔ دور تک ان کی دورویہ عمارتیں چلی گئی ہیں۔ میں دس سال سے ان میں سے ایک صاحب جاہ ثروت کا پڑوسی ہوں۔ ان تین حضرات میں سے اول الذکر حکیم محمود خاں (متعلقین اور اہل خانہ کے ساتھ) اپنے بزرگوں کی طرح باعزت زندگی بسر کرتے ہیں اور باقی دونوں حضرا پٹیالے میں راجہ کی مصاحبت میں کامیابی و کامرانی کے ساتھ رہتے ہیں۔

چونکہ دہلی کی فتح متوقع تھی۔ راجہ نے ازراہِ بندہ پروری طاقتور اور جنگجو (انگریزوں)

سے طے کرلیا تھا کہ جب (شہر) فتح ہوگا۔ اس گلی کے دروازے پر محافظ مقرر کردیے جائیں گے تاکہ انگریزی فوجی جن کو گورا کہتے ہیں گھروں کو نقصان نہ پہنچائیں۔

اثنائے کلام میں کبھی کبھی (مجبوراً) چند دوسرے باتوں کا تذکرہ بھی آجاتا ہے اس ضمنی باتوں کے بعد (میں) پھر اصل موضوع پر آتا ہوں۔ سارے شہر میں ۱۵ ستمبر سے ہر گھر کا دروازہ بند ہے۔ دکاندار وخریدار دونوں غائب ہیں۔ نہ گندم فروش ہے کہ گیہوں خریدیں۔ نہ دھوبی ہے کہ کپڑے دھلنے کو دیں۔ حجام کو کہاں ڈھونڈیں کہ سر کے بال تراشے اور مہتر کو کہاں سے ڈھونڈ کر لائیں کہ صفائی کرے۔ بہر حال جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے۔ ان پانچ دنوں میں (گلی کے لوگ) باہر نکل کر پانی تو برابر لے آتے تھے کبھی کبھی آٹا وغیرہ بھی مل جاتا تھا لیکن اس کے بعد یہ صورت حال ختم ہوگئی (گلی کا) دروازہ پتھروں سے بند کر لیا گیا اور دلوں کے آئینے پر غم والم کا غبار چھا گیا۔

ہنگامہ گرم سازی کوشش بجا نماند

خوں ہمچناں بہ آتش سوزان برابر است

"کوششوں کے سارے ہنگامے ٹھنڈے پڑ گئے اب مصیبتیں خوں کو

آگ کی طرح جلا رہی ہیں۔"

پانی اور غلے کا قحط:

گھروں میں کھانے کا جس قدر سامان تھا، رفتہ رفتہ ختم ہوگیا۔ پانی اگرچہ بے حد احتیاط سے پیا گیا لیکن آخر کار کوزے یا گھڑے میں ایک قطرہ نہیں رہا۔ عورتوں مردوں میں سے کسی میں برداشت کی طاقت نہیں رہی۔ جس کے ساتھ دن گزارنے اور (اپنے آپ کو) سامان خورد ونوش حاصل کر لینے کا فریب دینے کا وقت بھی گزر گیا دو شبانہ روز سب بھوکے پیاسے رہے۔

فریاد ازاں زاری و خونا بہ فشانی
فریاد ازاں خواری و بی برگ ونوائی
فریاد زبے چارگی و خستہ درونی
فریاد ز آوارگی و بے سروپائی

"افسوس! یہ گریہ وزاری اور ذلت ومحتاجی صد حیف! یہ بے چارگی و پریشاں حالی اور بے سروسامانی"۔

تیسرے دن جیسا کہ اس سے قبل ذکر آچکا ہے، مہاراجہ "پٹیالہ" کی فوج کے سپاہی آگئے اور پہرہ دینے لگے۔ گلی کے رہنے والوں نے لوٹ مار کرنے والوں کے خوف سے نجات پائی۔ 'ہر چہ باداباد' کہتے ہوئے پہرہ داروں سے باہر جانے کی اجازت چاہی یہ پہرہ ازراہ دوستی تھا نہ کہ ازراہ دشمنی۔ اس لیے یہ کہا گیا کہ چوک کے بازار تک جا سکتے ہیں چوک کے آگے قتل وخون کا بزار گرم ہے اور راستہ پر خطر ہے۔

مجبور و پریشان حال لوگوں نے دروازہ کھول دیا۔ بہشتی یا مشک کا ملنا ناممکن تھا۔ اس لیے ہر گھر سے ایک مرد اور میرے ملازمین میں سے دو شخص گئے۔ میٹھا پانی دور تھا اور (اتنی) دور جا نہیں سکتے تھے۔ مجبوراً نیم شور پانی مٹکوں اور گھڑوں میں بھر لائے اور اس طرح اس نمکین پانی سے وہ آگ بجھی جس کا دوسرا نام پیاس ہے۔

باہر جانے والے اور پانی لانے والے لوگ کہتے تھے کہ اس گلی میں جس سے آگے جانے کی ہم کو اجازت نہیں ہے، سپاہیوں نے کچھ مکانوں کے دروازے توڑ ڈالے (ان گھروں میں) نہ تو بورے میں آٹا ملا نہ برتن میں روغن، میں نے کہا اچھا بندہ وہ ہے جو برتن، تھیلے، آٹے اور تیل کا ذکر نہ کرے۔ ہماری روزی تو ایسے (روزی رساں) کے ذمہ ہے جو ہم کو نظر انداز نہیں کرے گا خدا کی بخشش کا شکر نہ ادا کرنا شیطنت ہے۔

آج کل ہم لوگ اپنے آپ کو قیدی سمجھ رہے ہیں اور حقیقت بھی یہ ہے کہ بالکل

قیدیوں کی طرح زندگی گزار رہے ہیں۔ نہ تو کوئی آتا ہے کہ کوئی بات سننے کو ملے۔ نہ خود باہر (جاسکتے) ہیں کہ اپنی آنکھوں سے سارے واقعات دیکھیں یقیناً ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے کان بہرے ہیں اور آنکھیں بے نور، اس کشمکش کے علاوہ نہ کھانے کو روٹی ہے نہ پینے کو پانی۔

ایک دن اچانک بادل آ گیا۔ پانی برسا۔ ہم نے (صحن میں) ایک چادر باندھ لی اور ایک مٹکا اس کے نیچے رکھ دیا اور (اس طرح) پانی حاصل کیا جا سکتا ہے کہ بادل دریا سے پانی لیتا ہے اور زمین پر برساتا ہے (لیکن) اس بار یہ ہما صفت بادل پانی چشمہ حیواں سے لایا۔ گویا سکندر نے جو چیز اپنی بادشاہت کے دور میں ڈھونڈی تھی۔ مجھ پریشاں حال نے وہ دولت (آب حیات) (اس) تباہی و بربادی کے عالم میں پائی ہے:

غالب نبود کو تہی از دوست ہمانا
ز انسان دہدم کام کے بسیار ندانم

"اے غالب! دوست کی طرف سے کبھی کوتاہی نہیں ہوتی۔ (البتہ)
وہ اس طرح کام بناتا ہے کہ ہم سمجھ نہیں پاتے۔"

سوانح غالب:

اس موقع پر میں چاہتا ہوں کہ کچھ اپنی زندگی اور اشغال کے متعلق بھی لکھوں۔
اس طرح کہ یہ سرگزشت سلسلۂ کلام سے غیر متعلق نہ ہونے پائے:

مرہم زداغ تازہ بزخم جگر نہم
پیکاں زدل بکاوش نشتر برآورم

"میں نئے داغوں سے زخم ہائے جگر پر مرہم رکھ رہا ہوں اور میں نشتر کی
مدد سے دل سے پیکان نکال رہا ہوں۔"

اس سال میری زندگی کا باسٹھواں سال شروع ہوا۔ (اتنی مدت سے) میں اس

دنیا کی خاک چھان رہا ہوں اور پچاس برس سے شعر و سخن میں مصروف جگر گدازی ہوں۔ میری عمر پانچ سال کی تھی کہ میرے والد عبداللہ بیگ خان بہادر کا انتقال ہو گیا خدا ان کی روح پر بے شمار رحمتیں نازل کرے، میرے چچا نصر اللہ بیگ خان بہادر نے مجھ کو اپنا بیٹا بنا لیا اور لاڈ پیار سے پرورش کی جب میری عمر نو سال کی ہوئی تو میرے چچا جو میرے سرپرست بھی تھے۔ موت کی گہری نیند سو گئے (گویا) میری قسمت سو گئی۔

(میرے یہ) لائق تعریف و صاحب جاہ و حشمت (بزرگ) چار سو سواروں کے سردار اور جنرل لارڈ لیک بہادر کے وفادار متعلقین میں سے تھے۔ اس فاتح اور سخی سرور کی مہربانی سے وہ آگرہ کے قریب دو پرگنوں کے حاکم اور مالک تھے ان کے انتقال کے بعد (وہ) دونوں پرگنے انگریزی حکومت نے واپس لے لیے۔ اس جاگیر کے بجائے میرا اور میرے حقیقی بھائی کا کچھ وظیفہ مقرر کر دیا گیا جو میری آرام و آسائش کا ذریعہ تھا۔ چنانچہ اس سال یعنی ۱۸۵۷ء میں اپریل تک کا وظیفہ کلکٹری دہلی کے خزانے سے میں نے حاصل کیا۔ مئی سے اس خزانے کا دروازہ ہی بند ہو گیا۔ اب میں بدنصیبی سے دوچار ہوں اور دل طرح طرح کے خیالات پریشان کا مسکن ہے۔

اس سے پہلے صرف بیوی تھی نہ کوہ لڑکا تھا نہ لڑکی، تقریباً پانچ سال ہوئے کہ میں نے اپنی بیوی (جو میری تباہی کی ذمہ دار ہے) کے خاندان کے دو بے ماں باپ کے بچوں کو لے کر پال لیا ہے۔ ان شیریں زباں بچوں سے مجھ کو بے انتہا محبت ہے۔ اس عالم بے چارگی میں (دونوں بچے) میرے ساتھ ہیں اور میرے دامن و گریباں کی پھول ہیں۔

مرزا یوسف:

بھائی جو دو سال مجھ سے چھوٹا ہے تیس سال کی عمر میں دیوانہ ہو گیا۔ تیس برس سے وہ اس طرح زندگی گزار رہا ہے کہ نہ کسی کو ستاتا ہے، نہ شور و غل کرتا ہے، اس کا مکان میرے

گھر سے تقریباً دو ہزار قدم کے فاصلے پر ہے۔ اس کی بیوی اور لڑکیوں نے بچوں اور کنیزوں کے ساتھ بھاگ جانے ہی میں عافیت سمجھی۔ گھر کے فاتر العقل مالک اور سارے سامان کو ایک بوڑھے دربان اور ایک بڑھیا کنیز کے ساتھ چھوڑ دیا۔

اگر میں جادو جانتا ہوتا تب بھی (ان حالات میں) میں کسی کو بھیج کر ان تینوں آدمیوں کو نہ بلوا سکتا تھا، نہ سامان منگوا سکتا تھا۔ یہ بہت بڑا غم ہے۔ اور میرے دل پر اس کا بہت اثر ہے۔

وہ دونوں ناز پروردہ بچے پھل، دودھ، مٹھائی مانگتے ہیں لیکن ان کی خواہش پوری کرنا میرے بس میں نہیں۔ افسوس! افسوس! اس ایک بات کو کیا کہوں۔ جب تک زندہ ہوں، روٹی اور پانی کی فکر رہے گی اور مرنے کے بعد کفن دفن کی۔ میں دن رات اس فکر میں رہتا ہوں کہ بھائی نے دن میں کیا کھایا (ہوگا) اور رات میں کیسے سویا (ہوگا) اور (حالات سے) ناواقفیت کا یہ عالم ہے کہ یہ بھی نہیں کہہ سکتا ہوں کہ (بھائی) زندہ بھی ہے یا مصیبتیں (اٹھاتے اٹھاتے مر گیا۔)

نہ ہمیں نالہ دفغان بلم
من و جان آفریں کہ جاں بلم
"میرے ہونٹوں پر صرف آہ و فغاں نہیں ہے
خدا کی قسم (اس غم سے) میں جاں بلب ہوں"

جو حالات میں نے بیان کیے یہ حال دکھانے والے ہیں لیکن جو کچھ میں کہہ نہیں سکا ہوں، وہ روح فرسا ہے جو لوگ حالات سے واقف ہیں۔ میں ان سے توقع کرتا ہوں کہ وہ میری پر درد داستان کو غور سے سنیں گے اور سن کر انصاف کریں گے۔

☆☆☆

میں اس بڑھاپے میں چراغ صبح اور آفتاب بام کی مانند ہوں، میرا مطلب چراغ

کی روشنی اور سورج کی نورافشانی سے نہیں ہے بلکہ جس طرح صبح کے وقت چراغ کا روغن ختم ہونے کے قریب ہوتا ہے اور اس کی روشنی ہلکی ہو سکتی ہے اور دن ڈھلے سورج کی چمک دمک ماند پڑنا شروع ہو جاتی ہے وہی میرا حال ہے دو سال ہوئے کہ میں نے ملکہ انصاف پسند، فلک رفعت، ستارہ حشم، ملکہ وکٹوریہ کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا اور ڈاک سے جو دہلی سے براہ راست بمبئی اور وہاں سے لندن جاتی ہے، آقائے ہنر پرور حاکم نامور لارڈ الن برا بہادر کے حضور میں بھیجا جو گورنری کے زمانے میں از راہ کرم میرے مربی تھے۔

راہ سخن کشودم گر خود نہ شد کہ بخت
راہم بہ بزم بانوی گیتی ستاں دہد

یہ شعر اسی قصیدہ کا ہے۔ وہ قصیدہ اسی ردیف قافیے میں ہے۔ کسے خیال تھا کہ ایسا مشکل کام اس آسانی سے بن جائے گا۔ تین مہینے بعد اچانک ایک مبارک قدم قاصد اس سرو بوستان سروری (لارڈ الن برا) کا نوازش نامہ لایا۔ یہ خط انگریزی میں تھا۔ نہایت محبت کے ساتھ لکھا تھا کہ قصیدہ ہمارے پاس پہنچ گیا اور ہم نے اس کو ملکہ معظمہ کے سامنے پیش کرنے کے لیے متعلقین بارگاہ شاہی کے حوالے کر دیا۔ اس پر مسرت پیغام اور مبارک جواب کو تیس دن گزرے تھے کہ سردار مہربان مسٹر رز نگٹن بہادر کا گرامی نامہ ڈاک سے آیا، لکھا تھا کہ قصیدہ لارڈ الن برا بہادر کے واسطے سے ہمارے پاس پہنچا تھا۔ اس کے بارے میں یہ حکم ہے کہ سائل ضابطے کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنی گزارشات فرماں روائے ہندوستان کے وسیلے سے ہماری بارگاہ میں پیش کرے۔

غالب کے تین مطالبات:

حکم کی تعمیل کرتے ہوئے ایک معروضہ شہنشاہ انگلینڈ کے نام (لکھ کر) سکندر جاہ فریدون حشم لارڈ کیننگ نواب گورنر بہادر کے حضور میں بھیجا۔ اس گزارش نامے میں التماس

وآرزو کو اس طرح پیش کیا گیا کہ روم، ایران اور دوسرے ممالک کے بادشاہوں نے شاعروں اور مداحوں کو طرح طرح سے نوازا ہے۔ موتیوں سے منہ بھر دینا، سونے میں تلوانا، گاؤں عطا کرنا اور انعام دینا، غرض مختلف انداز رہے ہیں۔ اس مداح کی یہ خواہش ہے کہ ملکہ معظمہ اپنی زبان (مبارک) سے مہر خواں (خطاب) ارشاد فرمائیں۔ اپنے حکم سے سراپا (خلعت) بخششیں اور اپنے خوان سے چند نان ریزہ (روٹی کے ٹکڑے عنایت فرمائیں مہر خواں اور سراپا کا ترجمہ عربی میں خطاب اور خلعت ہو سکتا ہے اور نان ریزہ کو انگریزی میں پنشن کہہ سکتے ہیں۔

حاکم بلند مرتبہ نواب گورنر جنرل بہادر نے جواب میں میرے دل غمزدہ کو بشارت مداوا سے ارشاد فرمایا (موصوف) نے لکھا کہ (وہ) ستائش نامہ انگلستان روانہ کر دیا گیا۔ اس خبر مسرت سے میں ایسا مسرور ہوا کہ جامے میں پھولا نہیں سماتا تھا۔

مایوس کن جواب:

چار ماہ کے بعد میرے خط کے جواب میں فرخ شمائل، عالی نسب مسٹر سیل کلرک بہادر کے خامہ مشک بار کا لکھا ہوا مودت نامہ (موصول ہوا) اس (جواب نے) امیدواری اور آرزومندی کی مدت کو اور بڑھا دیا۔

میں جانتا ہوں کہ اگر ہندوستان کا نظم و نسق (غدر میں) تباہ نہ ہوتا اور ناخدا ترس اور ناشکر سے سپاہیوں کے ہاتھوں عدالتیں نہ اجڑ جاتیں تو گلستان انگلستان سے ایسا فرمان صادر ہوتا ہے کہ جس سے مرادیں پوری ہو جاتیں اور میری آنکھیں اور میرا دل دونوں ایک دوسرے کو مبارک باد دیتے۔

اب وہ مبارک خطوط جو میری پر جوش آرزوؤں کی فہرست ہیں اور میرے ہوش و خرد کے بازو کا تعویذ میرے پاس ہیں اور جگر کے چند ٹکڑے جو جوش گریہ میں آنکھوں سے

ٹپکتے ہیں جگر خراشی وخون فشانی کے نشان کے طور پر میرے دامن میں ہیں۔

نی کشتہ زخم و ناوک و شمشیرم
نی خستہ ناخن پلنگ و شیرم
لب می گزم و خون بزبان می لیسم
خوں می خورم و زندگانی سیرم

''میں تیر یا تلوار کا زخمی نہیں ہوں۔ نہ پلنگ و شیر نے مجھے مجروح کیا ہے۔ میں (شدت غم میں) اپنے ہونٹ کاٹتا ہوں اور زبان کو خون آلود کر لیتا ہوں۔ خون جگر کھاتا ہوں اور زندگی سے بیزار ہوں۔''

مرزا یوسف کے گھر کی تاراجی:

ستمبر کے اکتیسویں تاریخ کو بدھ کے روز شہر کی فتح اور گلی کا دروازہ بند کرنے کے سترہویں دن لوگ خبر لائے کہ لوگ مارگی، دیوانے مرزا یوسف خان اور دونوں بڑھیا کنیز (ماما) دونوں نے ان ہندوؤں کی مدد سے کھانے پینے کا انتظام کرنے کی کوشش میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔

واضح ہو کہ اس پکڑ دھکڑ اور قیامت کے عالم میں جس طرح ہر کوچے اور بازار میں اس مصیبت کی صورت یکساں نہیں ہے۔ اسی طرح قتل کرنے اور لوٹ مار میں بھی سب سپاہیوں کا انداز ایک نہیں ہے۔ کوئی (سپاہی) رحم کرتا ہے یا دوسرا سختی کرتا ہے تو یہ ذاتی رحم دلی سنگدلی کا نتیجہ ہے۔

انگریز سپاہیوں کی معقولیت اور امن پسندی کا اعتراف:

میں جانتا ہوں کہ اس یلغار میں حکم یہ ہے کہ جو شخص اظہار اطاعت کرے اس کو قتل نہ کیا جائے، مال چھین لیا جائے۔ مقتولین کے متعلق یہ خیال ہے کہ انہوں نے یقیناً اطاعت

نہیں کی۔ اسی وجہ سے ان کو قتل کر دیا گیا۔ مشہور بھی یہی ہے کہ عموماً سامان لوٹ لیتے ہیں قتل نہیں کرتے۔ بہت کم ایسا ہوا ہے اور وہ بھی صرف دو تین کوچوں میں کہ پہلے قتل کر دیا پھر سامان لوٹ لیا۔ (البتہ) بوڑھوں، عورتوں اور بچوں کا قتل روا نہیں رکھا ہے۔

اس مقام پر پہنچ کر توسنِ خامہ رُک گیا۔ اب میں ایک پُر زور آواز بلند کروں کہ سمندِ قلم قدم آگے بڑھائے۔ اے انصاف کی تعریف کرنے والے اور ظلم کو برا کہنے والے حق پرستو! اگر ظلم کی مذمت اور انصاف کی تعریف میں تمہاری زبان اور تمہارا دل ایک ہے۔ تو خدا کے واسطے ہندوستانیوں کا طرزِ عمل یاد کرو اس کے بغیر کہ پہلے سے دشمنی کی کوئی بنیاد اور عداوت کا کوئی سبب ہو (ان ہندوستانیوں نے) اپنے آقاؤں کے مقابلے میں تلوار اٹھائی بے چاری عورتوں اور گہوارے میں کھیلتے ہوئے بچوں کو قتل کیا (حالانکہ) سب جانتے ہیں کہ اپنے آقا سے بے وفائی کرنا گناہ ہے (اس کے مقابلے میں) ان انگریزوں کو جب (دشمنی کا بدلہ لینے) کے لیے لڑنے والے اٹھے اور گناہگاروں کو سزا دینے کے لیے لشکر آراستہ کیا۔ چونکہ (وہ) شہر والوں سے بھی برہم تھے تو موقع تو اس کا تھا کہ شہر پر قابض ہونے کے بعد کتے بلی تک کو زندہ نہ چھوڑتے۔ لیکن انہوں نے ضبط کیا۔ (اگرچہ) ان کے سینے میں غصہ کی آگ بھڑک رہی تھی۔ عورتوں اور بچوں کو ذرا نہیں ستایا۔ یہ جو گھر بار اور جان مال محفوظ رہنے کی ذمہ داری نہیں لی گئی ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ بے گناہوں اور گناہگاروں میں امتیاز ہے جن لوگوں کو باز پرس کے لیے بلایا گیا ہے۔ ان کے سوا اور کسی کو حاضر ہونے کی اجازت نہیں دی ہے۔

شہر کے بیشتر لوگوں کو باہر نکال دیا گیا ہے کچھ لوگ بہ دستور امید و بیم میں گرفتار (شہر کے اندر) موجود ہیں۔ جو (لوگ شہر سے نکل کر) ویرانوں اور گوشوں میں مقیم ہوئے ہیں۔ ان کے بارے میں ابھی کوئی حکم (صادر) نہیں ہوا۔ جو لوگ (شہر سے) باہر نکل گئے ہیں یا جو شہر کے اندر مبتلائے پریشانی ہیں، ان کے درد کا کوئی مداوا نہیں ہے۔ کاش (شہر کے)

اندر رہنے والے اور (شہر کے) باہر بسنے والے ایک دوسرے کی زندگی و موت سے واقف ہوتے کہ بے تابی و پریشانی نہ ہوتی۔ بس یہ جاننا کافی ہے کہ جو جس جگہ ہے پریشان ہے شہر کے اندر رہنے والے مجبور لوگ ہوں یا باہر کے پریشان نہ ہوتی۔ بس یہ جاننا کافی ہے کہ جو جس جگہ ہے پریشان ہے شہر کے اندر رہنے والے مجبور لوگ ہوں یا باہر کے پریشان حال، سب کے دل درد سے بھرے ہوئے ہیں اور سب قتل عام کے خوف سے ہراساں ہیں۔

کرنل براؤن کے سامنے پیشی:

۵/اکتوبر کا پیر کا مصیبت آفرین دن تھا۔ دوپہر کے وقت اچانک چند گورے اس دیوار پر چڑھ گئے جو بند کردہ دروازے سے ملی ہوئی ہے (وہاں سے) ایک چھت پر (اور چھت سے) کود کر گلی میں آ گئے۔ راجہ نرندر سنگھ کے سپاہیوں کا روکنا (کچھ) مفید نہیں ہوا (نہیں روک سکے) دوسرے چھوٹے چھوٹے مکانات کو نظر انداز کر کے راقم الحروف کے گھر میں (گھس) آئے۔ (ان گوروں نے) بھل منسی سے سامان کو ہاتھ نہیں لگایا۔ مجھ کو ان دونوں بچوں، دو تین ملازمین اور چند نیک کردار پڑوسیوں کے ساتھ گلی سے دو فرلانگ سے کچھ فاصلے پر حقیقت پسند دانشور کرنل براؤن کے پاس لے گئے جو چوک سے اس طرف قطب الدین سوداگر کی حویلی میں مقیم ہے۔ (کرنل براؤن نے) مجھ سے بہت نرمی اور انسانیت سے بات چیت کی۔ مجھ سے نام اور دوسروں سے پیشہ پوچھا۔ خوش اسلوبی کے ساتھ اسی وقت رخصت کر دیا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اس خوش اخلاق (کرنل براؤن) کی تعریف کی اور چلا آیا۔

۷/اکتوبر

۷/اکتوبر کو شام کے وقت ۲۱ توپوں کی آواز نے (قوت) سامعہ کو نوازا اور آگہی

کو غرقِ حیرت کر دیا (میں سوچنے لگا کہ) لیفٹنٹ گورنر بہادر کے آنے پر سترہ توپوں کی سلامی دی جاتی ہے اور نواب گورنر جنرل بہادر کے آنے پر انیس توپوں کی۔ اکیس توپوں کی ہوش افزا سلامی کی کیا وجہ ہے دوسرے دن بھی نہ اس ناواقفیت میں کوئی کمی ہوئی۔ نہ معلومات میں کچھ اضافہ۔ میرا خیال ہے کہ ملک کے پست و بلند کو ہموار کرنے والے (انگریزوں) کو کسی دوسری جگہ باغیوں پر فتح حاصل ہوئی ہے۔

واضح رہے کہ ابھی باغیوں کے بہت سے گروہ بریلی، فرخ آباد اور لکھنو میں جگہ جگہ شورش پھیلانے اور بے فائدہ مقابلہ کرنے میں مصروف ہیں، اور ان کے دل، کہ خدا کرے خون ہو جائیں، اور ان کے ہاتھ کہ خدا کرے کہ بیکار ہو جائیں اسی کام (لڑائی) کے لیے کھلے ہوئے ہیں۔

میواتیوں کی شورش:

ادھر سوہنہ اور نوہ کے علاقے میں میواتیوں نے بے طرح شورش پھیلا رکھی ہے، جیسے دیوانے زنجیروں سے آزاد ہو گئے ہیں۔ تلارام نامی ایک شورش پسند کچھ دن تک ریواڑی میں ہنگامہ آرا رہا۔ پھر شیطان کی رہنمائی سے میواتیوں سے مل گیا یہ گروہ میدانوں اور پہاڑوں میں (انگریز) حاکموں سے برسرِ جنگ ہے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی سرزمین پر ہر طرف تیز آندھیوں اور بڑھتی ہوئی آگ کے ہنگامے بپا ہیں۔

ان غم انگیز حالات میں جن کا آغاز یاد نہیں ہے اور جن کا انجام معلوم نہیں ہے رونے کے علاوہ کچھ دیکھا ہو تو آنکھوں کے روزن خاک سے بھر جائیں۔ روزِ سیاہ (بدنصیبی) کے علاوہ اور کچھ ہے ہی نہیں۔ جس کے متعلق کہوں کہ آنکھوں نے اس کو دیکھا۔ اس سے قطع نظر کرتے ہوئے (کہتا ہوں) کہ روزِ سیاہ (بدنصیبی) تو وہ چیز ہے جس کی تاریکی میں کچھ دیکھا ہی نہیں جا سکتا۔

خانہ نشینی:

جس دن گورے مجھے پکڑ کر لے گئے تھے۔ اس دن کے علاوہ چوکھٹ پر قدم رکھنا، گھر سے باہر نکلنا، گلی یا بازار میں چلنا، یا دور سے چوک کو دیکھ لینا نصیب نہیں ہوا ہے گویا گنجہ کے دانشور (نظامی گنجوی) نے میری ہی زبان میں کہا ہے:

ندانم کہ گیتی چساں میرود
چہ نیک و چہ بد در جہاں میرود
میں نہیں جانتا ہوں دنیا میں کیا ہو رہا ہے
کیا اچھائی ہو رہی ہے کیا بڑائی

ان لاعلاج غموں اور مرہم بیزار زخموں (کے ہوتے ہوئے تو) مجھ کو یہ سوچنا چاہیے کہ میں مر چکا ہوں۔ مجھ کو باز پرس کے لیے اٹھایا گیا اور جزائے اعمال بد کے نتیجے میں دوزخ کے کنویں میں لٹکا دیا گیا ہے مجبوراً اس قید میں بے چارگی و پریشانی کے ساتھ ہمیشہ جینا پڑے گا:

آہ گر باشد ہمیں امروز من فردای من
(مجھ پر جو کچھ آج گزر رہی ہے، اگر کل بھی یہی گزری (تو) آہ کیا ہوگا)

کیفیت روزنامچہ شماری:

اس کتاب میں شروع سے آخر تک ان حالات کا ذکر ہے جو مجھ پر گزرے ہیں یا ان واقعات (کا ذکر) ہوگا جو سننے میں آئے ہیں۔ میں نے جو شنیدہ حالات لکھے ہیں تو کوئی یہ خیال نہ کرے کہ میں نے جھوٹ باتیں سنی ہوں گی یا کچھ کم کر کے لکھی ہوں گی۔ میں دار و گیر سے خدا کی پناہ چاہتا ہوں اور سچائی میں نجات ڈھونڈتا ہوں آنکھیں بے کار ہیں، دل قید (غم) میں ہے اور لب ساکت ہیں۔ لوگوں کی زبانوں

سے میرے کانوں کی معلومات کی بھیک ملتی ہے کیسی بری ہے یہ گدائی! اور وہ بھی اس بے سروپائی کے ساتھ۔

اور یہ جو بادشاہ اور شاہزادوں کے انجام کے متعلق میں نے جو کچھ نہیں لکھا (حالانکہ ان واقعات کو) فتح شہر کی داستان کے دیباچہ کے طور پر (آغاز ہی میں) لکھنا چاہیے تھا۔ اس کی بھی یہی وجہ ہے کہ اس تحریر کے سلسلے میں میرا سارا سرمایہ سخن ہائے شنیدہ ہیں اور ابھی بغیر سنی ہوئی باتیں بہت ہیں یقیناً جب میں اس جائے تنگ سے باہر نکلوں گا جو باتیں اب تک نہیں سنی ہیں ادھر اُدھر سے جمع کروں گا اور تب واقف کاروں کی طرح یہ راز کی بات لکھوں گا میں امید کرتا ہوں کہ اس تحریر کے پڑھنے والے (واقعات) داستان کی تقدیم وتاخیر پر ازروئے انصاف اعتراض نہیں کریں گے۔

۱۹ر اکتوبر

۱۹ر اکتوبر کو پیر کے دن جس کا نام ہفتے کے رجسٹر سے کاٹ دینا چاہیے، آتش فشاں نے اژدھے کی طرح دنیا کو نگل لیا۔ اسی دن صبح کے وقت وہ کمبخت دربان بھائی کے مرنے کی خوشخبری لایا۔ کہتا تھا کہ وہ گرم رفتار راہ فنا (یوسف مرزا) پانچ دن تیز بخار میں مبتلا رہا اور آدھی رات کے قریب اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔ پانی، رومال، غسال، گورکن، اینٹ، چونے، گارے وغیرہ کا ذکر چھوڑو، یہ بتاؤ کہ میں کیسے جاؤں اور (میت کو) کہاں لے جاؤں۔ کس قبرستان میں سپرد خاک کروں۔ بازار میں اچھا برا کسی قسم کا کپڑا نہیں ملتا ہے۔ زمین کھودنے والے مزدور گویا کبھی شہر میں تھے ہی نہیں۔ ہندو اپنے مردوں کو دریا کنارے لے جا کر جلا سکتے ہیں۔ (لیکن) مسلمانوں کی کیا مجال ہے کہ دو تین شخص ساتھ ساتھ راستے سے گزریں۔ چہ جائیکہ میت کو شہر سے باہر لے جائیں۔

مرزا یوسف کے کفن دفن کا انتظام

پڑوسیوں نے میری تنہائی پر رحم کیا اور (اس) کام کو انجام دینے کے لیے تیار

ہوئے پٹیالے کے ایک سپاہی کو آگے کیا۔ میرے دو نوکروں کو ساتھ لیا اور چل دیے۔ میت کو غسل دیا۔ دو تین سفید چادریں یہاں سے (گھر) لے گئے تھے ان میں لپیٹا اور اس مسجد میں جو مکان کے برابر تھی زمین کھودی۔ (قبر بنائی) میت کو اس میں رکھ دیا اور گڑھے کو پاٹ کر لوٹ آئے۔

دریغ آں کہ اندر رو رنگ سرہلست
سہ وہ شا دوی سال شاد زیست
تہہ خاک بالیں زخشش نہ بود
خدایا بریں مرد
خدایا بریں مردہ بخشائش
کہ نادیدہ در زیست آسائش
سروشی بدل جوئی اور فرست
روانش بجا دید میتو فرست

افسوس کہ ساٹھ سال کی عمر میں (وہ) تیس سال
شاد رہا اور تیس سال کی، قبر میں اس کو بالش
خشت بھی نہ ملا، خاک کے علاوہ اور کچھ اس کی
قسمت میں نہیں تھا، اے خدا اس مرنے والے
پر رحم کر کہ اس نے زندگی میں آرام (کی صورت)
نہیں دیکھی، اس کی دل جوئی کے لیے کسی فرشتے
کو بھیج اور اس کی روح کو بہشت میں داخل کر

یہ نیک سرشت لیکن بدقسمت شخص جس نے زندگی کے ساٹھ سال خوش و خوش

گزارے۔ تیس سال ہوش مندی کے ساتھ اور تیس سال بے ہوش (دیوانگی) کے عالم میں زمانہ ہوش مندی میں غصہ ضبط کرنا اور عالم دیوانگی میں کسی کو تکلیف نہ پہنچانا جس کا شعار تھا۔ ۲۹ صفر سنہ ۱۲۷۳ھ کی شب میں مر گیا۔

زسال مرگ ستم دیدہ میرزا یوسف
کہ زیستی بجہاں در ز خویش بیگانہ
یکے در انجمن از من ہمی پژوہش کرد
کشیدم آہی و گفتم دریغ دیوانہ

"ایک شخص نے مجھ سے ستم نصیب مرزا یوسف کی تاریخ (وفات) پوچھی، جس نے اس دنیا میں اپنے سے بیگانہ ہو کر زندگی گزاری۔ میں نے ایک آہ کھینچی اور کہا: "دریغ دیوانہ"

تاریخ وفات مرزا یوسف:

واضح ہو کہ "دریغ دیوانہ" سے ۱۲۹۰ عدد حاصل ہوتے ہیں۔ اگر ان میں سے "آہ" کے ۱۶ عدد نکال دیے جائیں تو ۱۲۷۴ (ہجری) رہتے ہیں جو مطلوب ہیں۔

بنام آنکہ پوزش درخور اوست
بہر جا سرفرود آری در اوست

اس خدا کے نام جس کے حضور میں معذرت کرنا ہی مناسب ہے۔ تم جہاں سر جھکاؤ گے، اس کا آستانہ ہوگا۔

فرماروائے لوہارو کی تباہی:

جس ہفتہ انگریزی فوج نے شہر کو فتح کیا، اسی ہفتے نامورانِ دانش مند امین الدین احمد خان بہادر محمد ضیاء الدین خان بہادر نے حفظ وضع کی خاطر اور امید بہتری پر شہر چھوڑ

دینے کا فیصلہ کیا۔ بیوی بچوں کے علاوہ تین ہاتھی اور چالیس گھوڑے ساتھ تھے۔ پرگنہ لوہارو کا رخ کیا جوان کی ابائی جاگیر ہے۔ پہلے مہرولی گئے اور گورستان پر انوار (مقبرہ) میں قیام کیا۔ دو تین روز آرام کی۔ اس دوران میں لٹیرے سپاہیوں نے قیام گاہ کو گھیر لیا جو کپڑے پہنے ہوئے تھے، ان کے علاوہ سارا سامان چھین لیا اور چلے گئے البتہ ان تینوں ہاتھی جن کو وفادار اور خیر خواہ ہمراہی اس لوٹ مار کے شروع ہوتے ہی نکال لے گئے تھے۔ تباہی ونقصان کے نشان کی حیثیت سے باقی رہ گئے۔ جیسے تین جلے ہوئے خرمن ہوں۔

(یہ لوگ) لوٹ مار کی مصیبت اٹھا کر (اس) بے سروسامانی کے ساتھ جس کو تم اچھی طرح سمجھ سکتے ہو (ریاست) دوجانہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ (دوجانہ) کے نامور اور نیک کردار (فرماں رواں) حسن علی خان بہادر نے ازراہِ انسانیت وفیاضی، ان کا استقبال کیا۔ یہ کہہ کر کہ "میرا گھر بھی آپ ہی کا گھر ہے۔" ان سب کو دوجانہ لے گئے۔

قصہ مختصر سردار خوش خصال (حسن علی خان) نے اپنے ہم سر (مہمانوں) کے ساتھ وہی سلوک کیا جو شاہ ایران نے ہمایوں کے ساتھ کیا تھا۔ صاحب کمشنر بہادر نے (ان حالات) سے واقف ہو کر اپنے پاس بلالیا (یہ لوگ) شہر میں آئے اور حاکم سے ملاقات کی۔ (صاحب کمشنر) نے کچھ دیر طعن وتشنیع کی (لیکن) جب نرم جواب سنا تو پھر کچھ نہیں کہا۔ قلعہ کے اندر ایوانِ خانہ سامانی کے پہلو میں ٹھہرنے کا حکم دیا۔

تسلسلِ کلام کی رعایت کی وجہ سے میں اس خاندان کی تباہی کی داستان نہیں لکھ سکا۔ یوں سمجھو کہ مہرولی میں ان لوگوں کو لوٹا گیا اور دہلی میں ان کے مکانات جو مالکوں سے خالی تھے۔ نذر غارت گری ہوئے جو سامان یہ لوگ وہاں (مہرولی) اپنے ساتھ لے گئے تھے، لوٹ مار کرنے والوں کے حصے میں آیا۔ بس متعلقین زندہ دوجانہ پہنچے اور جو سامان یہاں محلات میں تھا سب لٹ گیا۔ بس اینٹیں پتھر باقی رہ گئے نہ سیم وزر محفوظ رہا نہ لباس و

بستر کا ایک تار بچا۔ خدا (ان) بے گناہوں پر رحم کرے اس آغاز ناساز گار کا انجام بخیر ہو،
اوران کو مصیبت کے بعد آرام نصیب ہو۔

حاکم جھجھر اور حاکم فرخ نگر کی گرفتاری:

یقیناً اکتوبر کی ۱۷ تاریخ تھی اور سنیچر کا دن تھا کہ یہ دونوں دانش مندان یگانہ شہر میں آئے جیسا کہ میں نے (پہلے) کہا ہے قلعہ میں قیام کیا۔ اس واقعہ کے دو تین دن کے بعد فوج کو حکم دیا گیا۔ فوج گئی اور جھجھر کے حاکم عبدالرحمٰن کو مجرموں کی طرح لائی قلعہ کے اندر ایک ایوان کے گوشے میں جس کو دیوان عام کہتے ہیں (ٹھہرنے کے لیے) جگہ دی گئی اور ان کی ساری جاگیر انگریزی حکومت نے ضبط کرلی۔

۳۱ر اکتوبر کو جمعہ کے دن فرخ نگر کے حاکم احمد علی خان کو اسی طرح گرفتار کر کے لائے جیسے عبدالرحمٰن خان کو لائے تھے اور قلعہ دہلی میں ایک الگ جگہ ان کو ٹھہرایا گیا۔ فرخ نگر میں تیز دست تباہ کاروں کا نشان بنا اور شہر والوں کا مال واسباب لٹ گیا۔

حاکم بہادر گڑھ اور بلب گڑھ کی گرفتاری:

۲ نومبر کو پیر کے دن دادری اور بہادر گڑھ کے حاکم بہادر جنگ خان گرفتار ہو کر آگئے اور قلعہ میں جہاں ٹھہرایا گیا ٹھہرے۔ ۷ نومبر کو سنیچر کے دن راجہ ناہر سنگھ حاکم بلب گڑھ کے آجانے سے قلعہ میں جو سردار مختلف مقامات پر ایک دوسرے سے دور مقیم تھے۔ ان میں ایک کا اور اضافہ ہوا۔

واضح ہو کر دہلی کی ایجنسی کے ماتحت جو جاگیریں ہیں وہ شمار میں ہفتے کے دنوں سے کم یا زیادہ نہیں ہیں (دہلی کے ماتحت سات جاگیریں ہیں) جھجر، بہادر گڑھ، بلب گڑھ، لوہارو، فرخ نگر، دوجانہ پاٹودی، ان میں سے پانچ جاگیروں کے حاکم جیسا کہ میں نے کہا قلعے میں موجود ہیں اور بقیہ دو جاگیردار پاٹودی اور دوجانہ خوف کے تیر کا نشانہ ہیں۔ دیکھو!

ان کی جہاں بین آنکھیں دنیا میں کیا دیکھتی ہیں اور کیا انجام ہوتا ہے۔

یہ بات پوشیدہ نہیں رہے گی کہ مظفر الدولہ سیف الدین حیدر خان جن کا لقب حسین مرزا ہے، اس ہنگامہ میں دوسرے با عزت لوگوں کی طرح بیوی بچوں کے ساتھ شہر سے باہر چلے گئے قیمتی سامان سے بھرے ہوئے گھر چھوڑ دیے اور صحرا نوردی اختیار کی۔ ان لوگوں کے کئی مکانات، محل اور ایوان ہیں باہم متصل۔ اتنے وسیع کہ اگر ان محلات وایوانات کی زمین کی پیمائش کی جائے تو شہر نہ سہی، ایک گاؤں کے برابر تو (رقبہ ہوگا) اتنے بڑے بڑے محل اس عالم میں کہ ان میں کوئی آدمی تھا ہی نہیں لوٹ مار (کرنے والوں کے ہاتھوں) صاف اور ویران ہو گئے۔

کچھ کم قیمت لیکن بھاری سامان جیسے ایوان کے پردے، شامیانے، سائبان، شطرنجیاں اور دوسرا فرش ان قیام گاہوں میں باقی رہ گیا تھا اچانک ایک رات، جس کی صبح کو رعبہ ناہر سنگھ گرفتار ہوئے، اس مکان میں آگ لگ گئی۔ لپٹیں اُٹھنے لگیں، لکڑی، پتھر، دیواریں سب جل گئیں۔ یہ عمارت مکان سے جانب مغرب اتنی قریب ہے کہ میں آدھی رات کو بھڑکتی ہوئی آگ کی روشنی چھت پر سے دیکھ رہا تھا اور دھوئیں کی گرمی میرے چہرے اور آنکھوں تک پہنچ رہی تھی۔ ہاں پڑوسی کے گھر سے (بلند ہونے والے) نغمے سوغات کی حیثیت رکھتے ہیں پھر پڑوسی کے گھر کی آگ راکھ کیوں نہ برسائے۔

شاہزادوں کی سرگزشت:

راقم حالات کے قلم کی جنبش (اس واقعے کے اثر سے) جو نیم مردہ چیونٹی کی رفتار کے برابر (سست ہے)۔ (صفحہ) کاغذ پر (اس حالت) کی کیا عکاسی کر سکتی ہے کہ نگاہیں اس کو دیکھ سکیں۔ شاہزادوں کے متعلق اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ بعض کو گولی ماردی گئی۔ (اس طرح) موت کے اژدھے نے ان کو نگل لیا۔ کچھ کی گردن میں پھانسی کا

پھندہ ڈال دیا گیا (اس طرح) رسن ودار کی کشاکش سے ان کی روح ٹھٹھر کر رہ گئی۔ چند افسردہ دل قید خانے میں ہیں اور بعض (عالم غربت میں) آوارہ پریشان پھر رہے ہیں۔ کمزور وضعیف بادشاہ پر مقدمہ چل رہا ہے۔

جاگیرداروں کا قتل:

جھجھر بلب گڑھ اور فرخ نگر کے جاگیرداروں کو علیحدہ علیحدہ مختلف دنوں میں پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ اس طرح (ان لوگوں کو) ہلاک کیا گیا کہ کوئی کہہ نہیں سکتا کہ خون بہایا گیا۔

جنوری ۱۸۵۸ء:

جنوری سنہ ۱۸۵۸ء کے آغاز میں ہندوؤں کو فرمانِ آزادی مل گیا اور (شہر میں) آباد ہونے کی اجازت دے دی گئی۔ یہ لوگ (ہندو) جہاں جہاں تھے شہر کی طرف چل پڑے۔ خانماں برباد مسلمانوں کے گھروں میں (خالی پڑا رہنے کے سبب سے) سبزہ اس قدر اُگ آیا ہے کہ در و دیوار سبز ہیں۔ ہر لحظہ سبزہ سر دیوار کی زبان سے یہ صدا آتی ہے کہ مسلمانوں کی جگہ بدستور خالی ہے۔

حکیم محمود خان کے متعلقین کی گرفتاری:

شاید بدخصلت مخبروں کے کہنے سے حاکم شہر کو یہ خیال ہوا ہوگا کہ راجہ نرندر سنگھ بہادر کے طبیبوں کا مکان مسلمانوں کی جائے پناہ اور جمع ہونے کی جگہ ہے۔ کوئی تعجب نہیں کہ (ان) بے ہودہ گو ہنگامہ ساز (مخبروں) میں سے ایک دو شخص اس محفل میں (موجود) بھی ہوں۔ اس خیال سے ۲ فروری کو منگل کے دن (حاکم شہر) کچھ سپاہیوں کے ساتھ اس جگہ آیا اور مکان کے مالکوں کو ساٹھ دوسرے نیک دل پناہ گزینوں کے ساتھ اپنے ہمراہ لے گیا اگرچہ کئی رات دن سب کو حوالات میں رکھا، لیکن باعزت لوگوں کی عزت کا بھی خیال رکھا۔

۵ فروری:

۵ فروری کو جمعہ کے دن حکیم محمود خان، حکیم مرتضیٰ خان اور ان کے بھتیجے عبدالحکیم خاں عرف حکیم کالے کو واپسی کی اجازت مل گئی ۱۲ فروری کو جمعہ کے دن چند دوسرے اشخاص ۱۳ فروری کو سنیچر کے دن تین شخص اور واپس آ گئے (لیکن) نصف سے زیادہ حوالات میں رہ گئے۔ یہ مصیبت جو پڑوس میں نازل ہوئی اور یہ ہنگامہ جو گلی میں برپا ہوا (اس کی وجہ سے) مجھ درویش غم زدہ کا دل بھی قابو میں نہیں۔ اس کے باوجود کہ اس دار و گیر میں مجھ سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا۔ ابھی تک (یہ عالم ہے) کہ دن بھر متفکر رہتا ہوں اور رات میں آرام کی نیند نہیں سو پاتا ہوں۔

قصیدہ در مدح سر جان لارنس:

فروری کے پرشوکت مہینے میں کہ اس زمانے سے ماہ فروری تک (جو موسم بہار کا پہلا مہینہ ہے) جس میں آفتاب کی رونق و روشنی بڑھ جاتی ہے سورج کو ابھی (برج حمل تک پہنچنے کے لیے) ایک مہینے کا سفر طے کرنا ہے۔ حکم مہرباں۔ خورشید طلعت، ستارہ حشم سر جان لارنس صاحب چیف کمشنر بہادر کے آنے کی خبر مشہور ہوئی چونکہ میرا یہ طریقہ رہا ہے کہ جو حاکم ہندوستان خصوصاً اس شہر (دہلی) میں آئیں۔ ان کی مدح میں قصیدہ لکھا جائے۔ اس بنا پر اس والا شکوہ (سر جان لارنس) کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھا جو تہنیت فتح اور خیر مقدم نوروز سے مشتمل تھا۔ اور ۱۹ فروری کی جمعہ کے دن بذریعہ ڈاک بھیجا۔

۲۰ فروری۔ خبر فتح لکھنؤ:

۲۰ فروری کو شام کے وقت ۲۱ دیو آواز" نہنگ آہنگ توپوں کی آواز آئی اور اتوار کی صبح کو شہر لکھنؤ کی فتح کی خوشخبری اس تفصیل کے ساتھ سننے میں آئی کہ ۱۶ فروری کو آسمان سروری کے اختر تابندہ، سپہ سالار نامور کمانڈر انچیف بہادر نے سیاہ رو، جنگ جو (باغیوں)

پر اس طرح حملہ کیا کہ آسمان کے سپہ سالار (مریخ) نے سلامت دست و بازو کی اتنی دعائیں دیں اور اس قدر تعریف کی اس کے ہونٹوں پر چھالے پڑ گئے اور زبان تھک گئی۔

دنیا کو آبادی کا مژدہ اور اہل دنیا کو نوید آزادی! کہ آزاد اور نیک ذات لوگوں (انگریزوں) کی آرزو پوری ہو گئی اور برے اور بدذات لوگوں کا دور دورہ وہاں بھی ختم ہو گیا پھر سننے میں آیا کہ توپوں کی گرج اور شہنائیوں کے نغمے (صرف) حصول طاقت، تھے فتح نصیب فوج کے بہادر اس طرح جنگ کے دوران میں شہر پر قابض نہیں ہوئے (بلکہ) دلیروں کی طرح دشمنوں سے لڑنے کے لیے دوڑ پڑے (دشمنوں کو) زخمی اور قتل کرنے کے بعد اپنے پڑاؤ کی طرف لوٹ آئے۔

۲۴ فروری۔ آمد چیف کمشنر:

۲۴ فروری کو بدھ کے دن ایک پہر دن چڑھے:

بوستان دار را آزاد سرو
آسمان جاہ را تابندہ ماہ

مبارک وقت میں باغ انصاف کے سرو آزاد آسمان رفعت کے ماہ تابندہ۔

فرخ طلعت، فرخندہ سیرت، ستارہ چشم، چیف کمشنر بہادر نے اپنے توسن کے سموں کے نشانات سے دہلی کی سرزمین کو آسمان کی طرح ستارہ زار بنا دیا۔ اور تیرہ توپوں کی (سلامی کی) آواز سے خستہ دلوں کو مرہم مہر و محبت کی بشارت دی۔

در کالبد شہر روان باز آمد
فرما نفر مالی شر نشاں باز آمد
زیں شادی رخوش دلی کے روداد شہر
گوئی کہ نگوشاہ جہان باز آمد

حاکم شاہ نشان (کیا) آئے کہ شہر کے (مردہ) جسم میں روح واپس آ گئی۔ شہر میں مسرت کی ایسی (لہر) دوڑ گئی ہے جیسے (شہنشاہ) شاہ جہاں واپس آ گئے ہوں۔

۲۷ فروری:

۲۷ فروری کو جب سنیچر کا دن ختم ہوا اور رات آئی۔ رات کے تین پہر گزر گئے (اس وقت) مظلوموں کے دل کا دھواں چاند پر اس طرح چھا گیا کہ دیکھنے والے بے اختیار چلا اٹھے کہ چاند گہن میں آ گیا۔ اسی سنیچر کو حکم دور باش ختم ہو گیا۔ انصاف چاہنے والے اور پریشان حال لوگوں کو حاضر ہونے کی اجازت اور خواہش مندوں کو پناہ دے دی گئی۔

بے شمار لوگوں کو پھانسی:

اس شہر میں قید خانہ شہر سے باہر ہے اور حوالات اندرون شہر۔ ان دونوں میں بے شمار لوگوں کو بھر دیا گیا ہے۔ ان محدود مقامات میں کثرتِ تعداد کو دیکھ کر) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آدمی میں آدمی سمایا جا رہا ہے۔ ان دونوں قید خانوں کے جن قیدیوں کو مختلف دنوں میں پھانسی دے دی گئی ہے۔ ان کی تعداد فرشتۂ موت ہی جانتا ہے شہر میں ایک ہزار سے زیادہ مسلمان نہیں پاؤ گے۔ میں بھی ان میں سے ایک ہوں جو لوگ شہر سے نکل کر چلے گئے ہیں ان میں سے کچھ لوگ اس قدر دور نکل گئے ہیں گویا وہ اس سرزمین (دہلی) کے باشندے تھے ہی نہیں۔ بہت سے عالی مرتبہ لوگ شہر کے ارد گرد دو دو چار چار کوس پر ٹیلوں گڑھوں، چھپروں، کچے مکانوں میں اپنے نصیب کی طرح آنکھیں بند کیے ہوئے پڑے ہیں۔ اس ویرانہ نشیں گروہ میں یا تو وہ لوگ ہیں جو شہر میں رہنے کے خواہش مند ہیں یا گرفتار لوگوں کے رشتہ دار ہیں یا خیرات خوار یعنی پنشن دار ہیں لوگوں کی درخواستوں میں رہائی۔ آباد اور اجرائے پنشن کے علاوہ اور کوئی (مضمون) نہیں پاؤ گے۔ دادخواہوں کی دو تین ہزار درخواستیں عدالت میں پہنچ چکی ہیں۔ یہ انصاف طلب چشم براہ اور گوش برآواز ہیں کہ کیا سننے

اور دیکھنے میں آتا ہے۔

۸ مارچ:

میں بھی اس نیاز نامے اور ستائش نامے کے جواب کا منتظر ہوں، جس کو میں نے بذریعہ ڈاک بھیجا تھا۔ مختلف خیالات پریشاں کے سبب سے حاکم (شہر کی جائے قیام پر جانے اور ملاقات کرنے کی کوئی صورت نہیں نکلی ہے مختصر یہ کہ (ہر اعتبار سے) ایسی مصیبتیں ہیں گویا (ہر طرف کانٹے ہی کانٹے ہیں۔ اگر باہر نکلو گے تو راستے میں (بچھے ہوئے) دیکھو گے۔ اگر گھر (ہی) میں بیٹھے رہو گے (تو معلوم ہوگا) کہ کپڑوں میں چھپے ہوئے ہیں (کسی طرح سکون نہیں ہے) ابھی تک صبر بے تابی پر غالب تھا کہ ۱۸ مارچ کو پیر کے دن وہ خط ایک تحریر کے ساتھ میرے پاس واپس آ گیا۔ خط کی پیشانی حاکم دانش آموز کے اس فرمان سے منور تھی کہ خط فریسندہ کو واپس کر دیا جائے تا کہ وہ حاکم شہر کے توسط سے ہمارے پاس بھیجے۔ سب نے کہا اور میں نے بھی سوچا کہ یہ پر فائدہ جواب امید افزا علامت ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میری (گزارشات) منظور ہو جائیں گی وہ خط جس پر مسطور تھا مناسب عبارت کے اضافے کے ساتھ سرور عادل، رعایا پرور، دانش مند، چارلس سانڈرس صاحب چیف کمشنر بہادر کے حضور میں بھیجا اور خط خاص طور پر نامور موصوف (چارلس سانڈرس) کے نام منسلک کر دیا جو خواہش دیرینہ یعنی اجرائے پنشن سے متعلق تھا۔

۱۷ مارچ:

۱۷ مارچ کو بدھ کے دن فرماں روا کے حضور سے پہلی خواہش کے بارے یہ حکم صادر ہوا کہ یہ خط جس میں تہنیت کے سوا کچھ نہیں ہے اس کے بھیجنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے بھی سوچا کہ ایسے پر آشوب حالات میں مہر و محبت اور مسرت و انبساط کی کیا گنجائش۔ میں تو بندہ شکم ہوں۔ مجھ کو تو روٹی چاہیے۔ دیکھوں اس دوسری خواہش کے

بارے میں کیا حکم ہوتا ہے۔

۱۸ مارچ۔ فتح لکھنؤ:

۱۸ مارچ کو جمعہ کے دن شام کے وقت روح کو توانائی بخشنے والی آواز توپ آسمان کے نیلے گنبد میں گونج اٹھی (جس سے) لکھنؤ کا فتح ہونا اور اس شہر میں کینہ خواہ انگیز فوج کا حسب دل خواہ پھیل جانا معلوم ہوا۔ اس شہر میں قلعہ، فصیل، دروازہ کچھ نہیں ہے یقیناً وہاں کے (باغیوں) کی فوج کے دیوار اس طرف کے بہادروں (انگریزوں) کا راستہ روکے ہوئے ہوگی۔ جب وہ کمزور دیوار بہادروں کی کوشش کی آندھی سے گر گئی ہوگی تو بالیقین سواروں اور پیادوں کے چلنے سے ہر راستے سے گرد و غبار بلند ہوا ہوگا۔ ہاں خدا اپنے فضل سے جس کو بادشاہت عطا کرتا ہے، اس کو فتح کرنے کی طاقت اور شان و شوکت بھی عطا کرتا ہے۔ اسی بناء پر جو شخص فرماں رواؤں کی نافرمانی کرتا ہے، وہ اس قابل ہے کہ اس کے سر پر جوتے لگیں۔ محکوم کا حاکم سے لڑنا (استالی) پر ہاتھ مارنا (اپنے آپ کو تباہ کرنا) ہے دنیا والوں کے لیے مناسب ہے کہ جب لوگوں کو خدا نے خوش بختی عطا کی ہے ان کے سامنے سر جھکا دیں اور فرماںرواؤں کے حکم کی تعمیل کو خدا کے حکم کی تعمیل سمجھیں۔ جب ہم کو یہ معلوم ہو گیا کہ خوش نصیبی حکومت اور طاقت کس کی بخشی ہوئی ہے تو پھر سرکشی اور بیزاری کیوں ہے۔ نغمہ طراز شیراز (سعدی) نے اس بات کو کیسے اچھے انداز سے ادا کیا ہے:

چہ کند بندہ کہ گردن نہبد فرمان را
چکند گوئی کہ تن درندہد چوگان را

گیند چوگان کی اطاعت کے سامنے سر نہیں جھکائے گا، تو کیا کرے گا، گیند چوگان کی اطاعت کے علاوہ کر بھی کیا سکتا ہے۔

۲۲ مارچ سے مجھ دیوانے کے دل میں یہ بات کھٹک رہی ہے کہ دنیا میں فروری کا

مہینہ اور نو روز کا دن بھی تھا اور وہ روز جہاں افروز (نو روز) انہیں دو چار تاریخوں میں ہوتا تھا۔ امسال شاید یہ شہر مژ دوں کا مسکن ہے کہ بہار کی آمد آمد پر نعرہ ہائے مسرت سننے میں نہیں آ رہے ہیں۔ کوئی نہیں کہتا کہ ہر سال کے "سال دوازدہ گانہ" میں سے کون سا سال ہے اور رات دن کے برابر ہونے کی ساعت کب آئے گی۔ اگر منجم مر گئے ہیں اور دن کے بادشاہ (آفتاب) کے سفر کا روزنامچہ تحریر (پیش گوئی آثار) سے خالی رہ گیا تو یہ سمجھو کہ چند جھوٹ بولنے والے کم ہو گئے اور یہ فرض کر لو کہ چند جھوٹی باتیں سنی ہی نہیں۔ آفتاب برج حمل میں قیام (تحویل) کو بھولا نہیں ہے کہ سبزہ نہ اگے اور پھول نہ کھلیں اصول آفرینش بدلتے نہیں ہیں۔ آسمان مقررہ اصول گردش کے خلاف عمل نہیں کر سکتا۔

میں باغ پر نہیں، اپنے اوپر آنسو بہا رہا ہوں مجھے موسم بہار کی کوئی شکایت نہیں ہے۔ اپنی بدقسمتی کا شکوہ کر رہا ہوں:

جہاں از گل و لالہ پر بوی و رنگ
من و گوشہ دا نہی زیر سنگ
بہاراں و من ماندہ بے برگ و ساز
در خانہ از بے نوائے فراز

دنیا لالہ کے پھولوں سے رنگین اور گلاب کے پھولوں کی خوشبو سے معطر ہے (لیکن) میں ایک گوشے میں مجبور و بے سروسامان ہوں، مفلسی کے سبب سے گھر کا دروازہ بند ہے۔

روانگی محمود خان:

میں روتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ زمانہ بہت بے پروا ہے۔ میں زاویہ نشین غم و آلام اگر سبزہ و گل کو نہیں دیکھوں گا اور دماغ کو پھولوں کی خوشبو سے معطر نہیں کروں گا تو بہار میں کیا

کمی آ جائے گی اور ہوا سے کون تاوان لے گا؟

اپریل کے مہینے میں جس میں دو ثلث ماہ فروردین کے اور ایک ثلث ماہ اردی کا ہے۔ حکیم محمود خان کے ساتھ جو لوگ قید خانے میں باقی تھے، رہا ہو گئے ہر ایک نے اپنا راستہ لیا وہ ناز پروردہ، صاف طینت (حکیم محمود خان) سارے رشتے داروں، بیوی بچوں اور متعلقین کے ساتھ پٹیالے کی طرف چلا گیا کہتے ہیں ابھی تک وہ کرنال میں مقیم ہیں معلوم نہیں آئندہ کے لیے کیا سوچا ہے۔

فتح مراد آباد:

مئی کے شروع میں کانوں کو یہ خبر سننے کا فخر حاصل ہوا کہ سپاہ کینہ خواہ کے بہادروں نے مراد آباد کو فتح کر لیا جو بداندیش (باغیوں) کی گزرگاہ تھا اور اس شہر کو انصاف سے آراستہ کرنے کے لیے عالی نسب سرچشمۂ علم و دانش، نواب یوسف علی خان بہادر کے حوالہ کر دیا۔ آج کل (نواب یوسف علی خان) جو دنیا کو فتح کرنے اور دنیا پر حکومت کرنے کے اہل ہیں۔ اس علاقے پر تعمیل حکم کے طور پر فرمانروائی کر رہے ہیں اور مجھ کو امید ہے کہ ہمیشہ فرماں روائی کرتے رہیں گے۔

فتح بریلی:

اس کے علاوہ کہتے ہیں کہ کوہ شگاف اور اژدھا شکار فوج نے جب (بریلی و مراد آباد) کے اس علاقے پر یورش کی تو بریلی کے گناہ گار (باغیوں) کو اس طرح نکال باہر کیا۔ جیسے طاقت ور موجیں خس و خاشاک کو کنارے پر پھینک دیتی ہیں۔ اس صورتحال کو (دیکھتے ہوئے) توقع ہے کہ جو گراں جان (باغی) اِدھر اُدھر باقی رہ گئے ہیں شہروں، گاؤں میں لوگوں کو پریشان کرتے ہیں اور راستہ چلنے والوں کو ستاتے ہیں ان کا دور دورہ بھی جلد ختم ہو جائے گا اور سارا ملک حاکمانِ عادل (انگریز) کے پرچم کے زیر سایہ آ جائے گا۔

۱۳جون۔احوال بہادر جنگ خان:

۱۳جون کو اتوار کے دن شام کے وقت حاکم شہر نے بہادر جنگ خاں کو اپنے پاس بلایا جو قلعہ میں نظر بند تھے وہ بڑی امیدوں کے ساتھ گئے۔ جاں بخشی اور ایک ہزار ماہانہ وظیفہ (مقرر کیے جانے) کی خوشخبری سنائی گئی اور حکم ہوا کہ لاہور کی طرف چلے جائیں۔ اس کے بعد آزادی کی زندگی بسر ہوگی اور اسی شہر (لاہور) میں رہنا ہوگا۔ بے شک ان حالات میں مناسب یہی ہے کہ وہ (بہادر جنگ خان) جاہ و دولت کے غم و افسوس سے آزاد ہو جائیں اور اس آزادی پر مسرور و مطمئن ہوں۔

فتح گوالیار:

دن کا شہنشاہ، (آفتاب) جس کا سر روزانہ نیزے پر گھمایا جاتا ہے ابھی افق مشرق سے بہ قدر یک نیزہ بلند نہیں ہوا تھا کہ ماہ جون کے گزرے ہوئے دنوں کی تعداد کے برابر رعد کی طرح گرجنے والی توپوں کی آواز بلند ہوئی (۲۱ ضرب توپ سے مراد ہے) جس نے دوستوں کے دل کو مسرت و شادمانی سے معمور کر دیا اور آگ سے زیادہ جلانے والی (غم کی) راکھ دشمنوں کے سر اور چہرے پر ڈال دی۔ گوالیار کا شہر فتح ہو جانے اور اس سنگین قلعہ کے ہاتھ آ جانے کی خوش خبری جو زمین کا جگر گوشہ اور پہاڑ کا لخت جگر ہے، خدا کے دربار سے سرکشوں کی موت کا پروانہ لائی (اس مژدۂ پر مسرت نے) حاکموں اور فرماں برداروں کو آرزوؤں کے چراغ جل اٹھنے (آرزوئیں پوری ہو جانے) کی بشارت دی۔

یہ داستان یوں ہے کہ باغیوں نے گوالیار پر قبضہ کر لیا۔ فرماں روائے گوالیار مہاراجہ جیاجی راؤ حکومت اور شہر دونوں کو چھوڑ کر آگے چلے گئے اور انگریزوں سے مدد چاہی (انگریزوں) سے امدادی فوج لے کر اپنے وطن کی طرف گئے اور فتح حاصل کی (باغیوں

نے) بھاگم بھاگ ہر طرف سے گوالیار کا رخ کیا (تھا) یہاں ایسی شکست فاش ہوئی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان گمراہوں کا انجام یہ ہوگا کہ بدحالی و پژمردگی کے ساتھ ادھر ادھر لوٹ مار کرتے پھریں گے اور آخرکار جگہ جگہ ذلت وخواری کے ساتھ مارے جائیں گے ان کے صحرانورد گھوڑوں کو بے آب وگیاہ میدانوں میں زمین پر پڑا ہوا (مردہ) دیکھو گے اور اس گروہ کے ساز و سامان کو گزرگاہوں میں بکھرا ہوا پاؤ گے پھر ہندوستان خس و خار (ظلم وستم) سے ایسا پاک ہو جائے گا کہ جنگل کا ہر گوشہ باغ کی طرح سرسبز ہوگا اور ہر رہ گزر بازار کی طرح پر رونق نظر آئے گی۔

راقم الحروف کی زندگی کے تریسٹھ سال گزر چکے ہیں۔ ان طرح طرح کے روح فرساغموں کے (سبب) سے ظاہر ہے کہ اب زمانے سے زیادہ فرصت (عمر) کی توقع بے جا ہے مجبوراً سحر نگار شیراز (سعدی) رحمۃ اللہ علیہ کے اشعار کو دہراتا ہوں اور جس طرح ایک غم نصیب دوسرے غمزدہ شخص سے نصیحت حاصل کرتا ہے ان اشعار کو پڑھ کر اگر دل کو خوش نہیں کر سکتا ہوں تو کم سے کم قید رنج وغم سے آزاد تو کر ہی لوں گا۔

دریغا کہ بی ما بسی روزگار
بروید گل و بشگفد نو بہار
بسی تیر و دیماہ دار دی بہشت
بیاید کہ ماخاک باشیم و خشت

افسوس! ہمارے بغیر اس دنیا میں بارہا بہاریں آئیں گی اور پھول کھلیں گے۔ تیر دے اور اردی بہشت کے مہینے بار بار آئیں گے۔

جبکہ ہم (قبر میں) خاک ہو چکے ہوں گے۔

فی الحقیقت سچی بات کو چھپانا اچھے لوگوں کا طریقہ نہیں ہے۔ میں نیم مسلمان مذہبی پابندیوں سے آزاد ہوں، اور بدنامی و رسوائی کے رنج سے بے نیاز۔ ہمیشہ سے رات

میں صرف ولایتی شراب پینے کی عادت تھی۔ ولایتی شراب نہیں ملتی تھی تو نیند نہیں آتی تھی۔ آج کل جبکہ انگریزی شراب شہر میں بہت مہنگی ہے اور میں بالکل مفلس ہوں۔ اگر خدا دوست، خداشناس، فیاض، دریادل، مہیش داس، دیسی شراب قند جو رنگ میں ولایتی شراب کے برابر اور بو میں اس سے بڑھ کر ہے بھیج کر آتش دل کو سرد نہ کرتے تو میں زندہ نہیں رہتا۔ اسی عالم جگر تشنگی میں مر جاتا۔

از دیر ولم دایہ زہر در می جست
از بادہ ناب یکدو ساغر می جست
فرزانہ مہیس داس تجدید بمن
آبی کہ برای خود سکندر می جست

عرصے سے دل چاہتا تھا کہ کس طرح میری آرزو پوری ہو جائے (آرزو یہ تھی کہ) شراب ناب کے ایک دو ساگر مل جائیں دانش مند مہیش داس نے مجھ کو وہ آب (حیات) بخش دیا۔ جس کو سکندر نے اپنے لیے ڈھونڈا تھا۔

یہ بات کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس نیکی پسند شخص (مہیش داس) نے (شہر میں) مسلمانوں کی آبادکاری کے متعلق کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ چونکہ خدا کی مرضی نہیں تھی۔ کوشش کارگر نہیں ہوئی۔ سب جانتے ہیں کہ (شہر میں) ہندوؤں کا آزادی کے ساتھ رہنا مہربان حاکموں کی محبت اور مہربانی کا نتیجہ ہے بہر حال اس نیکی پسند بہی خواہ (مہیش داس) کا اس انتظام میں دخل رہا ہے۔ قصہ مختصر خوش نصیب شخص ہے۔ لوگوں کے ساتھ نیکی کرتا ہے زندگی عیش و مسرت کے ساتھ گزارتا اگرچہ مجھ سے بہت پرانی شناسائی نہیں ہے اتفاقاً کبھی ملاقات اور بات چیت ہو جاتی ہے اور کبھی کبھی کوئی تحفہ بھیج کر مجھ کو ممنون کرتا ہے۔

ہندو شاگردوں اور دوستوں کی امداد کا اعتراف:

میرے دوسرے متعلقین اور شاگردوں میں سے ہیرا سنگھ، جو ایک نیک نام نوجوان اور تعلقات کا بہت خیال رکھنے والا ہے (برابر آتا ہے) اور میرا غم غلط کرتا ہے۔ اس نصف آباد نصف ویران شہر کے لوگوں میں کسے عالی نسب شیوجی رام برہمن، جو ایک عقل مند نوجوان ہے اور مجھ کو بیٹے کی طرح عزیز ہے مجھ درویش غم زدہ کو بہت کم تنہا چھوڑتا ہے فرمانبرداری اور کارسازی کی کوشش کرتا ہے۔ اس کا لڑکا بال مکند جو ایک پرہیزگار اور خوش اخلاق نوجوان ہے اپنے والد کی طرح تعمیل حکم میں مستعد اور غم گساروں میں یکتا ہے۔

دور دراز کے دوستوں میں سے (ایک دوست) آسمان محبت کی ماہ کامل شیوا بیان ہر گوپال تفتہ (بھی ہیں) جو میرے پرانے مونس و ہمدم ہیں اور اس بناء پر کہ مجھ کو اپنا استاد کہتے ہیں۔ ان کا کلام ساری خداداد خوبیوں کے ساتھ میرے لیے سرمایہ ناز ہے مختصر یہ کہ بہت اچھے آدمی ہیں۔ سرتاپا محبت و اخلاص، شاعری سے ان کو فروغ (شہرت) حاصل ہے اور ان کے دم سے شاعری کے ہنگامے گرم رہتے ہیں انتہائے محبت سے میں نے ان کو اپنا جز و روح سمجھ لیا ہے اور "مرزا تفتہ" خطاب دیا ہے۔ انہوں نے میرٹھ سے ایک ہنڈی میرے پاس بھیجی نیز غزل اور خط برابر بھیجتے رہتے ہیں۔

یہ باتیں جن کا لکھنا لازمی نہیں تھا، صرف اس لیے لکھیں کہ ان لوگوں کی فیاضی اور محبت کا شکریہ ادا ہو جائے۔ نیز اس لیے بھی لکھیں کہ جب یہ داستان دوستوں کے ہاتھوں میں آئے تو وہ سمجھ لیں کہ شہر مسلمانوں سے خالی ہے راتوں کو ان لوگوں کے گھر چراغ سے محروم رہتے ہیں اور دن میں دیواروں کے روزن دھوئیں سے۔ غالب جس کے شہر میں ہزاروں دوست تھے۔ ہر گھر میں شناسا اور واقف کار موجود تھے۔ اس تنہائی میں قلم کے سوا کوئی اس کا ہم زبان اور (اپنے) کے علاوہ کوئی ساتھی نہیں ہے۔

اکنوں منم کہ رنگ برویم نیسر سد
تاریخ بخون دیدہ نشویم ہزار بار
در پیکرم ز درد و دریغ است جان و دل
در بسترم زخارہ و خار است پود و تار

اب میرے چہرے پر اس وقت تک آب و رنگ نہیں آتا ہے جب تک کہ ہزار بار اشک وخوں سے چہرے کو تر نہ کروں۔ میرے جسم میں غم و افسوس جان و دل بن گئے ہیں اور میرے بستر کا تانا بانا کانٹوں سے تیار ہوا ہے۔

گھر کی تباہی:

اگر شہر میں یہ چاروں شخص نہ ہوتے تو کوئی شخص میری بے کسی کا گواہ بھی نہ ہوتا۔ گردش روزگار پر رشک آتا ہے کہ اس لوٹ مار میں جبکہ شہر کے کسی گھر میں مٹی بھی نہیں بچی۔ اگرچہ میرا گھر لوٹ مار کرنے والوں کی دراز دستی سے محفوظ رہا لیکن میں قسم کھا سکتا ہوں کہ بستر اور پہننے کے کپڑوں کے علاوہ گھر میں کچھ نہیں رہا۔ اس عقیدۂ دشوار کا حل اور اس دروغ نما سچ کی حقیقت یہ ہے کہ جس وقت کالوں (باغیوں) نے شہر پر قبضہ کیا۔ بیگم نے مجھ سے کہے بغیر قیمتی چیزیں زیور وغیرہ جو کچھ تھا خفیہ طور پر کالے صاحب پیرزادہ کے یہاں بھیج دیا۔ وہاں تہہ خانے میں محفوظ کر دیا گیا اور دروازہ مٹی سے پاٹ دیا گیا۔

جب فاتح انگریزوں نے شہر کو فتح کیا اور سپاہیوں کو لوٹ مار کا حکم مل گیا۔ تب بیگم نے یہ راز مجھ سے کہا۔ وقت نکل چکا تھا وہاں تک جانے اور سامان لانے کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ میں خاموش ہو گیا اور دل کو سمجھا لیا کہ یہ چیزیں جانے والے ہی تھیں۔ اچھا ہوا کہ میرے گھر سے نہیں گئیں۔

تنگ دستی و مجبوری:

اب یہ جولائی کا چدرھواں مہینہ ہے۔ قدیم پنشن جو سرکار انگریزی سے ملتی تھی اس کے ملنے کا کوئی ذریعہ نہیں نکلا۔ بستر اور کپڑے بیچ بیچ کر زندگی گزار رہا ہوں گویا دوسرے لوگ روٹی کھاتے ہیں میں کپڑے کھاتا ہوں۔ ڈرتا ہوں کہ جب کپڑے سب بیچ کر کھالوں گا، عالم برہنگی میں بھوک سے مرجاؤں گا۔

اس قیامت میں پرانے نوکروں میں سے دو تین نوکر میرے پاس سے نہیں گئے ان کی بھی پرورش کرنا ہے انصاف کی بات تو یہ ہے کہ آدمی آدمی کے بغیر رہ نہیں سکتا۔ نوکر کے بغیر کوئی کام نہیں ہوسکتا۔ اس گروہ ملازمین کے علاوہ دوسرے ضرورت مند جو ہمیشہ سے مجھ سے کچھ نہ کچھ فائدہ اٹھانے کے عادی ہیں۔ اس برے وقت میں بھی اپنی روح فرسا آواز (سوال) سے مرغ کی صدائے بے ہنگام سے زیادہ تکلیف پہنچاتے ہیں۔

اب جبکہ جسمانی تکلیفوں کے دباؤ اور روحانی اذیتوں کی گداختی نے جسم و جان کو تباہ کر دیا ہے۔ یکا یک دل میں خیال آیا کہ اس کھلونے کو آراستہ کرنے میں جس کا نام تصنیف ہے، کب تک مشغول رہا جاسکتا ہے۔ یقیناً اس کش مکش کا انجام یا تو موت ہے یا بھیک مانگنا، پہلی، صورت میں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوگا کہ یہ داستان ہمیشہ کے لیے انجام و اختتام سے محروم اور پڑھنے والوں کے دلوں کو افسردہ کرے۔

دوسری صورت میں یہ بات ظاہر ہے کہ اس ساری داستان میں اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا کہ فلاں گلی سے سر بازار دھتکار دیا گیا اور فلاں دروازے پر کچھ مل گیا۔ پھر یہ باتیں کب تک بیان کی جاسکتی ہیں اور اپنے آپ کو کہاں تک رسوا کیا جاسکتا ہے۔ باقی پنشن اگر مل گئی۔ تب بھی آئینہ دل سے زنگ غم صاف نہیں ہو سکے گا۔ قرض ادا نہیں ہوگا اگر نہیں ملی، اس صورت میں شیشہ پتھر سے چور چور ہو جائے گا۔ (تباہی یقینی ہے) اور سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ دونوں صورتوں میں چونکہ یہاں (دہلی) کی

آب و ہوا مصیبت زدہ لوگوں کو سازگار نہیں آتی۔ یقیناً شہر سے بھاگنا ہوگا اور کسی دوسرے شہر میں رہنا ہوگا۔

تفصیل وقائع دستنبو:

مئی سال گزشتہ سے لے کر جولائی ۱۸۵۸ء تک کی روداد میں نے لکھی ہے یکم اگست سے قلم ہاتھ سے رکھ دیا ہے۔ کاش میری ان تین خواہشوں یعنی خطاب خلعت اور پنشن کے اجراء کا حکم شہنشاہ فیروز بخت سے آجائے جن کے متعلق میں نے اس تحریر میں سبھی کچھ لکھا ہے۔ میری آنکھیں اور میرا دل انہیں کی طرف لگا ہوا ہے وہ شہنشاہ کہ چاند جس کے سر کا تاج ہے، آسمان جس کا تخت ہے جمشید نشان، فریدوں فر، کاؤس مرتبہ سنجر شکوہ، سکندر حشم، وہ شہنشاہ کہ شاہ روم سے بات کے لیے اس کا شکر گزار رہے کہ اس کے تخت و تاج کی عزت رہ گئی فرماں روائے روس کا دل اس کی لشکر کشی سے خوف سے دو نیم ہے۔ آفتاب اس خیال سے کہ (یہ) جہاں سوزی اس کی ناراضی کا سبب ہے، اگر ڈرتا نہیں ہے تو پھر وہ کیوں ہر لحظہ کانپتا رہتا ہے اور ماہِ کامل اس اندیشے سے کہ دنیا کو منور کرنے میں اس کی برابری کا احتمال ہے اگر اپنی گستاخی کی معافی نہیں چاہتا ہے تو پھر کیوں ہر رات خوف سے گھٹتا رہتا ہے۔

خداوند تیغ و نگیں و نشاں
شہنشاہ شاہی وہ، شہ نشاں
خرد مند فرخ رخ نیک خوئی
زنو شیرواں برد در داد گوئی
درخشاں درخشی کہ جمشید داشت
ندانی کہ از بہر جاوید داشت

بدان داشت تا اندرین روزگار
سپار و بدیں نامور شہر یار
زخسرو ترنج زرد ہفت گنج
رہ آورد شاہ است دست رنج
خود آں تخت کش باد بردی بدوش
بہ شہ پیش کش کردہ "فرخ سروش"
نہ بینی کہ در کوہ از مغز سنگ
برآید ہمہ گوہر رنگ رنگ
بود مہر را چشم بر افسرش
وگرنہ چہ کار است با گوہرش
گر آہنگ گوہر فشانی کند
چناں در فشاندن روانی کند
کہ آں گوہر ارد اگر در شمار
شود سودہ انگشت گوہر شمار
زبیم شپاہش کہ گاہ نبرد
برآروز دریا و کہسار گرد
بکوہ اژدھا و بدریا نہنگ
دہد جاں در آب و زند سر بسنگ
زفرو شکوہ نمایان او
خدیوان گیتی گدایان او

بہ افروزش و بخشش بے دریغ
درخشندہ خورشید دربارندہ میغ
بہ فرگفت بخشش خوددور نواز
بفرتاب دانش خرد مند ساز
بخشش شگرف و بدانش رسا
جہاں دار فرزانہ وکتوریا!
کہ یزدان پاکش نگہدار باد
انگشش دریں بزم بسیار باد

(ترجمہ)

وہ مالک تیغ و نگیں و علم ہے۔ وہ شہنشاہ سلطنت بخش اور بادشاہ ساز ہے۔

صاحب دانش، فرخ طلعت اور نیک خو ہے۔ اس کا مرتبہ انصاف میں نوشیرواں سے بلند تر ہے۔ جمشید کے پاس جو درخشاں علم تھا وہ اس لیے اس کو حفاظت سے رکھتا تھا کہ ملکہ نامور کے سپرد کر دے۔ خسرو کی طرف سے ترنج زر اور اس کے ساتوں خزانے بغیر زحمت اٹھائے ہوئے ملکہ کو بطور تحفہ ملے۔

وہ تخت (سلیمان) جس کو ہوا اپنے کاندھوں پر لے جاتی تھی، فرشتۂ غیب نے ملکہ کے سامنے بطور پیش کش پیش کیا ہے۔

تم نہیں دیکھتے ہو کہ پہاڑوں پر پتھروں کے جگر سے گوہر رنگا رنگ برآمد ہوتے ہیں۔ سورج کو اس کے تاج کا خیال رہتا ہے ورنہ اسے موتیوں سے کیا کام۔

اگر وہ (ملکہ وکٹوریہ) موتی لٹانے کا ارادہ کریں اور لٹائیں تو کثرت بخشش سے یہ حالت ہوگی کہ اگر کوئی شخص ان موتیوں کو شمار کرنا چاہے گا تو شمار کرتے کرتے اس کی انگلیاں گھس جائیں گی۔

اس کی فوج کے خوف سے جو لڑائی کے وقت دریاؤں اور پہاڑوں کو تباہ کر دیتی ہے۔ پہاڑوں میں اژدھے اور دریاؤں میں نہنگ سر پٹک کر مر جائیں گے۔

اس کی شان و شوکت کا یہ عالم ہے کہ بڑے بڑے بادشاہ اس کے در کے گدا ہیں۔

اس کی ضیا بخشی اور کرم بے دریغ کا یہ فیض ہے کہ یہ سورج روشن ہے اور بادل میں برسنے کی صلاحیت ہے۔

وہ کرم اور فیاضی سے اہل علم و دانش کو نوازتی ہیں اور ان کی دانشمندی کی برکت سے دوسرے لوگ صاحب خرد ہو جاتے ہیں۔ ان کی سخاوت حیرت آفریں ہے اور ان کی عقل رسا۔ ان کا نام ملکہ، لم وکٹوریہ ہے۔

خدائے پاک ان کا نگہبان رہے، خدا کرے اس محفل ہستی میں ان کا قیام دیر تک رہے۔

اگر ملکہ عالم کی بخشش سے میں کچھ حاصل کر لوں گا تو دنیا سے ناکام نہیں جاؤں گا۔

چوں نگارش بدیں نشان پیوست
تن زدم، داستان نمی خواہم

جب بات یہاں تک آ پہنچی تو میں خاموش ہو گیا میں داستان کہنا نہیں چاہتا ہوں۔

مکمل ہونے کے بعد اس کتاب کا نام دستنبو رکھا گیا یہ کتاب لوگوں کو دی گئی اور ادھر اُدھر بھیجی گئی تا کہ صاحبانِ علم و دانش کی روح کو تسکین بخشے۔ اور انشاء پرداز انداز نگارش پر فریفتہ ہو جائیں۔ امید ہے کہ یہ مجموعہ دانش (دستنبو) انصاف پسند لوگوں کے ہاتھوں میں گلدستہ رنگ و بو ہوگا۔ اور شیطان فطرت لوگوں کی نگاہوں میں آتشیں گیند۔ آمین!

زیں ساں کہ ہمیشہ در روانی مائیم
سر چشمۂ راز آسمانی مائیم

بخشی ز دساتیر بود نامۂ ما
ساسان ششم بہ کاروانی مائیم

جب بات یہاں تک رواں رہتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم رازہائے آسمانی کا سرچشمہ ہیں۔ یہ کتاب دساتیر ہی کا ایک حصہ ہے اس کاروانی کے لحاظ سے (گویا) ہم ساسان ششم ہیں۔

تمام شد

اس کتاب کو بغیر مہتمم مفید خلائق کے کوئی صاحب چھاپنے کا ارادہ نہ کریں۔ فقط: قطعۂ تاریخ:

آغاز کتاب از میرزا حاتم علی بیگ مہر تخلص سلمہ اللہ تعالیٰ:

اسد اللہ خاں غالب، مہر
حبذا زور قسم چہ دشنبو
نامہ خود سال خویش را و نشان
یدِ بیضا ستم چہ دشنبو

۱۸۵۷ء

قطعہ تاریخ:

انجام کتاب از میرزا تفتہ سلمہ اللہ تعالیٰ

کتابی زور ستم غالب کہ آں را
بجان و دل جہان گشت طالب
تو ششم تفتہ سال اختتامش

بیا بنگر چہ دشنبوئے غالب

۱۸۵۸ء

لاف دانش غلط و نفع عبادت معلوم
دردِ یک ساغر غفلت ہے چہ دنیا و چہ دیں
دیر و حرم آئینہ تکرار تمنا
واماندگی شوق تراشے ہے پناہیں
تو، اور آرائش خم کاکل
میں، اور اندیشہ ہائے دور و دراز
(غالبؔ)

(افکار۔ غالب نمبر ۱۹۶۹ء)

ضمیمہ۔ ج

محاسن کلامِ غالب

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری (مرحوم)

گر شعر و سخن بدہر آئیں بودے
دیوان مرا شہرت پرویں بودے
غالبؔ اگر ایں فن سخن دیں بودے
آں دین را ایزدی کتاب ایں بودے

ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں۔ مقدس وید اور دیوان غالبؔ۔

لوح سے تمت تک مشکل سے سو صفحے ہیں لیکن کیا ہے جو یہاں حاضر نہیں کون سا نغمہ ہے جو اس زندگی کے تاروں میں بیدار یا خوابیدہ موجود نہیں ہے۔ شاعری کو اکثر شعراء نے اپنی اپنی حد نگاہ کے مطابق حقیقت اور مجاز، جذبہ اور وجدان، ذہن اور تخیل کے لحاظ سے تقسیم کیا ہے۔ مگر یہ تقسیم خود ان کی نارسی کی دلیل ہے۔ شاعری انکشاف حیات ہے۔ جس طرح زندگی اپنی نمو میں محدود نہیں۔ شاعری بھی اپنے اظہار میں لاتعین ہے۔

جمالِ الٰہی ہر شے میں رونما ہوتا ہے۔ آفرینش کی قدرت جو صفات باری میں سے ہے شاعر کو بھی ارزانی کی گئی ہے۔ جہاں ملائکہ کارخانۂ ایزدی میں پوشیدہ حسن آفرینی میں مصروف ہیں۔ شاعر یہ کام علی الاعلان کرتا ہے۔

اس لحاظ سے مرزا کو ایک رب النوع تسلیم کرنا لازم آتا ہے۔ غالبؔ نے بزم ہستی میں جو فانوس خیال روشن کیا ہے کون سا 'پیکر تصویر' ہے جو اس کے 'کاغذی پیراہن' پر منازل زیست قطع کرتا ہوا نظر نہیں آتا۔

(۲)

اگر ادبی حیثیت سے غور کیا جائے تو دیوان غالب یکتا ہے۔ بلاغت یعنی تقلیل الفاظ بلا اختلال معنی اس سے زیادہ محال ہے کہیں کوئی ایک لفظ بھی ایسا نہیں جس کو پر کن کہا جا سکے۔ فصاحت کی یہ کیفیت ہے گویا دریائے لطافت رواں ہے۔

اگر بوطیقا کی رو سے لحاظ کیا جائے تو یہ کتاب اپنا آپ جواب ہے۔ شعر کی بنیاد عروض پر قائم ہے۔ عروض موزونیت کی میزان میں الفاظ کے تولنے کا نام ہے نقطۂ تعدیل کو پانے کے لیے صدہا نازک سے نازک اور گراں سے گراں اوزان سے کام لیا جاتا ہے۔ یہ اوزان شاعری نے موسیقی سے مستعار لیے ہیں۔ کوئی آسان سے آسان اور مشکل سے مشکل بحر ایسی نہیں جس میں مرزا نے کلام موزوں نہ کیا ہو۔ جہاں ان کے ہاں وہ بحریں ہیں جو خط مستقیم سے مماثل ہیں وہیں وہ بحریں بھی ہیں جن کی صورت از روئے اقلیدس خطوط منحنی اور دوائر سے مشابہ ہے جہاں رواں بحریں موجود ہیں وہیں افتاں وخیزاں بحریں بھی ہیں۔ مثلاً

کہتے ہیں نہ دیں گے دل اگر پڑا پایا
دل کہاں کہ گم کیجئے ہم نے مدعا پایا

کارگاہ ہستی میں لالہ داغ ساماں ہے
برق خرمن راحت خون گرم دہقاں ہے

آ کہ مری جان کو قرار نہیں ہے
طاقت بیداد انتظار نہیں ہے

عجب نشاط سے جلاد کے چلے ہیں ہم آگے
کہ اپنے سائے سے سر پاؤں سے ہے دو قدم آگے

بہت سے شعراء جن میں استاد شامل ہیں عروض کو شعر کی تکمیل کے لیے کافی خیال کرتے ہیں اور یہ نہیں جانتے کہ عروض کا مدعا اس موسیقی کی طرف سامعہ کو رہنما کرنا ہے جو قالب شعر کو اپنے دخل سے زندہ کرتی ہے اگر شعر از روئے مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن درست ہو لیکن آہنگ تشنہ رہ جائے تو خام ہے۔ ایسا شعر مثل ایک آئینہ کے ہے جو گلخن سے سالم اور درست باہر آئے لیکن صیقل سے محروم رہے۔

مرزا غالب کے لیے شاعری ہے۔ یہی باعث ہے کہ دیوان کا ہر مصرع تار رباب نظر آتا ہے۔ اوزان رمل میں فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلات ایک نہایت مستعمل بحر ہے۔ الفاظ نہایت آسانی سے اس کا جامہ قبول کر لیتے ہیں۔ شعرائے اردو اکثر اس کو کام میں لاتے ہیں لیکن عیب اس میں یہ ہے کہ مصرعوں میں رقص صوتی کم پیدا ہوتا ہے مثلاً یہ فارسی شعر:

ہر کہ خواہد گو بیا و ہر کہ خواہد گو برو
گیر و دار حاجت و درباں دریں دربار نیست

جو وصل و ترکیب کی بیش بہا مثال ہے۔ باوجود استاد کی کاوش و کاہش کے معیار رسا نہیں ہوا۔ اس کے مقابلے میں یہ ترانہ ریز شعر ملاحظہ ہو:

ہم نشیں مت کہہ کہ برہم کر نہ بزم عیش دوست
واں تو میرے نالہ کو بھی اعتبار نغمہ ہے

غالب کے شعر کی یہ موسیقی کی خوبی بلا امداد ساز ترنم کے ترتیل سے دریافت ہو سکتی ہے۔

(۳)

تنازع للبقا میں مغلوب ہو کر ایشیائی ایسا مرعوب ہو گئے ہیں کہ اپنے ہر فعل و خیال کا موازنہ مغربی اقوال و آراء سے کرنے لگے ہیں۔ یہ وہ خرابی ہے جس کی زنجیروں کو تلوار بھی نہیں کاٹ سکتی۔ پس کیا تعجب ہے اگر اس یورپ زدگی کے زمانے میں طالب علم اور

انگریزی تعلیم یافتہ مرزا غالب کا شیکسپیئر (Shakspeare) ورڈس ورتھ (Words Worth) ٹینی سن (Tenny Son) سے مقابلہ کرتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔ افسوس یہ کوتاہ نظریہ نہیں جانتے کہ شاعری اور تنقید پر کیا نادانستہ ظلم ہوتا ہے۔

صلاح الدین خدا بخش نے غالبؔ کا مقابلہ ہائن رش ہائی (Heinsich Heine) الپانی شاعر سے کیا ہے۔ کہاں ہائن رش ہائی نے محض مغنی جو عشق والفت کے مضامین بصورت قطعات افسردگی کے ساتھ بیان کر کے خاموش ہو جاتا ہے کہاں غالب جو دنیا کو اطلس کی مثال اپنے شانوں پر اٹھائے ہوئے ہے اور جس کا سرود سیارہ بہ سیارہ ہوتا ہوا فلک الافلاک تک پہنچتا ہے۔

مرزا غالب کا صحیح اندازہ قائم کرنا خود ایک بلند پایہ شاعری کا کام تھا۔ اقبال نے بجا کہا ہے۔

آہ تو اجڑی ہوئی دلی میں آرامیدہ ہے
گلشن دیمر میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے

دنیا میں اگر کسی شاعر سے غالبؔ کا مقابلہ ہوسکتا ہے تو وہ شعرائے المانیہ سرتاج یوحنا ولف گانگ فان گوئٹے المعروف بہ گوئٹے Johann Wolf Gang Vongoethe ہے۔

غالبؔ اور گوئٹے (Goethe) دونوں کی ہستی انسانی تصور کی آخری حدود کا پتا دیتی ہے۔ شاعری کا دونوں پر خاتمہ ہو گیا ہے۔ عتیق اور جدید خیالات حقیقت اور مجاز، قدرت اور حیات کی کثرت ان کے دماغوں میں وحدت پر منتقل ہو کر وجود پاتی ہے۔ دونوں اقلیم سخن کے شہنشاہ ہیں۔ تہذیب، تمدن، تعلیم، تربیت، فطرت گویا زندگی کا کوئی ایسا پہلو نہیں جس پر دونوں کا اثر نہ پڑا ہو۔

گوئٹے کو خود اپنے زمانے میں شہرت حاصل ہوئی۔ غالبؔ ان اہل کمال میں

ہیں جن کو بقائے دوام کے کشور میں داخل ہونے کے لیے موت کے دروازے سے گزرنا پڑتا ہے۔ گوئٹے کا کلام متعدد جلدوں میں ہے۔ غالب کا دیوان علاوہ قصائد و رباعیات ۱۸۵ غزلوں سے جن میں ایک ہزار چار سو چھپن اشعار ہیں زیادہ نہیں۔

گوئٹے کا کلام قومی اور ملکی ترقی کا باعث ہو چکا اور اپنا خاص منشا پورا کر چکا غالب کا کلام اب مقبول ہوا ہے اور آئندہ نسلیں اس امر کا موازنہ کریں گی کہ ان کی ترقی میں غالب کے کلام کا جزو اعظم کہاں تک مدد و معاون ہوا ہے۔

گوئٹے کی نگاہ اشیا کے خارجی پہلو سے گزر کر داخلی کیفیت تک پہنچتی ہے۔ غالب کی نظر اندرونی کیفیت کے مشاہدے سے بیرونی کیفیت کا قیاس کرتی ہے۔ گویا غالب گوئٹے سے کہہ سکتے ہیں:

WARHEIT SUCHEN WIR BEIDE DU AUSSEN
IMLEBEN ICH INNEN IN DEM HERZUN
UND SO FINDET SIE EIN JEDER g:VISS

(۴)

زبان ارضی ہے اور شاعرانہ خیالات سماوی ہیں۔ ان دونوں کو وصل دینا گویا لطیف روح اور مکدر مادہ سے جسم تیار کرنا ہے۔ شعراء گو تلامیذ الرحمٰن ہیں، لیکن ان میں یہ بھی قدرت نہیں کہ اپنے خیالات کا کامل اظہار کر سکیں جو خیالات دل میں موج زن ہوتے ہیں وہ اصلی لطافت کے بہت کچھ ضائع ہوئے بغیر روئے خیال سے روئے قرطاس تک نہیں آتے۔

اقبالؔ نے اس احساس کو یوں بیان کیا ہے:

زندگانی ہے مری مثل رباب خاموش
جس کے ہر رنگ کے نغموں سے ہے لبریز آغوش

بربطِ کون و مکاں جس کی خموشی پہ نثار
جس کے ہر تار میں ہیں سینکڑوں نغموں کا مزار
محشرستانِ نوا کا ہے امیں جس کا سکوت
اور شرمندۂ ہنگامہ نہیں جس کا سکوت
آہ امیدِ محبت کی بر آئی نہ کبھی
چوٹ اس ساز نے مضراب کی کھائی نہ کبھی

غالب کی شاعری کے جسم پر زبان کا جامہ اسی وجہ سے تنگ ہے، یہاں تک کہ بعض جگہ سے چاک ہو گیا ہے اور عریاں بدن اندر سے نظر آتا ہے۔

چونکہ مرزا غالب کا موضوعِ کلام بیشتر فلسفہ ہے۔ یہ مشکل اور بھی زیادہ ہو گئی ہے فلسفہ چیز ہی ایسی ہے۔ فلابیر (Flauber) فرانسیسی ناول نگار کا قول ہے:

"جب میں کانٹ (Kant) اور ہیگل (Hegel) کو مطالعہ کے لیے اٹھاتا ہوں تو سر میں درد ہونے لگتا ہے۔"

یہی باعث ہے کہ:

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل
سن سن کے اسے سخنورانِ کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل وگر نہ گویم مشکل

دیوانِ غالبؔ میں ایسے اشعار بھی ہیں جن کا مفہوم پانے سے ذہن مطلقاً قاصر ہے۔ تخیل عرصۂ امکان میں ہر جانب پرواز کے بعد مجبور واپس آ جاتا ہے۔ گویا ایک دائرہ ہے جس سے گریز ناممکن ہے۔ بہت سے نقاد اس کو 'کیف شراب' پر محمول کرتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے۔ گوئٹے کے اعلیٰ ترین کلام پر جو فاؤسٹ (Faust) حصہ دوم میں ہے یہی

اعتراض ہر جانب سے کیا گیا تھا۔ ایک دن ایکرمان (Eckermann) نے گوئٹے (Goethe) سے دریافت کیا کہ اس اشکال کا کیا باعث ہے؟

گوئٹے نے جواب دیا یہی تاریکی ہی تو ہے جس پر لوگ فریفتہ ہیں۔ لوگ ان مقالات پر لاینحل مسائل کی مثال غور کرتے ہیں اور اپنی ناکیابی سے نہیں اکتاتے انسانی طلب کی انتہا تحیر ہے۔ اگر کسی فعل سے حیرت پیدا ہو تو وہ کمال فن ہے اور اس بات پر اصرار نہ کرنا چاہیے کہ اس کے پس پشت کیا ہے۔ لیکن بچے جب آئینہ میں اپنا عکس دیکھ کر حیران ہوتے ہیں تو نادانی سے پشتِ آئینہ کو بھی دیکھنے لگتے ہیں۔

(۵)

فنون لطیف میں خوش نگاری کو فن تعمیر سے سب سے زیادہ مشابہت ہے۔ الفاظ وہ خشت وگل، چوب اور آہن ہیں جن سے ادبیات کی عمارت عبارت ہوتی ہے۔ میر حسن دہلوی کی طرح اطالوی شاعر ارسٹو (Aristo) نے اپنے دیوان میں عجب گل کار، آئینہ بند، منور اور پرعشرت محلات تیار کیے ہیں۔ کسی نے اس سے دریافت کیا کہ اے غریب کاشانہ نشین شاعر یہ ساز و ساماں کہاں سے پایا۔ ارسٹو نے جواب دیا الفاظ سنگ وخشت سے ارزاں ہیں۔

لیکن مرزا غالبؔ کے الفاظ لعل و جواہر سے بھی گراں ہیں۔ مرزا غالبؔ اس بات سے خوب واقف ہیں کہ مترادفات کو محض مولفان لغت نے طلب کی سہولت کی غرض سے وضع کر لیا ہے ورنہ ایک معنی کے دو الفاظ کسی زبان میں نہیں ہیں۔ توام بچے کتنے ہی ہم صورت ہوں ان کو ایک دوسرے کی عارضی غیر حاضری میں بھی ایک سمجھنا فاش غلطی ہے۔ مرزا الفاظ کے نازک سے نازک فرق کو خوب جانتے ہیں۔ وہ ادیبان فرانس کی طرف عقیدہ (Mot Propre) کے پابند اور قایل ہیں۔ دیوان کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ مرزا نے ایک لفظ جہاں تک ہو سکا ہے دوبارہ استعمال نہیں کیا۔ اس کی وجہ سحبان وائل کی طرح یہ نہیں

ہے کہ وہ کسی لفظ کی تکرار نہیں کرتے بلکہ یہ ہے کہ وہ کسی خیال کا اعادہ نہیں کرتے۔

زبان ارتقا کی پابند ہے۔ الفاظ بے جان نہیں بلکہ زندہ ہیں گو منطق کے قواعد لاتبدیل ہیں لیکن تصورات ہر دور وقت تبدیل ہوتے رہتے ہیں اور چونکہ تصور کی زبان سے ادا کرنے کا نام ہی لفظ ہے۔ الفاظ بھی تغیر کا تقاضا رکھتے ہیں۔ اگر یہ تجدید عہد بہ عہد نہ ہوتی رہے تو زبان کہنہ اور پارینہ ہو جائے۔ زبان کی تجدید مذہبی یا تمدنی اصلاح سے آسان نہیں۔ جس طرح رواج پر غالب آنا مشکل ہے محاورہ کا مٹانا بھی مشکل ہے۔ بہت سے ادیب اس نکتے سے غافل ہیں کہ خوب سے خوب محاورہ بلحاظ عمر آخر ضعیف ہو کر بے جان ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اردو میں اس وقت بہت سے محاورات ہیں جو حقیقت میں الفاظ اور فقرات کی "ممیاں" ہیں۔ مرزا نے اپنے دیوان میں محاورے کی بندش سے اکثر احتراز کیا ہے۔ تمام دیوان میں مشکل سے دس اشعار ایسے ہیں جن پر کوئی محاورہ باندھا ہے۔ مرزا نے اپنے فلسفیانہ خیالات کے لیے موزوں الفاظ کی تلاش کی تو اردو کے ذخیرۂ الفاظ کو بہت محدود پایا۔ لیکن قاعدہ ہے کہ جہاں نیا خیال پیدا ہوتا ہے وہاں نیا لفظ خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ ہر جان اپنا جسم خود ہمراہ لاتی ہے۔ مرزا کے خیالات نے اپنے اظہار کے لیے خود الفاظ تیار کر لیے ہیں بلکہ وقت نے مرزا کی مشکل پسند طبیعت کے لیے کام کو زیادہ آسان کر دیا۔ الفاظ سازی کے فن میں مرزا اجتہاد کامل کا درجہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ یہ الفاظ ملاحظہ ہوں:

دام شنیدن، خمار سوم، آتش خاموش، جوہر اندیشہ، کلبا تمگ تسلی، شبستان دریائے مے، پہلوئے اندیشہ، غرق نمکداں، خانہ زاد زلف، زنجیر رسوائی، جمع و خرچ دریا، موج نگاہ، نبض خس، تشنۂ فریاد، خلوت ناموس، صید ز دام جستہ، خودداری ساحل شہپر رنگ، موجۂ گل، گزرگاہ خیال، برگ ادراک طالع خاشاک، آئینۂ انتظار، خس جوہر، لذت سنگ، گردش رنگ، افشردۂ انگور، شہر آرزو، صحرا دستگاہ، دریا آشنا، محشر خیال، مژگان سوزن، مژگان یتیم، کنگر استغنا، سلک عافیت، معاش جنون، دام تمنا، دریائے بیتابی، وادیٔ خیال، سیاست

دریا، نسیہ ونقد دو عالم، طلسم پیچ وتاب، طعنہ نایافت، جنت نگاہ، فردوس گوش، کالبد دیوار۔ گلستان تسلی، چشم صحرا، شیرازۂ مژگاں، برخوردار بستر، رنگ فروغ دامان خیال، قلزم خون، غبار وحشت، شرار جستہ، جیب خیال، دعوت مژگاں۔

ان الفاظ کی جدت آشکار اور خوبیاں ظاہر ہیں۔ بہت سے نکات ضرور قابل بیان ہیں لیکن ان کی اس تمہید میں گنجائش نہیں۔ میکائل انجلو Michal Angelo کا قول ہے کہ مجسمہ ساز بت کو مرمر تراش کر نہیں بناتا بلکہ حقیقت میں بت ابتدا ہی سے سنگ سفید میں موجود اور جلوہ نمائی کا منتظر اور متقاضی ہوتا ہے۔ استاد کامل محض پتھر کی عارضی چادر کو علیحدہ کر دیتا ہے۔ یہی حالت مرزا کے ساختہ الفاظ کی ہے وہ ساختہ نہیں بلکہ ورجل (Virgil) کی مثال آفریدہ ہیں۔

مرزا غالب نے بعض اوقات قواعد کے خلاف زبان لکھی ہے۔ اس کے متعلق سید فضل الحسن حسرت اور علی حیدر طباطبائی نے چند مناسب اور معقول اعتراضات کیے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ قواعد منطق کا خارجی پہلو ہے اور شاعری منطق سے آزاد ہے۔ علم القواعد کا کام تقریر اور تحریر میں صحت پیدا کرنا ہے۔ کلام میں لطافت پیدا کرنا نہیں۔ اس لیے بعض اوقات شاعر کو اپنے جذبات کے کامل اظہار کے لیے قیود سے آزادی حاصل کرنا ضروری ہے۔

فنون لطیفہ میں موسیقی یا مصوری کی تحصیل کے لیے علم الاصوات اور علم الالوان کا جاننا لازمی ہے لیکن گاہ گاہ ایک ایسا آتش نفس مغنی اور مانی قلم مصور پیدا ہوتا ہے جو بلا تعلیم اپنے زمانے کا مجتہد ہوتا ہے۔ بعینہ کبھی کبھی ایک ایسا پیغمبر سخن دنیا میں آتا ہے جو نظریات اور قواعد زبان سے آزاد اور صرف روح القدس کا ترجمان ہوتا ہے۔

شیکسپیئر (Shakespeare) اور غالب کا کام قواعد زبان کی پابندی نہیں ہے یہ قواعد زبان کا کام ہے کہ ان کی پابندی کرے یا ان کی خاطر اپنی درسیات میں خاص ضمیمہ

جات کا اضافہ کرے۔

جہاں مرزا نے الفاظ میں نادار اور شستہ تصرفات سے کام لیا ہے وہیں تشبیہات اور استعارات میں بھی عام پابندی سے گریز کیا ہے۔ تشبیہات اور استعارات کی بنیاد قیاس پر قائم ہے۔ تشبیہ یا استعارہ کا پہلا کام معنی آفرینی ہے۔ کسی امر کو کتنا ہی واضح بیان کیا جائے ذہن مفہوم کے پانے سے قاصر رہتا ہے۔ لیکن ایک مشابہ مثال کام دے جاتی ہے۔ بہت سے دشوار اور غریب اشعار حل نہیں ہوتے۔ لیکن ایک مقابل شعر فوراً مضمون کو آئینہ بنا دیتا ہے۔ تشبیہ یا استعارہ کا دوسرا کام حسن آفرینی ہے۔ تشبیہات اور استعارات تصویر نظم کے بوقلموں الوان ہیں جن کی آمیزش بغیر تصویر اکثر تکمیل حیات کو نہیں پہنچتی اور بے رنگ رہ جاتی ہے۔ تشبیہ یا استعارہ کا تیسرا کام اختصار اور بلاغت پیدا کرتا ہے۔ جو بات دو لفظوں میں ادا ہو جاتی ہے۔ دوسری طرف دو سطروں میں بیان نہیں ہو سکتی۔

اردو شاعری میں جو تشبیہات اور استعارات قدیم ہیں اور جو دور بہ دور چلے آتے ہیں ان کو اصول مسلمہ خیال کیا جاتا ہے اور شعراء ان سے بال برابر تجاوز کرنا گناہ خیال کرتے ہیں چنانچہ بقول مولانا حالی معشوق کی صورت کو چاند، سورج یا جنت سے، آنکھ کو نرگس بادام یا بیمار سے، ابرو کو کمان یا محراب سے مژہ کو تیر سے، لبوں کو نبات یا آب حیات سے، منھ کو غنچہ سے، کمر کو بال سے اور دونوں کو عدم سے مشابہ قرار دینا مخصوص اور لازم ہو گیا ہے۔

مرزا نے خود کو اس تنگ دائرہ میں مقید نہیں کیا جس طرح ہر زمانے کی تصویروں کا رنگ و روغن علیحدہ ہونا بہ تقاضائے وقت لازمی ہے۔ ہر زمانے کے تشبیہات اور استعارات کا جدا ہونا بھی ضروری ہے۔

صاحب نظر ایک نگاہ میں محض رنگ سے بتلا سکتے ہیں کہ تصویر مصر کے عہد اولیں سے ہندوستاں کے عہد اجنتا سے یا فرنگ کے قرون وسطی سے یا اطالیہ کے زمانہ احیاء سے متعلق ہے۔ ہر عہد کے مصور اپنا رنگ بھی اپنے ہمراہ لاتے ہیں۔ طلطیان

(Titian) کے رنگوں میں بھی وہی سکون ہے جو اس کی جنبش موقلم میں ہے۔ اور گاگین (Gaugin) کے رنگوں میں بھی وہی ہیجان ہے جو ارتعاش اس کے تخیل میں ہے۔ مرزا نے خود آفریدہ تشبیہات اور استعارات کا اس بے تکلف انداز سے استعمال کیا ہے کہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا یہ ہمیشہ سے ہماری زبان میں موجود تھے اور ہزار بار کے سنے ہوئے ہیں۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

چنانچہ کس خوبی سے موئے آتش دیدہ کو زنجیر سے، دانہ ہائے تسبیح کو صد دل عشاق سے، خانہ مجنوں کو گرد بے دروازہ سے، بہار کو حنائے پائے خزاں سے جوہر آئینہ کو طوطی بسمل سے، حضرت یعقوب کی نابینا آنکھوں کو روزن دیوار زندانِ یوسف سے، دام موج کو حلقہ صد کام نہنگ سے، تار اشک یاس کو رشتہ چشم سوزن سے، ہر قطرۂ خون تن کو نگین نام معشوق سے، دریا کو زمین کے عرق انفعال سے، سرے کو دور شعلہ آواز سے، نالہ کو گردش سیارہ کی صدا سے۔ صبح وطن کو خندہ دنداں نما سے، موئے شیشہ کو دیدہ ساغر کی مژگاں سے، آئینہ کو ورطہ سے، موج شراب کو مژہ خواب ناک سے، ساغر کو متاع دست گراں سے مماثل بیان کیا ہے۔

مولانا شبلی نے صنائع اور بدائع کے متعلق بحث کرتے ہوئے بجا کہا ہے کہ ان کا نتیجہ شاعروں کے لیے کوہ کندن اور کاہ برآوردن سے زیادہ نہیں۔ کلام میں جس قدر صنائع اور بدائع کے استعمال کی زیادتی ہوگی اتنا ہی کلام حقیقت سے بعید اور تصنع سے قریب ہوگا۔ خاموش اور کم مطلب اشعار محض آرائش کے قواعد سے گویا اور پر معنی نہیں بن سکتے حسن قوانین کا پابند نہیں ہے۔ بلکہ ہمہ قیود سے آزاد ہے۔ 'مارکو دل چیو' کے قواعد مصوری کی رو سے عورت کا بدن تصویر کے خاکہ میں ایک خط منحنی کو ایک دو اور تین میں حسابی قاعدہ سے

ضرب دینے سے قائم ہوتا ہے۔ بھلا کہیں بے جان لکیریں نسوانی جسم میں شعریت کو وجود میں لاسکتی ہیں۔ بعض تصویر نگار مختلف رنگوں میں مختلف معنی بیان کرتے ہیں۔ افلاطون کے پیرو کہتے ہیں حسن روح میں ہے۔ ارسطو کے متبعین مخالفت کرتے ہیں کہ جسم میں ہے۔ لیکن درحقیقت نہ پیکر معشوق میں کوئی معین خطوط ہیں نہ کسی رنگ میں کوئی خاص مناسبت ہے۔ خوبی نہ روح سے متعلق ہے نہ جسم سے محدود ہے حسن حسن میں ہے۔ جس کے آفرینش شعراء کا کام اور راز ہے۔ جس طرح اقلیدسی خطوط سے خوبصورت سراپا نہیں بن سکتا۔ صنائع اور بدائع سے خوب کلام ترتیب نہیں پاسکتا۔ قابل عزت ہیں وہ تمام فضلا جنہوں نے علم صنائع اور بدائع کو فروغ دیا ہے لیکن اگر ان کی تمام کتابیں جلا دی جائیں تو شعراء کا ذرا سا بھی نقصان نہیں۔

صنائع اور بدائع کے استعمال سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ طبیعت میں آمد نہیں ہے۔ صنائع اور بدائع کا استعمال کلام کو عام ادبی زندگی سے جدا کر دیتا ہے اور جس زمانے میں صنائع اور بدائع کا عام رواج ہو وہ زمانہ اقوام کے انحطاط اور زوال کا ہوتا ہے۔ غالب بہت کم صنائع اور بدائع کا استعمال کرتے ہیں۔ ان کے کلام کے اشکال کا باعث فارسیت کا غلبہ، الفاظ کا ادق ہونا اور ترتیب کا پس و پیش ہوتا ہے۔ اس میں صنائع اور بدائع کی مشکلات کو ذرا بھی دخل نہیں ہے۔

لیکن ایک خصوصیت ان کے کلام میں ایسی ہے۔ جس کی مثالیں کسی دوسرے شاعر کے کلام میں موجود نہیں ہے۔ جس طرح سفید رنگ میں تمام آفتابی الوان مضمر ہیں۔ ان کے بعض اشعار کی سادگی میں عجیب وغریب لطیف معنی پنہاں ہیں۔ جیسے کولمبس نے امریکہ کو دریافت کیا تھا۔ مولانا حالیؔ نے مرزا غالبؔ کے کلام میں اس نئی دنیا کا پتہ لگایا ہے اور حقیقت میں مولانا حالی مرزا غالبؔ سے کچھ کم مستحق داد نہیں ہیں۔

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

جہاں اس کے یہ معنی ہیں کہ دشت اس قدر ویران ہے کہ خوف سے گھر یاد آتا ہے
وہیں یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ ہم تو گھر ہی کو سمجھتے تھے کہ ایسی ویرانی کہیں نہ ہوگی۔ لیکن دشت بھی
اتنا ویران ہے کہ اس کے دیکھنے سے گھر کی ویرانی یاد آتی ہے۔

کون ہوتا ہے حریفِ مے مرد افگن عشق
ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

اس شعر کے ظاہری معنی یہ ہیں کہ میرے مرنے کے بعد شراب عشق کا کوئی
خریدار نہیں، اور ساقی یعنی معشوق کو بار بار صلا دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ دوسرے لطیف
معنی یہ پنہاں ہیں کہ ساقی مصرعۂ اولیٰ کو مکرر پڑھتا ہے ایک دفعہ بلانے کے لہجے میں یعنی
کوئی ہے جو مے مرد افگن کا حریف ہو، پھر جب اس کی آواز پر کوئی نہیں آتا تو اسی مصرعے کو
مایوسی کے ساتھ پڑھتا ہے یعنی کوئی نہیں۔

کیوں کہ اس بت سے رکھوں جان عزیز
کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز

اس کے ظاہری معنی یہ ہیں کہ اگر میں اس سے جان عزیز رکھوں گا تو وہ ایمان لے
لے گا۔ اس لیے جان کو عزیز نہیں رکھتا اور دوسرے لطیف معنی یہ ہیں کہ اس بت پر جان
قربان کرنا تو عین ایمان ہے پھر اس سے جان عزیز عزیز رکھی جا سکتی ہے۔

ترے سرو قامت سے اک قد آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

اس کے ایک معنی تو یہی ہیں کہ تیرے سرو قامت سے فتنۂ قیامت کم ہے اور دوسرے
معنی یہ بھی ہیں کہ چونکہ ترا قد اسی میں سے بنایا گیا ہے اس لیے وہ ایک قد آدم کم ہو گیا ہے۔

سر اڑانے کے جو وعدے کو مکرر چاہا
ہنس کے بولے کہ ترے سر کی قسم ہے ہم کو

اس جملے کے دو معنی ہیں ایک یہ کہ تیرے سر کی قسم ہم ضرور سر اڑائیں گے۔ دوسرے یہ کہ ہم کو تیرے سر کی قسم ہے یعنی ہم تیرا سر کبھی نہ اڑائیں گے۔

الجھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ
جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیونکر ہو

اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ تم جیسے نازک مزاج شہر میں اور ہوں تو شہر کا کیا حال ہو اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ جب تم کو اپنے عکس کا بھی اپنی مانند ہونا گوارا نہیں تو شہر میں اگر فی الواقع تم جیسے ایک دو حسین موجود ہوں تو تم کیا قیامت برپا کرو۔

(۷)

بعض کا خیال ہے کہ شاعری مصوری ہے۔ اس پہلو سے بھی دیوان غالب عدیم المثال ہے۔ ہر ورق پر ایسے اشعار موجود ہیں جن کو صفحۂ قرطاس سے جلد تصویر پر منتقل کیا جا سکتا ہے۔ شعر کو تصویر پر یہ ترجیح ہے کہ تصویر ساکن اور شعر متحرک ہے۔ تصویر اپنے قائم کردہ انداز کو نہیں بدل سکتی۔ شعر ایک کیفیت کی مختلف حرکات کو ظاہر کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ تصویر رقبۂ حیات پر ایک نقطہ ہے۔ شعر ایک دائرہ ہے۔

حسن و عشق کے تمام معاملات کو مرزا نے اس خوبی سے نظم کیا ہے کہ ہو بہو تصویر نگاہوں میں پھر جاتی ہے۔ اس کے لیے صرف زبان پر قدرت ہونا کافی نہیں بلکہ فطرت کا بڑا نکتہ داں ہونا ضروری ہے۔ کیا خوب زندگی کی روزمرہ تصویریں ہیں مثلاً کہتے ہیں۔

غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں
بوسہ کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں

تصور گوش آشنا ہوتے ہی اول دُرِ دنداں اور لب مرجاں کا خاکہ کھینچتا ہے پھر مسی کی اداہٹ اور پان کی سرخی سے ان میں تبسم کا رنگ بھرتا ہے۔ پھر رونمائی میں مشغول ہوتا ہے اور سرے کی تحریر اور قشقے کی لکیر تک نہیں بھولتا، پھر گردن کے اتار اور سینہ کے ابھار کے

خطوط کی کشش سے پیکر تیار کرتا ہے اوا سی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ دستِ حنائی میں جو پردہ ہے وہ بھی اور جس غرفے میں وہ پردہ آویزاں ہے اس کو بھی دکھلاتا ہے۔

کہیں کہیں روزمرہ تصاویر کا دوسرا رُخ دکھایا ہے یعنی واقعات حقیقت اور قدرت کے مطابق لیکن امید اور عادات کے خلاف ہیں۔ مثلاً

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے
صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

وہ صنم جو عشق کو جنون کہتا تھا جو حسن کے اثر کا منکر تھا اور ہر عاشق و معشوق سے رم کرتا تھا اپنے جمال کے ایک جلوے سے کیا حیران ہے۔ یار کے آئینے کی جانب بے پروا بشاش بڑھنے اپنی صورت سے دوچار ہونے اور نرگس کی طرح تیر عشق کا نشانہ ہو کر بے اختیار پیچھے ہٹنے کا کیا صادق عکس ہے۔

آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا
لے تو لوں سوتے میں اس کے پاؤں کا بوسہ مگر
ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائے گا

یار محوِ خواب ہے اور عاشق پابوسی کے لیے جھکنا چاہتا ہے لیکن اس خیال سے کہ ممکن الامر اگر معشوق بیدار ہو گیا تو تمام عمر کے لیے اعتبار جاتا رہے باز رہتا ہے۔ عقل و شوق، اندیشہ اور آرزو کے کیا متضاد تقاضات ہیں۔

مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالبؔ
یار لائے مری بالیں پہ اسے پر کس وقت
نہ لٹتا صبح سے غالبؔ کیا ہوا اگر اس نے شدت کی
ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

مرتا ہوں اس آواز پہ ہر چند سر اڑ جائے
جلاد کو لیکن وہ کہے جائیں کہ ہاں اور
ہم سے کھل جاؤ بوقت مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذر مستی ایک دن

امیر خسرو کا ایک شعر ہے۔

جاناں اگر شبیت دہن بردہن نہم
خود رانجواب ساز و مگو کیں دہان کیست

مرزا غالب نے اپنے شعر میں دو گونہ لطف پیدا کیا ہے۔ پہلے مصرعے میں کہتے ہیں کہ نشہ کا بہانہ کر کے ہم سے کھل جاؤ کوئی یہ نہ جانے گا کہ تمہاری آرزو سے ایسا ہوا ہے۔ دوسرے مصرعے میں کہتے ہیں کہ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو میں خود نشہ کا بہانہ کر کے پیش قدمی کروں گا اور پھر خواہ تم کچھ ہی کہو سب مجھے معذور رکھیں گے۔

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

اس شعر کو پڑھتے ہی مجنوں بنی عامر کے آخری کلام کا مضمون یاد آ جاتا ہے البتہ جو درد و گداز اس وارفتہ کے اشعار میں ہے وہ اس میں نہیں۔

بربی ہل ضمت الیک لیلئے	قبیل الصبح اوقبلت فاہا
وہل رفت علیک قرون لیلئے	رفیف الاقحوانۃ فی نداہا

تجھے خدا کی قسم ہے کیا صبح کے پہلے تو نے لیلئے کو سینہ سے لگایا ہے یا اس کے منہ پر بوسہ دیا ہے کیا تیرے اوپر لیلئے کی زلفیں لہرائی ہیں۔ جس طرح گل بابونہ لہراتا ہے۔

واں وہ غرور عز و نازیاں یہ حجاب پاس وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں بزم میں وہ بلائے کیوں

رات کے وقت مئے پئے ساتھ رقیب کو لئے
آئے وہ یہاں خدا کرے پر نہ خدا کرے کہ یوں

تم اپنے شکوہ کی باتیں نہ کھود کھود کے پوچھو
حذر کرو مرے دل سے کہ اس میں آگ دبی ہے

دوستی کا پردہ ہے بیگانگی
منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہئے

غیر پھرتا ہے لیے یوں ترے خط کو کہ اگر
کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے

سمجھ کے کرتے ہیں بازار میں وہ پرسش حال
کہ یہ کہے کہ سر رہ گزر ہے کیا کہئے

اگر وہ موقع ساز جو عشق ومحبت کے معاملات کے نئے نئے مضامین کے متلاشی رہتے ہیں مندرجہ بالا اشعار کو لوح قرطاس سے پردۂ تصویر پر منتقل کریں تو ان میں سے ہر ایک ایک یادگار زمانہ تصویر ہو۔ مرزا کا قلم موقلم ہے۔

(۸)

اقبال نے مرزا کی شان میں کہا ہے۔

فکر انساں کو تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پر مرغ تصور کی رسائی تا کجا!

کتاب قدرت ایک تاریک کتاب ہے جس کے اوراق پر سوائے شعرا کے کوئی روشنی نہیں ڈال سکتا۔ اس ضیاء میں ہر شے ایک نئی صورت اور کیفیت میں مشاہدہ ہوتی ہے لیکن روشنی شعلۂ برق کی مثال دم وزدن میں غائب ہو جاتی ہے اور پھر وہی ظلمت چھا جاتی ہے۔ اس روشنی میں ہر رگ سنگ میں خون شہیداں اور شرار سنگ میں جلوۂ یزداں نظر آتا

ہے۔ یہ کوئی شاعرانہ دروغ یا فریب نظر نہیں بلکہ مشاہدۂ حقیقت ہے۔

جب شعراء گرد و پیش کے مناظر اور واقعات کو دور از کار اور فوق الفطرت طور پر بیان کرتے ہیں تو وہ بیان ان کے عینی اور یقینی نظارہ پر مبنی ہوتا ہے۔

وہ نام نہاد شاعر ہیں جو محض الفاظ کے پس و پیش سے تمثیلات تیار کرتے ہیں اور نابینا ہونے کے باعث خود ان کو نہیں دیکھ سکتے۔

موج سراب دشتِ وفا کا نہ پوچھ حال
ہر ذرہ مثل جوہر تیغ آبدار تھا

وفا جو ایک صفت قلبی ہے شاعر کو خار جادشت کی صورت میں نظر آتی ہے اور دشت بھی بے آب۔ ہر جانب جہاں تک نگاہ کام کرتی ہے ریگ رواں ہے اور سراب کے ذرات جوہر تیغ آبدار کی طرح تمازت آفتاب میں لرزاں ہیں اس مقام لق و دق کی صحرانوردی کا نام عشق ہے۔

گر نہ اندوہ شب فرقت بیاں ہو جائے گا
بے تکلف داغ مہ مُہرِ دہاں ہو جائے گا

عاشق چاند کو دیکھتا ہے۔ چاند کے مشاہدے سے معاً یہ خیال اس کے دل میں پیدا ہوتا ہے کہ اگر میں نے راز الفت اور درد فرقت کو اور چھپایا تو میں دیوانہ ہو جاؤں گا اور کوئی اتنا بھی نہ جانے گا کہ میرے جنوں کا باعث کیا ہے۔ میرے غم خواروں اور میرے محبوب تک کو خبر نہ ہوگی گویا یہ ماہتاب جس کی روشنی میرے قلب میں مانیا کا طلاطم پیدا کر رہی ہے میرے لیے مہر دہان ہو جائے گا۔ ورڈس ورتھ (Worths Worth) غروب ماہتاب کی کیفیت کے مشاہدے سے متاثر ہو کر بے اختیار کہتا ہے۔

Omercy to myself cried
If Lucy should be dead

سفرِ عشق میں کی ضعف نے راحت طلبی
ہر قدم سایہ کو میں اپنے شبستاں سمجھا

عاشق میں عشق اس درجہ خستہ جان اور مضمحل ہو گیا ہے کہ قدم قدم پر ضعف سے لغزش ہوتی ہے اور آگے بڑھنے کا یارا نہیں، اس ادنیٰ مضمون کو وسعت تخیل اس طور پر ادا کرتی ہے کہ جس طرح تشنہ لب مسافر کو دشت میں سراب دریائے آب معلوم ہوتا ہے شکستہ روح اور مجروح بدن عاشق کو اپنے سایہ پر خواب گاہ منزل کا گمان ہوتا ہے۔ ہر لحظہ خیال کرتا ہے کہ مقام مقصود کو پالیا اور ہر لحظہ چونکتا ہے کہ نہیں ہنوز دشت ناپیدا کنار کے عین وسط میں ہے۔

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ
سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

کہتے ہیں کہ جب مجنوں کا شباب عشق تھا۔ میرا وقت طفلی تھا۔ تمام شہر کے بچے مجنوں کو پتھروں سے مارا کرتے تھے کہ اقتضائے بچپن ہے۔ میں نے بھی ایک بار دیگر ہم عمروں کی طرح اس ستم زدہ کو نشانہ سنگ بنانے کی غرض سے پتھر اٹھایا۔ دم زدن میں اپنی تمام آئندہ زندگی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ میں آگے آگے ہوں اور اطفال شہر پیچھے پیچھے خشت و سنگ کی بارش کر رہے ہیں۔ یعنی سرشت عشق طفلی کی نافہمی سے آزاد ہے۔ گو لڑکپن کا زمانہ تھا لیکن پہلے ہی کجروی پر ضمیر عاشقی نے متنبہ کر دیا۔

جس طرح نبوت بطن مادر سے شروع ہوتی ہے عشق بھی عہد طفلی سے آغاز ہوتا ہے چنانچہ خود مجنوں کا قول اس کا مصداق ہے۔

الا ایھا القلب الذی لج ھائما
ولیداً بلیلیٰ لم تقطع تمائمہ

میں لیلیٰ کے عشق کے بھنور میں اس وقت پھنس گیا تھا جبکہ بچہ تھا اور میرے

گلے کے تعویذ بھی نہ کٹے تھے۔ ایک روایت ہے کہ منصور کو انا الحق کہنے کے باعث لوگ خشت و سنگ سے سرزنش کیا کرتے تھے۔ ایک دن شبلی کا بھی اس راہ سے گزر ہوا۔ شبلی نے شاید از راہ مزاح ایک پھول منصور کی جانب پھینک دیا۔ منصور کو نہایت درجہ ملال ہوا۔ کیونکہ شبلی جو خود عاشقان خدا میں سے تھے منصور کے معاملے سے واقف تھے۔ ضرور ہے کہ مرزا نے مجنوں پر پتھر اٹھایا ہوگا تو مجنوں نے شکایتاً مڑ کر ان کی طرف دیکھا ہوگا۔

مقتل میں کس نشاط سے جاتا ہوں میں کہ ہے
پر گل خیال زخم سے دامن نگار کا

عاشق کے مقتل کو جانے کی مسرت کا اندازہ ممکن نہیں۔ دامن نگاہ یعنی "بہر کجا کری نگرم" تمام افق زخموں کے خیال کی بہار سے پر گل ہے۔ یہ گلزار عاشق گلزار خلیل اللہ سے کم نہیں۔

پوچھ مت وجہ سیہ مستی ارباب چمن
سایہ تاک میں ہوتی ہے ہوا موج شراب

موسم باراں میں ابر و ہوا کا زور ہے۔ باغ میں تالیاں سب شرابور ہیں درختوں کے جوشش شباب سے سبزے تیرہ گوں سبز ہو گئے ہیں گویا یہ مست رندان چمن وجد میں ہیں تمام باغ پر سرور کا اثر معلوم ہوتا ہے۔

گلوں کا لب نہر پر جھومنا
اسی اپنے عالم میں منہ چومنا
وہ جھک جھک کے گرنا خیابان پر
نشہ کا سا عالم گلستان پر
(میر حسن)

مرزا کہتے ہیں کہ یہ کیفیت ہے کہ نم بارش آلود ہوا خوشہ انگور سے مس ہو کر اسے لطیف شراب بنا دیتی ہے۔

نہ چھوڑی حضرت یوسف نے واں بھی خانہ آرائی
سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

جب زلیخا کی آخری کوشش تھی کہ شاید وہ دلربا تکلیف قید سے مان جائے لیکن ادھر یوسف روانہ ہوا ادھر داروغہ کو فرمان ہوا کہ مجلس کی آرائش میں مشغول ہوتا کہ وہ نازنین قید سے زیادہ ملول نہ ہو۔

معطر دار دیوار دوش را
منور ساز طاق منظرش را
(جامی)

چنانچہ معمار حجرۂ یوسف میں سفیدی میں مشغول ہیں۔ مرزا کا خیال کہاں سے کہاں منتقل ہوتا ہے۔ ان کو یہ سفیدی دیدہ یعقوب کی نابینا آنکھوں کی سفیدی معلوم ہوتی ہے۔

پدرش نگراں ست کہ یوسف بہ زنداں ست

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم

دنیا کی تکالیف علائق سے ہیں جو اضافت اور نسبت سے بری ہیں وہ الم سے بھی سبکدوش ہیں۔

آزاد ظاہر میں سب سے زیادہ آزار پاتے اور رنج اٹھاتے ہیں۔ اور شب و روز تاریک ماتم خانہ میں رہتے ہیں لیکن واقعتاً غم کا اثر ان پر عارضی اور فوری ہوتا ہے۔ مرزا اپنی اس سکون طبیعت کی کیا فوق الخیال مثال دیتے ہیں کہ برق بلا گرتی ہے تو ہم بجائے

خوف زدہ اور پریشان ہونے کے کمال اطمینان سے اٹھ کر حوالہ برق سے اپنے الم کدے کی خاموش کشتہ شمع کو روشن کر لیتے ہیں۔

شوق اس دشت میں دوڑائے ہے مجھ کو کہ جہاں
جادہ غیر از نگہ دیدۂ تصویر نہیں

دشت وفا میں عشق کی تگ و دو کا انجام موت ہے اس بحر سراب کا کوئی ساحل نہیں کوئی جادہ نہیں جس سے مسافر صحرا سے جان سلامت لے جا سکے۔ راہ کے عدم کو مرزا کمال شاعری سے یوں بیان کرتے ہیں کہ صرف ایک راستہ ہے اور وہ نگۂ دیدۂ تصویر ہے یعنی کوئی راستہ نہیں۔ کیا خوب عدم کو وجود کے لباس میں جلوہ گر کیا ہے۔

قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر
لیکن آنکھیں روزن دیوار زنداں ہو گئیں

حضرت یعقوب کی آنکھیں فرزند کے فراق میں روتے روتے سفید ہو گئی تھیں۔ مرزا کے فکر رسا نے اس سے تاثیر عشق کا کیا طرفہ مضمون پیدا کیا ہے کہ وہ روزن جو دیوار زنداں یوسف میں ہیں حضرت یعقوب کی نابینا آنکھیں ہیں جو اپنے فرزند کو دیکھتی رہتی ہیں۔ سفید نابینا آنکھوں کو جو روزن سے مشابہت ہے ظاہر ہے قطرہ قطرہ پانی اگر کہیں گرتا رہتا ہے تو مرمر اور فولاد تک میں سوراخ کر دیتا ہے۔ حضرت یعقوب کی مدام اشکباری سے دیوار زنداں میں سوراخ ہو گئے ہیں۔ جس طرح روزن دیوار کبھی بند نہیں ہوتے۔ حضرت یعقوب کی نابینا آنکھیں کبھی بند نہیں ہوتیں۔ رات دن بے خواب جانب یوسف نگراں رہتی ہیں۔ حضرت یعقوب کی آنکھیں روزن دیوار زنداں ہو گئیں تاکہ تاریکی اور حبس سے یوسف کا دم خفا نہ ہو۔ آنکھیں دیوار زنداں ہو گئیں تاکہ یوسف زنداں سے دنیا کا تماشہ دیکھ سکیں اور تنہائی سے پریشان نہ ہوں۔

بیضہ آسا ننگ بال و پر ہے یہ کنج قفس
از سر نو زندگی ہو گر رہا ہو جائیے

حیات بعد الممات اور بقائے روح کی کیا عجب مثال دی ہے۔

(۹)

قدرت مستور حقیقت ہے۔ قدرت اور عوام کے درمیان ایک دیوار حائل ہے۔ جس میں صرف شاعر کی نظروں کی ایفا شعائیں گزر پاتی ہیں۔

مرزا غالب کی چشم بینا قدرت کو تمام نقاط نگاہ سے دیکھتی ہیں اور ہر نظر میں ایک نیا جلوہ پاتی ہے۔ جو شعرا قدرت کے ترجمان ہیں ان میں سے اکثر سعدی اور ورڈ ورتھ کی طرح قدرت سے تماشائے بہار خزاں، باغ وراغ، کہسار و آبشار مراد لیتے ہیں۔ غالب کے مشاہدات کنار دریا دامن کوہ، لب جو سے بہت کم متعلق ہیں۔ مرزا کا جی لب دریا، خاموش مرغزاروں سے زیادہ شہروں کے پرشور کوچوں میں لگتا ہے۔ جہاں زندگی شعاع منتشر کی طرح ہفت رنگ جلوہ دکھاتی ہے۔ مرزا کے نزدیک دلی کی گلیوں کی رونق یا ویرانی جز وقتی یا افسردگی، شورش یا خاموشی خود ان کے اپنے احساسات کی خارجی تصویر ہیں جو صورتیں اِدھر اُدھر رواں ودواں نظر آتی ہیں وہ مرزا کے نزدیک ان کے اپنے خیالات کے مجسمات ہیں۔ ان کو القا کے لیے سرو دو چنار کو شب ماہ، لب آب، صحبت یار میں یا ساغرو نے دیکھنے کی ضرورت نہیں وہ اگر کسی بنتی ہوئی عمارت پر نصب شدہ جو ثقیل کا آہنی حلقہ بھی رسی میں آویزاں دیکھتے ہیں تو ان کو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا سیمرغ اپنا چنگل آسمان سے تارے توڑنے کے لیے دراز کر رہا ہے۔ جن مظاہر قدرت کو مرزا دیکھتے ہیں اور شعرا یا تو ان کو عام خیال کر کے ان پر غور ہی نہیں کرتے یا ان میں اس درجہ شعریت نہیں پاتے کہ ان کی کیفیت کو اپنے کلام یں بیان کریں اور اگر کرتے ہیں تو کامیاب نہیں ہوتے مثلاً

شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

کون ہے جس نے شمع کو گل ہوتے نہیں دیکھا لیکن کسی شاعر نے مشاہدہ کیا ہے
کہ شعلے کے ختم ہو جانے کے بعد دیر تک فتیلہ سے دھواں اٹھتا رہا ہے۔ عاشق کی موت کی
اس سے بہتر کیا تمثیل ہو سکتی ہے۔

برنگ کاغذ آتش زدہ ہم رنگ بیتابی
ہزار آئینہ دل باندھے ہے بال یک طپیدن پر

حروف آشنا کاغذ گویا بلکہ زندہ ہوتا ہے۔ کاغذ چونکہ کلام ربی اور کلمات بشری کا
حامل ہے۔ کاغذ کے جلنے کو عیب خیال کیا جاتا ہے۔ لیکن کاغذ کی تحریر مستقل سند ہوتی ہے۔
اس لیے شہادت کو تلف کرنے کے لیے کاغذ کا ضائع کرنا بسا اوقات لازمی ہو جاتا ہے۔
معشوق ابتدا سے نامہائے عشق کو جلاتے آئے ہیں لیکن کسی شاعر کے مشاہدے میں یہ نہ آیا
کہ کاغذ کے جلنے میں کیا شاعرانہ کیفیات نہاں بلکہ عیاں ہیں۔ جب کاغذ کو آگ میں ڈالا
جاتا ہے تو ذرا سی دیر آتش بلند ہو کر شعلہ بجھ جاتا ہے اور سرخ و سیاہ رنگ کا کاغذ نیم جاں جسم
رہ جاتا ہے۔ جس میں سکرات اور نزع کی تمام علامات نظر آتی ہیں۔ پھر یہ ارتعاش حیات بھی
فرد ہو جاتا ہے اور سراپا جل چکنے کے ہزاروں نقطہ ہائے روشن کاغذ پر نمودار ہو جاتے ہیں۔
آخر کار کاغذ خاکستر ہو جاتا ہے۔

ہوئی ہے مانع ذوق تماشہ خانہ ویرانی
کف سیلاب باقی ہے برنگ پنبہ روزن میں

جو شہر دریاؤں کے کنارے واقع ہوتے ہیں بعض اوقات شدت آب کی وجہ سے
غرق سیلاب ہو جاتے ہیں۔ بلاد حیدر آباد اور لکھنو کے واقعات سب کو یاد ہیں۔ جب آب
دریا طغیانی کے ساتھ شارعات سے مکانات میں داخل ہوتا ہے تو جہاں سے راہ پاتا ہے
درآتا چلا جاتا ہے۔ جہاں داخل ہونے میں مزاحمت ہوتی ہے پانی کف لے آتا ہے جب
جوش دریا فرو ہو چکتا ہے تو سطح آب پھر نیچی ہو جاتی ہے اور پانی واپس دریا کی جانب روانہ

ہو جاتا ہے لیکن کف سیلاب جس جس جوف اور سوراخ میں پیدا ہوا تھا وہ وہیں باقی رہ جاتا ہے اور تار عنکبوت کی طرح اس رخنہ کو بند کر دیتا ہے۔

ہوئے اس مہروش کے جلوۂ تمثال کے آگے
پر افشاں جو ہر آئینہ میں مثل ذرہ روزن تھا

جو لوگ علم مناظر و مرایا سے آگاہ ہیں وہ جانتے ہیں کہ اگر کسی ذرہ کو کسی روزن میں آنکھ لگا کر دیکھا جائے تو ذرہ کے بے مقدار جسم سے ہر سمت شعاعیں نکلتی ہوئی نظر آتی ہے اس کا باعث آفتاب کی روشنی ہے جس کے عکس سے ذرہ کا جسم خارجا روشن ہو جاتا ہے۔ یہ شعاعیں بعینہ ایسی معلوم ہوتی ہیں گویا پھلجھڑی چھوٹ رہی ہے۔ مرزا غالب اس کو ذرہ کا پر افشاں ہونا کہتے ہیں۔

سوال ہے کہ مرزا کے وقت میں تو کیا اس زمانے میں بھی جب کہ انکسار اور انعکاس کے مسائل زبان زد عام ہیں کتنے اشخاص ایسے ہیں جو اس کیفیت سے واقف ہیں۔

ایک اور معنی اس شعر کے ممکن ہیں مرزا نے بعض اوقات پر فشانی پر زنی کے معنوں میں بھی استعمال کیا ہے مثلاً

کروں بیداد ذوق پر فشانی عرض کیا قدرت
کہ طاقت اڑ گئی اڑنے سے پہلے میرے شہپر کی

اگر یہاں بھی یہی معنی ہیں تو ذرات کی پرواز مراد ہے۔ چنانچہ ایام گرما میں دوپہر کے وقت تاریک کمرے میں اگر کوئی آفتاب کی کرن سیاہ پوش روشن دان کے کسی رخنے سے اندر آ جاتی ہے تو غبار کے باریک ذرے جو خط شعاع سے روشن ہو جاتے ہیں اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر اُڑتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

بساط عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی
سو رہتا ہے بہ انداز چکیدن سرنگوں وہ بھی

کہنہ اور زوال رسیدہ عمارات میں آب وہوا کے عام اور پیہم اثر سے سنگ سفید اور سنگ موسیٰ کے ریختہ مربعات پر کائی جم جاتی ہے اور بعض اوقات پانی رسنے لگتا ہے سیاہ و سفید شکستہ مرمر کی بالائی کشت سے قطرہ قطرہ آب گرتا رہتا ہے۔ قطرے ایک دوسرے کا تعاقب کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور جو سب سے آگے ہوتا ہے وہ مقام مقررہ پر پہنچ کر چشم زدن توقف کے بعد گر پڑتا ہے۔ جو چیز قطرے کو فوراً گر پڑنے سے روکتی ہے وہ پانی کے سالمات کا باہم ملحق ہونا ہے لیکن کہاں ایک قطرے کی قوت قرار، کہاں تمام کرہ ارض کی کشش ثقل قطرہ کیا تاب لاسکتا ہے۔ مرزا غالبؔ اپنے دل کا ٹپکتے ہوئے قطرے سے مقابلہ کرتے ہیں۔ انسان کے دل کو اطبائے فرنگ نے ناشپاتی سے تشبیہ دی ہے۔ لیکن درخت میں آویزاں ناشپاتی کا بالائی حصہ خورد اور زیریں کلاں ہوتا ہے اور دل کی حالت اس کے خلاف ہے۔ دل کی کوئی تشبیہ خون کے ٹپکتے ہوئے قطرے سے بہتر ممکن نہیں۔ علاوہ ازیں دل کی لاچاری اور عاجزی کی کیا تصویر ہے۔

آگ سے پانی میں بجھتے وقت آتی ہے صدا
ہر کوئی درماندگی میں نالے سے ناچار ہے

کسی شاعر نے آج تک آتش کے فرد ہونے کی اس ظاہر اور ادنیٰ کیفیت کو مشاہدہ کیا ہے۔ لفظ "ہر کوئی" میں آگ کے طبعاً مغرور اور سرکش ہونے کا اشارہ نہایت خوبی سے مضمر ہے۔

ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گر اندیشہ میں ہے
آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے

وینس (VENICE) براعظم یورپ کا حلب ہے۔ وینس کے بلوریں جام و ساغر مشہور ہیں۔ ان کی نزاکت کا انداز بیان سے باہر ہے۔ دیکھ کر بے انتہا جی چاہتا ہے کہ

صناعوں کے ہاتھ چوم لے۔ آئینہ گر حقیقت میں عمر خیام کے کوزہ گر سے کہیں زیادہ ''خالق'' کے لقب کا مستحق ہے جو گلخن میں مغشوش ریگ کو رفتہ رفتہ تربیت سے مینا کر دیتا ہے۔ مینا سے بلور بنا دیتا ہے بلور سے آبگینہ کر دیتا ہے اور آبگینہ سے آتشیں شیشہ بنا دیتا ہے جب گرم شیشہ آتش کدہ سے باہر آتا ہے۔ رقیق حالت میں ہوتا ہے۔ اس وقت آئینہ ساز اپنے ''دم'' سے جو صورت چاہتا ہے شیشہ کو عطا کرتا ہے۔ اگر کسی پہلو آگ کی تپش اعتدال سے ذرا بھی زیادہ ہو جاتی ہے تو شیشہ کملا جاتا ہے۔ اور اپنی صورت چھوڑ دیتا ہے۔ مرزا شراب کو رنگ اور تاثیر کے لحاظ سے آتش گلخن کا مقابل بیان کرتے ہیں اور مے کی حدت اور شدت کو یوں ظاہر کرتے ہیں کہ ساغر کو گداخت سے بے صورت کیے دیتی ہے۔ پھر کہتے ہیں کہ یہی حالت میرے دل کی ہے جو فکر اور اندیشہ کی آگ کی تاب نہ لا کر کملا جاتا ہے۔

عجب نشاط سے جلاد کے چلے ہیں ہم آگے
کہ اپنے سایہ سے سر پاؤں سے ہی دو قدم آگے

جب آفتاب راہرو کی پشت کی جانب ہوتا ہے تو سایہ سامنے پڑتا ہے مرزا دوپہر کے قریب اپنے مقتل میں جانے کے متعلق اپنے شوق کو یوں بیان کرتے ہیں کہ میرا سر پاؤں سے دو قدم آگے آتا ہے۔

اس کیفیت کو ہر شخص نصف النہار کے بعد خود دیکھ سکتا ہے۔

رگ و پے میں جب اترے زہر غم پھر دیکھیے کیا ہو
ابھی تو تلخی کام و دہن کی آزمائش ہے

قدرت نے قریب قریب جملہ مہلک سمیات کو تلخ بنایا ہے۔ ہندوستان میں جو زہر زیادہ تر خودکشی کے لیے مستعمل ہے وہ تیلیا، دھتورا، افیون اور کچلہ ہیں یہ سب سخت تلخ ہیں اس لیے سب سے پہلی مشکل ان کا منہ تک لے جانا ہے زہر کا فعل معدہ کے فعل پر منحصر ہے اور دیر طلب ہے۔ چنانچہ دوران سر، برد اطراف، امتلا، غشیان، جریان خون، عطش

ضیق النفس، اور انقباض و تشنج جو موت کی علامات ہیں اس وقت تک شروع نہیں ہوتیں کہ زہر سرایت نہ کر جائے مرزا غم اور رنج کے اثر کا کیا خوب زہر سے مقابلہ کرتے ہیں۔ آغاز میں غم صرف سخت معلوم ہوتا ہے لیکن انجام کار رفتہ رفتہ گھلا کر مار دیتا ہے۔

ہوئے ہیں پاؤں پہلے ہی نبرد عشق میں زخمی
نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

جنگ میں اس سے زیادہ کوئی مجبوری کا عالم نہیں۔ جب تک گولی دل یا دماغ میں نہ لگے انسان کو لڑنے سے فوراً معطل نہیں کر سکتی۔ بسا اوقات جدید باریک کلاہ کی گولیاں فم معدہ میں ایک جانب سے دوسری جانب بلا تکلف شکم سے پشت کی طرف نکل جاتی ہیں۔ اور سوائے خارجی خفیف زخموں کے کوئی اثر نہیں ہوتا غشائے معدہ کے سوراخ فوراً خود بخود مندمل اور بند ہو جاتے ہیں پھیپھڑوں میں جگر میں گولیاں بعض مرتبہ محسوس بھی نہیں ہوتیں اور قریب قریب جزو بدن ہو جاتی ہیں لیکن وقت ہنگام پاؤں پر گولی کا لگنا غضب ہے۔ نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن۔

مرزا غالب نے میدان عشق میں بے بس ہو جانے کی کیا مثال دی ہے۔

باغ پا کر خفقانی یہ ڈراتا ہے مجھے
سایۂ شاخ گل افعی نظر آتا ہے مجھے

ہندوستان میں مغلوں کے زمانے کے بعد سے باغات غیر آباد اور ویران پڑے ہیں۔ سنگ مرمر اور سنگ رخام کی بارہ دریاں شکستہ افتادہ ہیں۔ جہاں شاہزادے اور بیگمات رہتی تھیں وہاں اب جنات اور پریوں کا مسکن ہے۔ جن روشنوں پر کافوری شمعیں روشن رہتی تھیں وہاں اب جگنو اڑتے ہیں۔ نباتات نے وسعتِ انسانی کی قطع و برید سے آزادی پا کر ایک عجیب آوارگی اختیار کر لی ہے۔ پانی کے پاس درختوں کے سائے میں جو پودے ہوتے ہیں وہ اکثر طویل اور نازک تن ہوتے ہیں جن کی شاخیں پتلی ہونے کے باعث پھول کے

وزن میں بھی جھک جاتی ہیں اور ذرا سے ہوا کے جھونکے میں اِدھر اُدھر لہرانے لگتی ہیں۔ شام کے وقت ان شاخوں کا عکس سبزے پر بعینہٖ سانپ کی طرح نظر آتا ہے۔ اگر طبیعت پر مانیایا وحشت یا ہول کا اثر ہو تو اس افعی سے ڈرنا کوئی عجب نہیں۔

نہ پوچھ سینۂ عاشق سے آبِ تیغ نگاہ
کہ زخمِ روزنِ در سے ہوا نکلتی ہے

بھلا اطبا کے علاوہ کون اس بات سے واقف ہے کہ زخم کے خراب ہونے کی علامت یہ ہے کہ اس کے اندر ہوا نفوذ کر جاتی ہے۔ جو زخم سانس دینے لگتا ہے۔ ضرور مہلک ثابت ہوتا ہے۔

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لیے

مرغِ قفس کو کس نے نہیں دیکھا۔ کہاں فضائے نامحدود، کہاں کنج قفس جس میں پروں کو پھیلانے تک کی جگہ مفقود۔ چمن کی ہوا اور ہمدموں کی صدا تک نہیں آتی لیکن تقاضائے حیات پھر بھی نامشکور کوششوں کا خواستگار رہتا ہے جب "دانہ بدل" کا زمانہ آتا ہے تو گو محض تنہائی اور تجرد ہے اور تنکوں کا مہیا کرنا بے معنی لیکن خس قفس میں ضرور جمع کر لیتا ہے۔

(۹)

مرزا غالبؔ کے کلام کی عجیب سادگی اور ہشیاری اور عجیب تر بے خودی اور پرکاری انتہائے کمال ہے۔

بعض نقاد مرزا غالب یا ٹیگور کے کلام کی سادگی سے سخت مغالطے میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ان کے خیال میں یہ بات آتی ہے کہ اس میں خوبی ہی کیا ہے، ہر شاعر ایسا لکھ سکتا ہے۔ یہ ایک فریب ہے۔ ہر شخص اپنے ذہن میں یقین کرتا ہے کہ وہ ان تمام اشیاء کو جو اس کے پیش نظر ہیں خوب جانتا ہے۔ اور ان کے حسن و قبح بیان اور اظہار کی قابلیت رکھتا ہے۔

حالانکہ چند منتخب افراد کے سوا دنیا میں کوئی شخص اپنی گردوپیش کی ادنی اشیا کی محض صورت سے بھی واقف نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر اس سے الفاظ یا رنگ یا آواز میں ان کا نقشہ اتارنے کو کہا جائے تو اس کے دعوے کا باطل ہونا اور اس کا قاصر رہنا قطعی ہے کیا قدرت کے نظارے اور عورتوں کے اجسام کو دیکھنے کی ہر شخص نگہ رکھتا ہے کیا گیوتے (Giotto) اور لارن سیٹی (Lorenzette) کی سادہ تصاویر کا راز یہی ہے کہ وہ فن موقلم کشی اور رنگ آمیزی سے واقف تھے اور اگر تم کو یہ فنون بدرجہ کمال سکھا دیے جائیں تو تم بھی ایسی تصویریں بنا کر اس غلط اندازے میں کبھی مبتلا نہ ہوتا۔

جملہ فنون لطیفہ میں جن میں شاعری بھی شامل ہے بقول فرانسس تامپسن (Francis Thompson) سادگی انتہائے اشکال ہے جب مصور نقش نازبت طناز کو حوالۂ تصویر کرنے کے لیے موقلم اٹھاتا ہے یا شاعر اس مضمون کو جس کو نا واقف بزعم خود آسان جانتے ہیں ادا کرتا ہے تو بتایا مضمون مصور یا شاعر کے سامنے ایک نئی دنیا کی صورت میں نظر آتا ہے۔ جس کو کولمبس (Columbus) کی مثالی کوشش اور نہایت جستجو سے دریافت کرنا پڑتا ہے۔ میکائیل انجلو (Michael Angelo) کا قول ہے کہ تصویر ہاتھ سے نہیں بلکہ دماغ سے کھینچی جاتی ہے۔ جب لیونارڈو ونچی (Leonora Devinci) سے خانقاہ دیلا گراطیا Delle Grazia کے اسقف نے عشائے ربانی کی تصویر بنانے کے لیے کہا تو وہ کئی روز تک صبح سے شام تک اپنا موقلم ہاتھ میں لیے کھڑا رہا اور پردہ کو ہاتھ بھی نہ لگایا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہم ہر تبسم کو دیکھتے ہیں۔ حالانکہ ہم کو صرف ایک دھندلی سی کیفیت سے زیادہ دیکھنے کی قدرت نہیں۔ سوائے فنون لطیفہ کے کوئی بھی عالم کے مظاہرات خارجی اور باطنی کو نہیں دیکھ سکتا اور اسی وجہ سے ان کا اظہار نہیں ہو سکتا۔

جب میں ذیل کی غزلوں کو دیکھتا ہوں تو مجھ کو معا ابن رشیق کا قول یاد آتا ہے۔

فاذا قیل اطمع الناس طرا
واذا ریم اعجز المعجز عیا

جب پڑھا جائے تو ہر شخص کو یہ خیال ہو کہ میں بھی ایسا کہہ سکتا ہوں مگر جب ویسا کہنے کا ارادہ کرے تو عجز بیان عاجز ہو جائیں۔

ابن مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی
نہ سنو گر برا کہے کوئی
نہ کہو گر برا کرے کوئی
روک لو گر غلط چلے کوئی
بخش دو گر خطا کرے کوئی
کون ہے جو نہیں ہے حاجت مند
کس کی حاجت روا کرے کوئی
کیا کیا خضر نے سکندر سے
اب کسے رہنما کرے کوئی
جب توقع ہی اٹھ گئی غالب
کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی
پھر اس انداز سے بہار آئی
کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی
دیکھو اے ساکنانِ خطہ خاک
اس کو کہتے ہیں عالم آرائی
کہ زمیں ہو گئی ہے سرتا سر
روکش سطح چرخ مینائی

سبزہ کو جب کہیں جگہ نہ ملی
بن گیا روئے آب پر کائی
سبز و گل کو دیکھنے کے لیے
چشم نرگس کو دی ہے بینائی
ہے ہوا میں شراب کی تاثیر
بادہ نوشی ہے بادہ پیمائی
کیوں نہ دنیا کو ہو خوشی غالب
شاہ دیندار نے شفا پائی!

☆

کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی
موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی
جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی
ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی
ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے پر نہیں آتی
کعبے کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ
شرم تم کو مگر نہیں آتی

☆

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے
ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے
میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں
کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے
جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے
شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے
نگہ چشم سرمہ سا کیا ہے
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے
ہم کو ان سے وفا کی ہے امید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

ہاں بھلا کر ترا بھلا ہو گا
اور درویش کی صدا کیا ہے
جان تم پر نثار کرتا ہوں
میں نہیں جانتا دعا کیا ہے
میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالبؔ
مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

☆

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی
میری وحشت تری شہرت ہی سہی
قطع کیجے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی
میرے ہونے میں کیا ہے رسوائی
اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی
ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے
غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی
اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو
آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی
ہم کوئی ترک وفا کرتے ہیں
نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی
کچھ تو دے اے فلک ناانصاف
آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
بے نیازی تری عادت ہی سہی
یار سے چھیڑ چلی جائے اسدؔ
گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

☆

کوئی دن گر زندگانی اور ہے
اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے
آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں
سوزِ غم ہائے نہانی اور ہے
بارہا دیکھی ہیں ان کی رنجشیں
پر کچھ اب کے سرگرانی اور ہے
دے کے خط منہ دیکھتا ہے نامہ بر
کچھ تو پیغامِ زبانی اور ہے
قاطعِ اعمار ہیں اکثر نجوم
وہ بلائے آسمانی اور ہے
ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

اب سہل ممتنع سے قطع نظر مشکل اور غریب انداز پر غور کیا جائے تو دلچسپ تر صورت ہے کہ جو لوگ کہ گرم معتدل فرشِ ارض پر رہنے کے عادی ہیں وہ ان لوگوں کی پاک اور خوف آمیز مسرت کو کیا جان سکتے ہیں جو فنونِ لطیفہ کی سرد اور بے داغ برف سے ڈھکی ہوئی مرتفع چوٹیوں میں گشت لگا رہے ہیں۔

کانٹ نے اپنی کتاب Kritik Der Reinen Vernun Urtheil Skraft میں خوب کہا ہے کہ بہت سے اشعار ایسے ہوتے ہیں جن میں "آزاد حسن" ہوتا ہے۔ وہ پھولوں کی طرح اپنے معنی نہیں بیان کرتے بلکہ اپنی خوشبو سے مشام جان کو مسرور کرتے ہیں۔ اگران کے نثر کرنے اوران کے مطالب کے دریافت کرنے کی کوششیں ایسی ہی ہوگی جس طرح کوئی شخص پھولوں کی خوشبو کو پانے کی غرض سے ان پتیوں کو توڑ کر علیحدہ کرے بعض اوقات انسان پر ایک کیفیت طاری ہوتی ہے اس کیفیت میں خواب کی سی حالت ہوتی ہے۔ خواب میں متخیلہ ادراک پر غالب آ جاتی ہے۔ اور عجیب پر لطف پریشان مطلب مظاہر پیش کرتی ہے۔

پال ورلین (Paulverlane) کی مشہور نظم میرا خواب Mou Reve Familien مرزا کے مفصلۂ ذیل قطعہ سے کس قدر مشابہ ہے۔

نشہ ہا شاداب رنگ و ساز ہا مست طرب

شیشۂ مے سر و سبز جو یبار نغمہ ہے

غالب نشہ کو نخل کی طرح شاداب اور ساز کو مے گسار کی طرح مست بیان کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ شیشہ مے سرود کے جوئبار پر ایک سرو سبز ہے۔

بودلیر (Baudelaire) لکھتا ہے کہ شاعرانہ کیفیت میں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب تمام حواس نہایت درجہ تاثرات پذیر اور ذکی الحس ہو جاتے ہیں۔ آنکھیں پردۂ ابد تک دیکھنے لگتی ہیں۔ پر شور مقامات میں حقیقت سے خفیف آواز کو کان سننے لگتے ہیں اور شور سے بالکل نا آشنا رہتے ہیں۔ اختلال خیالات واقع ہوتا ہے اور جملہ اشیائے عالم اپنی صورت سے بسا اوقات دوسری صورتوں میں منقلب ہو جاتی ہیں اور خیالات میں نا قابل حل اطلاق تغیر پیدا ہو جاتا ہے۔ آوازیں رنگیں معلوم ہونے لگتی ہیں اور رنگ میں نغمہ پیدا ہوتا ہے۔

غالب کو نشہ شاداب اور ساز مست اور نغمہ آبِ رواں اور جام سرو سبز نظر آتا ہے۔ لیکن غالب میں یہ کیفیت نہایت معتدل انداز اور صحیح حد تک ہے۔ رمبو (Rimbaud) کی طرح اس حد تک نہیں پہنچی کہ جس طرح حروفی حروف کے اعداد میں معنی نہاں پاتے ہیں وہ ہر حرف میں ایک خاص رنگ پاتا ہے۔ چنانچہ کہتا ہے:

Anoir, E Blane, I Rogue, Uvert, Odleu, Voyelles

غالب کا اس انداز کا کلام سب سے زیادہ فرانسیسی شاعر ملارمی Mellarme سے مشابہ ہے۔

غم آغوش وداع میں پرورش دیتا ہے عاشق کو
چراغ روشن اپنا قلزم صرصر کہ مرجاں ہے
کرے ہے بادہ ترے لب سے کسب رنگ فروغ
خط پیالہ سراسر نگاہ گل چیں ہے
بجا ہے گر نہ سنے نالہائے بلبل زار
کہ گوش گل نم شبنم سے پنبہ آگیں ہے
پر پروانہ شاید بادبانِ کشتی مے تھا
ہوئی مجلس کی گرمی سے روانی دور ساغر کی
میکدہ گر چشم مست ناز سے پاوے شکست
موئے شیشہ دیدہ ساغر کی مژگانی کرے
قطرہ مے بسکہ حیرت نفس پرور ہوا
خط جام مے سراسر رشتہ گوہر ہوا
نہ کی سامان عیش و جاہ نے تدبیر وحشت کی
ہوا جام زمرد بھی مجھے داغ پلنگ آخر

لیکن شاعر نہ جذبہ اور وجدان میں ایک ایسی کیفیت بھی واقع ہوئی ہے جس کو

سرمستی سے مترادف کہا جا سکتا ہے۔جس میں شاعر آفتاب و مہتاب کو اپنے کف دست میں اٹھا لیتا ہے۔اس بے خودی کے عالم میں مرزا نے کلام موزوں کیا ہے۔

مرزا کی دیوانگی جرمن دیوانے شاعر الفرڈ مام بٹ Alfred Mombert سے کچھ کم نہیں۔مام برٹ اپنے جنون میں کہتا ہے:

DA MOND UND SONNE DIR EWIG DALTIST
UND DIR DAS STERNE NGEWOELBE EWIG ATT ITS
UND IN DER FINSTRERNISZERREISST DEIN GANGY LAUCHE MEINEM GEASANG

مرزا صاحب فرماتے ہیں:

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام
مہر گردوں ہے چراغ رہ گزار بادیاں

مرزا اور مام برٹ دونوں ظلمات کی تاریکی میں داخل ہوئے ہیں اور سکندر کی آخری منزل سے بھی آگے نکل گئے ہیں لیکن مرزا صحیح سلامت خضر کی طرح واپس آگئے ہیں اور وہ غریب ہمیشہ کے لیے وہیں رہ گیا ہے۔

فریدرش نطشے اپنی تصنیف ''بقول زردشت'' میں لکھتا ہے:

''میں شعراء سے تنگ ہوں، قدیم شعراء اور جدید سے، وہ سب پایاب پانی میں ہیں، ان کی مثال خشک دریاؤں کی سی ہے۔ان کا تخیل تعلق سے خالی ہے۔ان کے احساسات سطحی ہیں تعیش اور ندی کے چند جذبات کے سوا ان کے دیوانوں میں کچھ نہیں''

مرزا کی شاعری اس الزام سے مطلق بری ہے۔غالبؔ کا دل ایک آئینہ ہے جس میں ہر مظہر الٰہی اور منظر قدرت کا جلوہ موجود ہے۔اس کی زبان ترجمان حقیقت ہے۔اس کے پرکار تخیل کا دائرہ امکان سے ہمکنار ہے۔عالم کون و فساد میں ایک ذرے

کی جنبش بھی اس کے حلقۂ غور سے باہر نہیں ہے غالب ایک فلسفی ہے۔ جو شاعری کا جامہ زیب تن کیے ہوئے ہے۔

غالب وحدت الوجود کے قائل ہیں۔ وہ خدا کو ماسوا سے علیحدہ نہیں خیال کرتے بلکہ ان کا مذہب ہمہ اوست ہے۔ فلسفہ میں کوئی سوال اس سے زیادہ مشکل نہیں کہ دنیا کی آفرینش کس وجہ سے ہوئی ہے۔

غالب اس کا جواب دیتے ہیں اور کہتے ہیں:

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

مبدار عالم حسن ہے اور حسن کو تقاضائے اظہار ہے اس لیے دنیا عدم سے وجود میں آئی ہے۔ دنیا ایک آئینہ ہے جس میں حسن ازل خود بیں ہے۔ یہ خیال مرزا غالبؔ کا اپنا خیال نہیں ہے بلکہ اسلامی تصوف کا عقیدہ ہے مگر جس خوبی کے ساتھ مذکورہ بالا شعر میں مرزا غالب نے اس کو ظاہر کیا ہے مولانا عبدالرحمٰن جامی کے علاوہ کسی نے اس خوبی سے اس کو نظم نہیں کیا۔

اہل تصوف نے اس راہ کو جو طالب کو مطلوب حقیقی تک لے جاتی ہے متن عوالم یا سات واسطوں میں تقسیم کیا ہے۔ ابتدائی عالم ناسوت ہے اس میں ذہن اسرار ہستی کے رازوں کے عقدہ کشائی کرتا ہے اور عقل راہ معرفت کا راستہ دکھاتی ہے۔ غالب عالم ناسوت میں کہتے ہیں۔

صد جلوہ رو برو ہے جو مژگاں اٹھایئے
طاقت کہاں کہ دید کا احساں اٹھایئے۔

مادہ خود بے جان اور جامد ہے جو چیز مادہ کو تحریک و جنبش میں لاتی ہے وہ حرکت

ہے مگر حرکت خود اپنی ذات سے آفرنش کی قدرت نہیں رکھتی جب تک کہ متعین نہ ہو۔ اگر حرکت میں قاعدہ نہ ہوتا تو دنیا عالم فساد سے عالم کون میں نہ آسکتی۔ پس علت العلل وہ ذات یا طاقت ہے جو حرکت کے پس پشت حرکت کو تعین دیتی ہے۔

ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے
پرتو سے آفتاب کے ذرہ میں جان ہے

ہے تجلی تیری سامان وجود
ذرہ بے پرتو خورشید نہیں

عالم جبروت سے عالم لاہوت کا راستہ وادی تحیر میں سے ہے۔ ''العلم حجاب الاکبر'' جس قدر عالم میں زیادتی ہوتی جاتی ہے۔ ماہیت سے بعد ہوتا جاتا ہے۔ شرارہ کا عریاں آنکھ سے نظارہ کرنا اور اس سے واقف ہونا آسان ہے لیکن اگر طاقت ور خوردبین سے اس کا مشاہدہ کیا جائے تو وہ ایک آتش کدہ معلوم ہوگا جس کی کیفیت کو مطالعہ کرنا ناممکن ہے جس قدر حقیقت عالم پردہ سے روشنی میں آتی جاتی ہے۔ دماغ عاجز ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک مدام حیرت اور استغراق کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ مرزا غالب نے اپنی اس کیفیت کو جس خوبی سے اپنے کلام میں بیان کیا ہے اس کی مثال موجود نہیں۔

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

جب کہ تجھ بن کوئی نہیں موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے

شکن زلف عنبریں کیوں ہے
نگہ چشم سرمہ سا کیا ہے
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

ہر چند ہر ایک شے میں تو ہے
پر تجھ سی تو کوئی شے نہیں ہے
ہاں کھائیو مت فریب ہستی
ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے
ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالب
آخر تو کیا ہے اے نہیں ہے

وادیٔ حیرت کا راستہ نہایت پر خطر ہے۔ بہت سے طالب حقیقت اس سے آگے نہیں پہنچ پاتے۔ یہ سراب اور تشنہ لبی کی کیفیت ہے۔

صفائے حیرت آئینہ ہے سامان رنگ آخر
تغیر آب برجا ماندہ کا پاتا ہے رنگ آخر

لیکن جو اہل ظرف ہیں وہ بدیر و بدقت اس وادی کو طے کر جاتے ہیں۔ مرزا غالب اس کیفیت کو جب یہ حجاب ان کی نگاہ سے رفتہ رفتہ اٹھ رہا ہے۔ یوں بیان کرتے ہیں۔

کثرت آرائی وحدت ہے پرستاریٔ وہم
کر دیا کافران اصنام خیالی نے مجھے

آہستہ آہستہ معلوم ہونے لگتا ہے کہ یہ ہنگامہ یہ پری چہرہ لوگ، یہ غمزہ و عشوہ و ادا یہ شکن زلف عنبریں، یہ نگہ چشم سرمہ سا یہ سبزہ و گل یہ ابر و ہوا اصنام خیالی ہیں۔ اس کثرت

کا تسلیم کرنا پرستاریٔ وہم ہے۔ حقیقت سب کی وحدت ہے۔ جب طالب حقیقت سے دوچار ہوتا ہے تو من وتو کے امتیازات مٹ جاتے ہیں اور اللہ اور غیر اللہ کا فرق باقی نہیں رہتا۔

قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے
کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے

منصور کا انا الحق پکارنا اور بایزید بسطامی کا یہ کہنا کہ خدا میرے ملبوس میں ہے اسی کیفیت کا ثبوت ہے۔ سرمد کی طرح مرزا غالب کہتے ہیں۔

جلاد سے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے
ہم سمجھے ہوئے ہیں اسے جس بھیس میں جو آئے

وحدت الوجود کا مسئلہ تصوف سے مخصوص نہیں۔ معتزلہ کا بھی یہی مذہب ہے غیلان دمشقی واصل ابن عطا، عمر بن عبید، مادہ، روح اور خدا تینوں کو ازلی اور ابدی خیال کرتے ہیں۔ خود فلسفہ قدیم وجدید میں یہ ایک معرکۃ الآرا مسئلہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ فلسفے کے جملہ مدارس دو فریق میں تقسیم ہیں۔ وحدت الوجود کے قائل کہتے ہیں کہ تمام عالم مادی کو اگر تحلیل کیا جائے تو اثیر رہ جاتا ہے اور اثیر خود تحلیل ہو کر خیال اور خیال تحلیل ہو کر مسبب الاسباب رہ جاتا ہے۔ افعال کی نیکی اور بدی محض تعلق مادی کی وجہ سے نظر آتی ہے۔ ورنہ جو شے ایک کے خیال میں نیک ہے وہی دوسرے کے خیال میں بد ہے۔ بالذات نیکی اور بدی کا وجود نہیں۔ توحید کے قائل خدا کو خالق اور ماسوا کو مخلوق خیال کرتے ہیں۔ خدا دنیا سے بے تعلق اور آزاد ہے۔ مجوسیت کے پیرو نیکی اور بدی کو اہرمن اور یزداں کی مثال ہمیشہ مصروف پیکار بتلاتے ہیں۔ مادہ اور روح کو متحد بالذات نہیں بلکہ مختلف الذات کہتے ہیں۔

جدید ترین فلسفہ اور حکمت کی تحقیقات وحدت الوجود کی طرف مائل ہے (Spinoza) کا قول نہایت مسلم ہے۔

حکمت میں ہیگل (Heckel) کا فلسفہ ان الفاظ میں بیان ہو سکتا ہے "عالم کا

تمام نقد ونسیہ اثیر ہے۔"

موجودہ زمانے کی سب سے تحقیقات مسئلہ ارتقا ہے۔ اوز مسلمانوں کی کتب ماضیہ میں بھی یہ مسئلہ موجود ہے۔ اور الفارابی، بوعلی سینا اور خصوصاً الحسن کے نام سے منسوب ہے اور بغداد کے کتب خانہ کی تباہی کے باوجود اخلاق ناصری، رسائل اخون الصفاء، فوز الاصغر۔ مثنوی معنوی وغیرہ میں اس کا ثبوت موجود ہے۔ لیکن واقعات کے لحاظ سے اس کا فخر زمانہ جدید ہی کو حاصل ہے ڈارون اور مرزا غالب ہم عصر ہیں گو دونوں کو ایک دوسرے کا کچھ بھی علم نہ تھا۔

مسئلہ ارتقا کے متعلق ایک عجیب بات یہ ہے کہ ڈارون (Darwin) اسپنسر (Spencer) رسل والس (Wallhce) ہیکل (Heckel) وائز مین (Weismann) وغیرہ نے تقریباً ایک ہی وقت میں ایک دوسرے سے آزاد طور پر اس کا پتا لگایا۔ میری رائے یہ ہے کہ ہر عہد کی روح العصر ہوتی ہے جس کو المانی (Zeitgeist) کہتے ہیں۔ وہ روح القدس کی طرح حسب ضرورت زمانہ انسان کو تعلیم دیتی ہے۔ مرزا غالب نے بھی مسئلہ ارتقا کو پہنچاتا ہے۔

لوٹ زے (Lotze) کا بیان ہے کہ عالم کی یہ کیفیت ہے۔ جس طرح بیج رفتہ رفتہ منازل بہ منازل نمو پذیر ہو کر تناور درخت ہو جاتا ہے۔ 'یہ جان عالم' ہے۔

فان ہارٹ مان (Von Hertman) اس کا قائل ہے۔ زمانہ جدید کا سب سے بڑا فلسفی برگساں (Elan Devic Bergson) اس کو جانتا ہے اور کہتا ہے کہ حیات ہی تمام عالم میں جاری وساری ہے بالذات آمادہ ارتقا ہے۔ دنیا برابر تکمیل پا رہی ہے اور منتظر ہے۔ مرزا غالب نے اس بات کو کس نزاکت سے کہا ہے۔

آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیش نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

یعنی معشوق عالم جو موجودات کے نقاب میں نہاں ہے برابر اپنی جمال آرائی میں مصروف ہے اور آئینہ نقاب ہی میں لیے ہوئے اپنے غازے کو درست کر رہا ہے۔ جب عالم تکمیل کو پہنچ جائے گا تو نقاب الٹ دے گا عالم کو دیکھنے سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ ابھی کسی چیز کی کمی ہے۔ شش جہت آراستہ ہو رہے ہیں اور منتظر ہیں۔

کس کا سراغ جلوہ ہے حیرت کو اے خدا
آئینہ فرش شش جہت انتظار ہے

(۱۱)

غالب عالم کو مایا خیال کرتے ہیں:

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
جز نام نہیں صورت عالم مجھے منظور
جز وہم نہیں ہستیٔ اشیاء مرے آگے

یہ اپنشدوں کی قدیمی تعلیم ہے لیکن ہندو عام طور پر اس کا مفہوم غلط سمجھتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ عالم کا وجود ایک فریب نگاہ ہے، ایک دشت سراب ہے جو خواب میں نظر آتا ہے۔ ایک خواب ہے جو چشم کور عالم رویا میں دیکھتی ہے۔ مرزا غالب کی حقیقت میں عقل اس مغالطے سے آزاد ہے۔ غالب لفظ ہستی کو ہمیشہ مادہ کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ وہ مادہ کے منکر ہیں۔ عالم گو اجسام خارجی سے مملو نظر آتا ہے۔ اور غایت لطیف غازیات سے لے کر غایت گراں فلزات تک عناصر سے پُر ہے۔ مادہ کا وجود محض بالنسبت ہے بالذات نہیں زندگی کی جیتی جاگتی چلتی پھرتی تصویریں، حرکات، اصوات الوان کوئی وجود نہیں رکھتیں۔ جب تک کہ ذہن ان کا ادراک نہ کرے۔ وجود کی بنا تصور پر ہے۔ یہ تصور کوشش سے آزاد ہوتا ہے۔ بعض نے اس پر یہ اعتراض عاید

کیا ہے کہ فرض کرو کہ ہم اپنے دوست کو جو موجود نہیں اپنے پہلو میں موجود تصور کریں تو اس فلسفہ کی رو سے اس کا غائب اور حاضر ہونا مساوی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ متخیلہ کی مدد سے کسی تصور کا قائم رہنا ایک مدام اور متصل کوشش پر منحصر ہے جب تک تم اپنے دوست کا خیال کرتے رہو گے اور جتنی تکلیف اور محنت سے تخیل کو کام میں لاؤ گے وہ نقش قائم رہے گا۔ جہاں خیال اس نقطہ سے آوارگی اختیار کرے گا نقش محو ہو جائے گا۔ بخلاف اس کے موجود اشیاء کا تصور کوشش سے آزاد ہے۔ دوسرا اعتراض یہ کیا جائے گا کہ اگر تمہارا فلسفہ یہ ہے کہ تمہارے وجود سے عالم مادی کا وجود ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ تمہارا خاتمہ خود دنیا کو ختم کر دے گا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ 'انا' نے جہاں مادہ کو اپنے تصور سے قائم کیا ہے وہیں یہ بھی معلوم کیا ہے کہ خود اس سے مماثل اور بہت سے ''انا'' موجود ہیں جو میری طرح سے فاعل اور مختار ہیں۔ بہت سے مظاہر جو اس کے اثر اور اقتدار سے باہر ہیں ان کے اثر اور اقتدار میں ہیں۔

تمام مادہ جس میں خود میرا جسم اور بنی نوع کے اجسام شامل ہیں بے جان اور بے کار ہے۔ وہ روح وہ رواں وہ خیال جو ان پر فاعل ہے حقیقت ہے۔

غالب کا فلسفہ سپی نوزا (Spinoza) ہیگل (Hegel) برکلے (Berkly) اور فشطے (Fichte) سے ملتا ہے۔

حکمت کی رو سے بھی مرزا غالب کا خیال صحیح ہے مادہ سالمات سے سرکب ہے اگر پانی کے ایک قطرہ کو کرۂ ارض کے برابر خیال کریں تو اس کے سالمات چوگان کی گیند سے بڑے نہ ہوں گے۔ یہ تمام سالمات رقصاں حلقوں کی مثال ہیں۔ سالمات اجزا سے مرکب ہیں۔ جواب لاتجزی خیال نہیں کیے جاتے بلکہ جواہر برق سے مرکب مانے جاتے ہیں۔ ہر جزو کو اگر ایک کلیسا سے مشابہ خیال کریں تو بقول سر اُلیور لاج (Lodge) یہ جواہر کلیسا میں اڑتی ہوئی مکھیوں کی مثال ہیں۔ اگر ان کو تخیل پھر تحلیل کرے تو ان کی ساخت حلقہ ہائے

اثیر سے ہوئی ہے اور اگر اثیر کے حلقوں کی گرہ کھل جائے تو محض خیال باقی رہ جائے۔
کانٹ (Kant) لا پلاس (Laplace) اور ہرشل (Herschel) اور ان کے جانشینوں
سے ہم کو یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ نظام ہائے فلکی کی آفرینش اثیر سے اس طرح ہوئی جس
طرح کسی خرد پر سے ٹکڑے جو کردیت میں حائل ہوتے ہیں ٹوٹ کر علیحدہ ہو جاتے ہیں یا
جیسے کوئی کسی چیز کو پھینکتا ہے۔ مرزا غالب کو خورشید کی نسبت یہ کہاں سے معلوم ہوا۔

چھوڑا مہ نخشب کی طرح دست قضا نے
خورشید ہنوز اس کے برابر نہ ہوا تھا

جس شخص کی نگاہ سے ستاروں کی آفرینش مخفی نہ تھی، اس کے لیے جغرافیہ، جدید
تحقیقات کیا حقیقت رکھتی ہے:

بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

(۱۲)

مرزا غالب کی عبادت گاہ عرش و کرسی کے سائے میں ہے وہ تسبیح جس پر وہ
اسمائے الٰہی کا وظیفہ پڑھتے ہیں صد ہزار دانہ ہے اور وہ دانے اجرام فلکی اور اجرام سماوی
ہیں۔ کعبہ اور دیر، کلیسا اور کنشت اس رفیع بارگاہ سے یکساں نظر آتے ہیں جہاں عوام و خواص
کا مذہب فنتی ہو جاتا ہے۔ مرزا کا مذہب آغاز ہوتا ہے۔

ہے پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود
قبلہ کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں

ذات خداوندی گو جملہ مذہب کا مقصود ہے۔ خدا تعالیٰ خود طریق و ملت کی قید
سے آزاد ہے مرزا غالب بھی کسی ارضی مذہب کے پابند نہیں بلکہ

I sit as God holding on form of creed but con

templating all.

ان کو ہر مذہب کا اس قدر پاس ہے کہ انہوں نے سب میں شرکت کی خاطر تمام کی ظاہری رسوم کو جو باعث امتیاز ہیں ترک کردیا ہے۔

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

ان کی طلب اور آرزو دوزخ کے عذاب کے خوف اور جنت کی لذات کی حرص سے آزاد ہے۔

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس قدر باغ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بے خودوں کے طاق نسیاں کا

جنت فی الحقیقت عوام کے لیے ایک خوش آئند خیال ہے۔

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

حقیقی بہشت قرب الٰہی اور حقیقی جہنم بُعد خداوندی ہے۔

سنتے جو ہیں بہشت کی تعریف سب درست
لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو

اگر جنت کی ہوا و ہوس، دوزخ کا خوف و ہراس دل پر غالب ہو تو عبادت عین معصیت ہے۔ یہاں تک کہ اگر طالب کو یقین ہو کہ اس کی مناجات درجہ قبول ضرور حاصل کرے گی تو یہ خیال ہی سجدۂ نیاز کو باطل کردینے کے لیے کافی ہے۔

گر تجھ کو ہے یقین اجابت دعا نہ مانگ
یعنی بغیر یک دل بے مدعا نہ مانگ

جنت اور دوزخ اور امید و بیم مانع عشق حقیقی اور معرفت ایزدی ہیں۔ اللہ اکبر کس مقام پر نشستہ ہیں جہاں سے یہ فتویٰ صادر فرمایا۔

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

اس پایہ کے لوگ جب سفر کعبہ کو نکلتے ہیں تو کعبہ خود ان کے استقبال کو آتا ہے۔ اس جادہ پیائی کا جو سفر نیاز میں ہے، ایک قدم اس تمام زندگی کی مسافت سے جو سفر نماز میں ختم ہو زیادہ ہے۔ ایسے آوارگان کوئے صنم کی خودآرائی کا کیا کہنا ہے عمر خیام کہتے ہیں کہ جب قیامت میں مجھ سے سوال ہوگا تو میں کہوں گا:

ایں راہبہ کے بگو ترا نہ شناسد

مرزا غالب کہتے ہیں:

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا

کیا عجب ہے کہ حضور داور محشر ہیں، یہ عرض کریں۔

آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ
ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یا رب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

جو عبادت اس درجہ پر پہنچاتی ہے وہ قید کفر و دیں سے آزاد ہے وہ عشق کامل ہے۔

وفاداری بہ شرط استواری عین ایماں ہے
مرے بت خانے میں تو گاڑو کعبہ میں برہمن کو

(۱۳)

انسان کی اصل مرزا کے خیال میں علت العلل سے ایک ہے اور حیات اس کا اپنے مبدا سے جدا ہو کر دنیا میں آنا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں:

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

انسان کا عدم سے وجود میں آنا بحر سے قطرہ ہو جانا ہے۔ مولانا روم نے فرمایا ہے کہ میں "نے" ہوں جس میں وہ سرود نواز عالم صوت سرمدی دم کرتا ہے۔

از نیستاں تا مرا ببریدہ اند
از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند

مرزا غالب کہتے ہیں:

نہ گل نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

مرزا غالب کا فلسفۂ حیات ابن رشد سے مشابہ ہے۔ اندلسی فلسفی نے بیان کیا ہے کہ مادہ ہمیشہ ہیولیٰ کا محتاج ہے۔ بے صورت مادہ کا تصور ناممکن ہے ہیولیٰ ارواح کی طرح مادہ سے صورت آشنا ہونے کے لیے پریشان علیحدہ تصور میں نہیں پھرتے بلکہ مادے سے یک جاں ہیں۔ مادہ چونکہ سافل سے مادہ کے جزو حیات ہونے سے کثافت اور خرابی عالم اجسام میں راہ پاتی ہے مادے کے ذریعے زوال اور انحطاط ابتدا ہی سے جزو بدن ہو جاتے ہیں۔

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برق خرمن کا ہے خون گرم دہقاں کا
تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا
اڑنے سے پیشتر ہی مرا رنگ زرد تھا

وہ شے لطیف جو مادہ کی آمیزش سے حیات کو تکمیل (Entelechia) دیتی ہے روح ہے۔ روح مادہ کے مجلس میں اسیر ہونے سے گھبراتی ہے اور اپنے ماضی کو یاد کر کے فریاد کرتی ہے۔

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں

نہ جانوں نیک ہوں یا بد ہوں پر صحبت مخالف ہے
جو گل ہوں تو ہوں گلخن میں جو خس ہوں تو ہوں گلشن میں

لیکن یہ روح اور مادے کا امتیاز حقیقت میں ایک فریب خیال ہے ورنہ مادہ محض مایا ہے جب ادراک کامل اور عقل رسا ہو جاتی ہے تو مادے کی غیریت خود بخود زائل ہو جاتی ہے۔

اتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بعد ہے
جتنا کہ وہم غیر سے ہوں پیچ و تاب میں

جو جراز عالم سے واقف ہو جاتے ہیں وہ آلام اور تکلیف نہیں پاتے اور شکایت نہیں کرتے بلکہ فلسفۂ غم حیات کے ہم معنی اور مترادف ہو جاتا ہے۔

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

عیش ونشاط دنیا کمزوروں اور کم ظرفوں کا حصہ ہے جو زندانِ آتش نوش ہیں ان کے لیے شراب غم مخصوص ہے جو کیف رنج سے معمور ہے۔

در خورِ قہر و غضب جب کوئی ہم سا نہ ہوا
پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا

پوچھے ہے کیا وجود عدم اہلِ شوق کا
آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے

جمال ایزدی غایب خوب ہے مگر جلال ربی جس کے ہیبت انگیز جلوے کی نہ موسیٰ اور نہ طور تاب لا سکے کمال حسن ہے۔ ٹیگور کہتے ہیں:

"خوبصورت ہے ستاروں سے آراستہ و مختلف رنگ کے جواہرات

سے جڑا ہوا تیرا کنگن لیکن میرے لیے تو اس سے کہیں زیادہ
خوبصورت ہے تیری تلوار محترم طائر وشنو کے پھیلے ہوئے بازو کی
طرح بجلی کا سا خم رکھنے والی تلوار غروب آفتاب کی غصہ ناک سرخ
روشنی میں پوری طرح تلی ہوئی تلوار۔
وہ کانپتی ہے جیسے موت کی فیصلہ کن ضرب پر شدت درد میں زندگی کا
آخری جواب، وہ چمکتی ہے جیسے ایک خوفناک چمک کے ساتھ دنیاوی
حس کو جلا دینے والا پاک شعلۂ ہستی۔ خوبصورت ہے۔ تاروں جیسے
جواہرات سے مزین تیرا کنگن تیری تلوار کی ساخت میں اے گرج
کے مالک کمال حسن صرف ہوا ہے۔ جو بصارت و تخیل دونوں کے
نزدیک مہیب ہے۔"

یہی باعث ہے کہ مرزا غالب نے افلاطوں کے استاد سقراط کی مثال تلخ زہر آب کو ہمیشہ نوش شیریں پر ترجیح دی۔ غالب کا علم الاخلاق جاں سپاری اور:

جاں سپاری شجر بید نہیں

(۱۴)

مرزا غالب ان تابوت بردوش فلسفیوں میں نہیں ہیں جو زندگی کو ماتم خانہ اور اہل دنیا کو اصل جنازہ خیال کرتے ہیں۔ وحدت الوجود کے فلسفہ کا پہلا سبق یہی ہے کہ ماسوا اور خدا صرف عارضی طور پر جدا ہیں اور بعد الموت پہ یہ جدائی ختم ہو جاتی ہے۔

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

انسان خود کو اپنی غلط بینی سے اور افراد سے علیحدہ اور اپنے ماحول سے جدا خیال کرنے لگتا ہے اور یہ خیال کرتا ہے کہ دنیا میں اجنبی ہوں اور مخالف اشخاص اور قوانین سے گھرا ہوا ہوں لیکن انسان اور علاوہ میں حقیقت میں کوئی رخنہ حائل نہیں ہے۔ یہاں تک کہ

موت بھی اس میں رخنہ پیدا نہیں کرتی۔

اپنشدوں میں لکھا ہے:

''موت اور بقا اس کا سایہ ہے'' موت اور حیات میں کوئی فرق نہیں نہ تضاد ہے بلکہ حیات ہی موت ہے۔ حیات کی آمد زندگی اور رفت موت ہے۔ موت حیات عارضی کو دائمی کر دیتی ہے۔

فنا کو سانپ اگر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا
فروغ طالع خاشاک ہے موقوف گلخن پر
عشرت قتل گہ اہل تمنا مت پوچھ
عید نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا
جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا
نظر میں ہے ہماری جادۂ راہ فنا غالبؔ
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

مرزا غالبؔ موت کے مقابل ہیں خائف بچہ کی مثال نہیں ہیں وہ ان میں نہیں ہیں جو جس قدر موت کے خیال سے خالی الذہن ہونا چاہتے ہیں اتنا ہی خیال مرگ ان کو ستاتا ہے موت کا خوف خوف کرنے سے بڑھتا ہے موت کو خواہ مخواہ سخت بنا رکھا ہے۔ بیکن کا قول ہے۔

Pompa Mortismagis Terret Quam More IPSA

لیکن موت بھاری نہیں، موت سے زیادہ سہل کوئی اور چیز نہیں۔

ہے تو آموز فنا ہمت دشوار پسند
سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

موت سے انسان کے گھبرانے کی وجہ یہ ہے کہ اس کو یہ خوف دامن گیر ہے کہ کہیں ماطرلنگ (Maeter Link) نے بیان کیا ہے ہستی محض یادوں کا مجموعہ ہے جو چیز ہمیں تمام علاوہ سے ایک عارضی امتیاز دے رہی ہے وہ چند یادوں کے اجزائے پریشاں ہیں اور عارضی امتیاز ایسا عارضی ہے کہ نشہ ے "عالم خواب" جنون صدمات عارضی رویا تک میں قائم نہیں رہتا یا منقلب ہو جاتا ہے۔ مرزا غالب اس خوف میں جتلا نہیں ہیں بلکہ ان کی سکون وطلب طبیعت کو یہ اندیشہ ہے کہ کہیں احیائے بعد الموت بھی ایک تنازع للبقا اور کون فساد ہی نہ ہو۔

وائے واں بھی شور محشر نے نہ دم لینے دیا
لے گیا تھا گور میں ذوق تن آسانی مجھے

موت سے زیادہ گوارا کوئی نیند نہیں۔ سکرات اور نزع تو زندگی کا جاتا ہے موت کا آزار نہیں موت تو تمام تکالیف ارضی کو ختم کر دیتی ہے۔ آلام جسمانی سے نجات دلاتی ہے اور عذاب روحانی سے آزاد کرتی ہے۔ باغ عالم میں افراد ثمار کی مثال ہیں۔ بہت سے ترش ہوتے ہیں۔ جن کو تا ختم بہار پختہ ہونے کے لیے انتظار کرنا پڑتا ہے۔ بعض شرینی کو پا ہی نہیں سکتے اور محض بزدلی کے باعث اپنی شاخوں کو خیر باد نہیں کہتے۔ بعض اپنی گراں باری سے شاخوں کو توڑ دیتے ہی، بعضوں کو ہوائے تند خراب کر دیتی ہے، بعض کو خار پا طائر رات کو کھا جاتے ہیں۔ بعض کے قلب میں ویدان گھر بنا لیتے ہیں۔ بعض کا رنگ خوبصورت ہوتا ہے۔ لیکن حلاوت سے عاری ہوتے ہیں۔ بعض کو خوشبو رکھتے ہیں، ذائقہ ان کا تلخ کام کرتا ہے۔ بہت سے بچے ضعیف پیدا ہوتے ہیں تو بہت سے ضعیف تا دم گور بچے ہی رہتے ہیں بعض جوانی میں سر سفید ہو جاتے ہیں، بعض پیری میں بھی سر سیاہ دندان سفید رہتے ہیں لیکن موت کے آرام کی سب کو ضرورت ہوتی ہے۔

ڈھانپا کفن نے داغِ عیوب برہنگی
میں ورنہ ہر لباس میں ننگ وجود تھا

سپاہی اپنی موت تلوار سے چاہتے ہیں۔ منجم پہلے سے اپنے آخری وقت سے مطلع ہونا چاہتے ہیں۔ شعرا فصل بہار میں غنچہ ریز مولسریوں میں دب کر مدفون ہونا پسند کرتے ہیں لیکن یہ سب خامی ہے جو اہل ظرف ہیں ان قیود کے قائل نہیں۔

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہ کن اسدؔ
سر گشتۂ خمار رسوم و قیود تھا

موت کے بعد جسم محض ایک کالبد، ایک نشان رفتگاں سے زیادہ نہیں۔ روح کا چلا جانا اصلی واقعہ ہے جسم کا رہ جانا اس سے زیادہ نہیں جیسے کہ گل کی پریشاں پنکھڑیاں خشک ہوکر گر پڑتی ہیں۔ جس طرح صبا گلاب کی پتیوں کو اُڑا کر ڈھیریاں لگا دیتی ہے اور کہاں سے کہاں لے جاتی ہے اس جسم کو بھی ہونا چاہیے۔ اس کو مضبوط اور قیمتی صندوقوں میں سجانے، آگ کے مقدس شعلوں کے نذر کرنے کی کیا صورت ہے۔ سب سے بہتر یہ ہے کہ شراب ساز کو دے دیا جائے کہ وہ اسے بادہ میں آغشتہ کرکے اس سے پھر جام تیار کرے یا گلیوں میں تشہیر کیا جائے تا کہ ایک آخری کام اس سے بھی سرانجام ہو۔

گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں
جاں دادۂ ہوائے سر رہ گزار تھا

(۱۵)

خندہ کیا ہے؟ ارسطو کے زمانے سے آج تک فلسفی اس مسئلے پر غور کرتے آئے ہیں۔ ہمارے زمانے میں کانٹ (Kant) اسپنسر (Spencer) ہیکر (Hecker) کریپ لین (Kracplin) لپس (Lipps) میرے ڈتھ (Meredith) اور برگساں (Bergson) نے اس پر تفصیل سے بحث کی ہے اور عجیب نادر نکات پیدا کیے ہیں۔

قہقہہ ہمیشہ مجلسوں میں بلند ہوتا ہے۔ جہاں گرم صحبت نہیں یہ ساز محفل بھی نہیں۔ اسی وجہ سے لکھنو کے قیصر باغ کے عیاشانہ جلسوں کے رند، انشا اور جرات اور آگرہ کی برج کی ہولیوں کے کنھیا، نظیر کے قہقہوں کی آواز آج تک بلند ہے اور میر تقی، اسیر درد اور غالب کے کلام میں جو دنیا سے نفور اور ہنگامۂ عالم سے دور رہنے والوں میں کمال سنجیدگی اور خاموشی کا اثر ہے۔

قہقہہ قدرت کا غلبۂ نفس کو دور کرنے کا ذریعہ ہے۔ یہ صحت بخش ضرور ہے ایک خود اخلاط کی زیادتی اور مرض کی علامت ہے۔ چنانچہ رنگین اور دیگر ہزل سرا شعراء کا اصلی علاج بذریعہ فصد ہونا چاہیے تھا۔

مرزا کی طبیعت میں خیالات کو مطلق بار نہیں۔ خندہ اصلح عیوب کے لیے ایک تازیانہ ہے۔ اس میں انصاف نہیں بلکہ ظلم پایا جاتا ہے۔ سوداؔ اور اکبر کے قہقہوں کی یہی شان ہے۔ غالب کی طبیعت میں رحم ہے وہ انسانی کمزوریوں پر لب آسا ہنستے نہیں بلکہ چشم آسا روتے ہیں۔

خندہ لاتعلقی کی علامت ہے۔ زندگی کو ہر شخص دور سے دیکھتا ہے اور خود بے پروا رہتا ہے وہ ہنستا ہے اور جو قریب سے دیکھتا یہ اور اس میں شریک ہوتا ہے۔ وہ نہیں ہنستا۔ غالب زندگی کی خارجہ کیفیات سے اندرونی جذبات کا اندازہ نہیں کرتے بلکہ اپنے اندرونی جذبات سے خارجی کیفیات کا موازنہ کرتے ہیں، اس لیے غالبؔ کے لب ہنسی سے نا آشنا ہیں۔

خندہ غم سے ناواقف ہونے کی اور لطف خواب کی علامت ہے۔ اطفال شیر خوار سوتے میں ہنستے ہیں۔ لیکن جب بیدار ہوتے ہیں۔ جب تک انسان آلام اور مصائب سے شناسا نہیں ہوتا ہنستا رہتا ہے۔ لیکن جب دل ٹوٹ جاتا ہے و بجز غم کے کوئی رفیق نہیں رہتا۔ بدنصیب مرزا سے قہقہۂ نشاط کی امید رکھنا بے جا توقع ہے۔

خندہ، غم اور سکون کو چھپانے کا پردہ بھی ہے۔ اس مسئلے پر برگساں (Bergson) اور غالب متفق ہیں۔ برگساں اپنی کتاب خندہ (Lerire) کے اختتام پر لکھتا ہے۔

''سمندر میں سطح پر موجوں میں رقص اور ارتعاش پایا جاتا ہے۔ لیکن عمق قلزم میں ہمیشہ امن وسکون ہوتا ہے۔ بالائے آب لہریں آپس میں ٹکراتی ہیں اور کف لے آتی ہیں۔ بچے کف دریا کو ''نمش'' جان کر ساحل سے اٹھا لیتے ہیں لیکن جب ہاتھ کھول کر دیکھتے ہیں تو بجز پانی کے کچھ بھی نہیں پاتے۔

قہقہہ زندگی کے سمندر کا کف ہے جو شخص اس کے رقص کو فاصلے سے دیکھتا ہے خوش ہوتا ہے اور آفتاب سے اس کا مسام دار جسم روشن ہو کر طلسم نور نظر آتا ہے لیکن جو قریب جاتا ہے محض فریب پاتا ہے اور تلخ کام ہوتا ہے۔''

مرزا یوں فرماتے ہیں:

عرض ناز شوخیِ دنداں برائے خندہ ہے
دعویٔ جمعیتِ احباب جائے خندہ ہے
ہے عدم میں غنچہ محو عبرت انجام گل
یک جہاں زانو تامل در قفائے خندہ ہے
کلفت افسردگی کو عیش بیتابی حرام
ورنہ دنداں دردل افشردن بنائے خندہ ہے
شورش باطن کے ہیں احباب منکر ورنہ یاں
دل محیط گریہ و لب آشنائے خندہ ہے

لیکن مرزا کو کبھی بلند آواز سے نہیں ہنستے گاہ گاہ زیر لب تبسم ضرور کرتے ہیں۔ ان

کا تبسم تمسخر نہیں بلکہ مزاح (Espirit) کا انداز رکھتا ہے۔ یہ ابتسام معشوق کے کسی خلاف عادت کام سے یا اپنے خلاف عادت، ارادے یا واقعے سے پیدا ہوتا ہے۔ اس میں کسی کی بابت کسی کے متعلق کوئی حملہ یا اشارہ عیاں یا پنہاں نہیں ہوتا بلکہ بقول وکٹر ہیگو (Victor Hugo) اس کا منشا (Pourle Plasa Pour Pien) ہوتا ہے۔

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دور جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں
اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں
میں نے کہا بزم ناز چاہیے غیر سے تہی
سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں
کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی
بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو
صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو
دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کئے
مگر لکھوائے کوئی اس کو خط تو ہم سے لکھوائے
ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے
گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

انھیں وجوہ سے مرزا نے کبھی کسی کی ہجو نہیں لکھی۔ ایک شعر کی نسبت جو شہزادہ جواں بخت کے سہرے کا مقطع ہے، یہ کہا گیا تھا کہ ذوق پہ حملہ ہے لیکن مرزا قطع گزارش میں کہتے ہیں کہ مقطع میں محض سخن گسترانہ بات آپڑی ہے اور کمال فراخ دلی سے اس تصور کے

لیے بھی معافی کے طالب ہیں۔ آ زرودن دل دشمناں خطاست

دو ایک اشعار کی نسبت گمان ہو سکتا ہے کہ ذوق پر، جن سے چشمک ضرور تھی۔

زد ہے۔

میں جو گستاخ ہوں آئین غزل خوانی میں
یہ بھی تیرا ہی کرم ذوق فزا ہوتا ہے
رکھیو غالبؔ مجھے اس تلخ نوائی سے معاف
آج سینے میں مرے درد سوا ہوتا ہے
بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالبؔ کی آبرو کیا ہے

یہاں خیال یہ ہے کہ لفظ غالب میں ابہام ہے لیکن یہ موشگافی ہے اور عیب جو کا اپنا آپ قصور ہے۔

ملک ناروے کا مشہور ادیب (Henrik Ibsen) ہنرک ابسن اپنے ناٹک (Kongs Emnerne) ''دار ثان تخت میں بادشاہ اور مغنی کے درمیان مفصلہ ذیل گفتگو لکھتا ہے۔

بادشاہ: تم کس طرح مغنی ہو گئے۔ تم نے فن موسیقی کس سے حاصل کیا؟

مغنی: جہاں پناہ۔ فن موسیقی تحصیل نہیں ہو سکتا۔

بادشاہ: نہیں

مغنی: نہیں میں نے یہ خداداد اکرام غم کے ہاتھوں پایا ہے۔

بادشاہ: تو کیا مغنی ہونے کے لیے غم کی ضرورت ہے۔

مغنی: مجھ کو غم سے یہ دولت ملی۔ بعض کو مسرت سے یہ نعمت حاصل ہوتی ہے۔

اور......

بادشاہ: اور......

مغنی: تیقن سے جو ایمان کے درجہ تک ہو اور شک سے......

بادشاہ: شک سے بھی۔

مغنی: جو ایمان کے درجہ تک ہو ناقص نہ ہو۔

بادشاہ: ناقص شک کس کو کہتے ہیں۔

مغنی: جہاں پناہ جس میں شک کرنے والے کو خود اپنے شک میں شبہ ہو، یہ شفق ہے۔ جو نور اور ظلمت، دن اور رات دونوں سے محروم رکھتی ہے۔

مرزا غالب اپنے شک میں کامل ہیں۔ چنانچہ دریافت کرتے ہیں۔

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں
جاں کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دمِ سماع
گر وہ صدا سمائی ہے چنگ و رباب میں
شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں
جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے
شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے
نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے
ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالب
آخر کیا ہے تو ہے "نہیں ہے"
یا رب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے
لوحِ جہاں پہ حرف مکرر نہیں ہوں میں

جب عمر خیام کی شیرازی شراب کو فزجیرالڈ (Fitz Jerald) نے ابریق مغرب میں محفل فرنگ میں پیش کیا تو سب نے یہ سوال کیا کہ یہ مینائے معرفت ہے یا بادۂ مجاز۔ مغربی عمر خیام کے کلام میں ابیقیورس کے فلسفۂ ابتہاج کی شوخی اور ریا کی پاتے ہیں اور خیال کی تلقین، لذات، و شہوات سے متمتع ہونے اور دنیاوی لذائذ کے ذریعے سے نفس کو تسکین دینے میں خیال کرتے ہیں۔

اگر غالب کا انگریزی، المانی فرانسیسی یا روسی زبان میں ترجمہ ممکن ہو اور کیا جائے تو عجب نہیں کہ یہی سوال غالب کے متعلق پیدا ہو لیکن مرزا کی شراب طہور کے ثابت کرنے کے لیے کسی علم البیان کے رسالے کی مدد ضروری نہیں بلکہ خود ان کا بیان موجود ہے۔

مطلب ہے ناز و غمزہ و لے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر
ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادۂ و ساغر کہے بغیر

مرزا کی شراب سے بے خودی مراد ہے۔ یہ وہ کیفیت ہے کہ جہاں سالک راہ طریقت فریضۂ حج ادا کرنے کے لیے باادب اور خاموش جا رہے ہیں۔ یہ سر راہ بیٹھے اللہ ہو

کے نعرے لگا رہے ہیں۔

(چوں عمر تبہ کردم چنداں کہ نگہ کردم
در کنج خراباتے افتادہ خراب اولےٰ)

لاف دانش غلط و نفع عبادت معلوم
درد یک ساغر غفلت ہے چہ دنیا و چہ دیں

ہرزہ ہے نغمۂ زیر و بم ہستی و عدم
لغو ہے آئینۂ فرق جنون و تمکیں

زمزم ہی پہ چھوڑو مجھے کیا طوف حرم سے
آلودہ بہ مے جامۂ احرام بہت ہے

یہ سرمستی و مدہوشی کم مائگی نہیں ہے بلکہ خم خانہ جاوید میں داخل ہو کر شراب بے اندازہ پی گئے ہیں۔ یہ کیف سرمدی ہے۔ یہ عشق الٰہی کے نشہ میں غش ہیں۔ کون ایسا ہے جو اس کیف میں سرشار ہو کر ہوش مند رہ سکتا ہے۔

حریف جوشش دریا نہیں خودداریٔ ساحل
جہاں ساقی ہو تو باطل ہے دعویٰ ہوشیاری کا

انھیں کا ظرف ہے کہ اس دانش ربا شراب کو جس کو دوسرے کبھی نہیں لے سکتے پیتے ہیں۔ یہ وہ شراب ہے کہ جب ساقی جام میں ڈالتا ہے تو مسیح اور خضر رشک سے سبقت کے لیے کشاکش کرتے ہیں۔

بہشت کی آرزو بھی یہی ہے کہ ایک ہاتھ میں زلف یار ہو اور ایک میں یہ شراب ہو۔

وہ چیز جس کے لیے ہو ہمیں بہشت عزیز
سوائے بادۂ گلفام مشک بو کیا ہے

وہ کیسے خوش قسمت ہیں جن کو یہ دولت قسمت ہے:

جاں فزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آ گیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگ جاں ہو گئیں

آہ تا دم آخر کیا آرزوئے بے خودی ہے:

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

مادہ خود بے صورت ہے۔ مادے میں نہ کوئی خوش صورتی ہے ورنہ بدہئیتی ہے، حسن خارج نہیں باطن ہے۔ حسن مادے کے جسم میں نہیں بلکہ صاحب نظر کی نگاہ میں ہے حسن بیں کا قلب شعلہ ہے۔ مادہ صرف پردۂ فانوس ہے شاعر جو حسن کو دیکھ کر محو تماشا ہو جاتا ہے اور اپنی ذات کو خوبصورتی میں فنا کر دیتا ہے۔ یہ کیا ہے؟ عدم اور ازل میں جو صورت دیکھی ہے وہ شرار کے تبسم کی مثال نظر آتی ہے اور منھ چھپا لیتی ہے۔ نہال ثمر در میں یا عشق پیچاں میں پھولوں میں یا عطر میں، عورت میں خواہ دوشیزہ ہو یا نادوشیزہ کوئی حسن نہیں، حسن اس اشارے میں ہے جو جمال الٰہی ان کے ذریعے سے کرتا ہے۔

مرزا غالب کو ہر طرف جو جلوۂ روئے صنم نظر آتا ہے وہ "رخ لیلیٰ" نہیں بلکہ عارض جاں عالم ہے۔ یہاں تک کہ جب ہر آنکھ اس کی دید کی تمنا رکھتی ہے۔

جلوہ از بسکہ تقاضائے نگہ کرتا ہے
جوہر آئینہ بھی چاہے ہے مژگاں ہونا

لیکن وہ معشوق اپنے وصل سے کسی کو خوش کام نہیں کرتا بلکہ شرم اور استغنا اور غرور اس کو رونمائی تک میں مانع آتے ہیں اور وہ اپنے چہرۂ نازنین سے نقاب نہیں اٹھاتا۔

شرم اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی
ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں

جب وہ جمال دل فروز صورت مہر نیمروز
آپ ہی ہو نظارہ سوز پردہ میں منھ چھپائے کیوں

......وہ اپنی آپ مثال ہے کوئی اس کی مثال نہیں۔

سب کو مقبول ہے دعویٰ تری یکتائی کا
روبرو کوئی بت آئینہ سیما نہ ہوا

ہوئے اس مہروش کے جلوۂ تمثال کے آگے
پر افشاں جوہر آئینہ مثل ذرہ روزن میں

جس آئینہ جہاں نما میں وہ پرتو افگن ہوجاتا ہے۔طوطئ جوہر کی حالت مرغ قبلہ نما کی سی ہوجاتی ہے:

اہل بینش نے بہ حیرت کدۂ شوخی ناز
جوہر آئینہ کو طوطی بسمل باندھا

جو مجذوب عشق دے کراس کو لے چلتے ہیں وہ بھی اس کا روئے انور سراپا نگہ ہو کر بھی نہیں دیکھ سکتے۔ جب کوئی اور مانع نہیں رہتا۔ تو نگہ خود مانع آتی ہے اور پردہ بن کر حائل ہوجاتی ہے:

ہنوز محرئ حسن کو ترستا ہوں
کرے ہے ہر بن مو کام چشم بینا کا

وا کر دیے ہیں شوق نے بند نقاب حسن
غیر از نگاہ کوئی بھی حائل نہیں رہا

اس یوسف کے حسن میں ایک عالم زن عزیز کی مثال دیوانہ ہے لیکن اس کا صد چاک پیرہن اس کی پارسائی کے منہ پر مہر ہے:

نہ ہو جس تماشا دوست رسوا بے وفائی کا
بہ مہر صد نظر ثابت ہے دعویٰ پارسائی کا

مرزا غالب ان شعراء میں سے ہیں جو حسن کو نیرنگ قدرت یا کیف مینا یا سرود و بربط میں تلاش نہیں کرتے بلکہ عورت کے سینے میں ڈھونڈتے ہیں۔

مرزا غالب کی معشوقہ مریم ہیں جو خیال غیر سے پاک اور جنس مقابل سے بالا ہے بلکہ زلیخا ہے۔ وہ خود یوسف نہیں بلکہ سری کرشن ہیں۔ ان کے معشوق کی تصویر رافائل (Raphael) نہیں کھینچ سکتا یہ روبنس (Rubens) کا کام ہے:

مانگے ہے پھر کسی کو لب بام پر ہوس
سرمہ سے تیز دشنۂ مژگاں کیے ہوئے
اک نو بہار ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغ مے سے گلستاں کیے ہوئے
چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو
زلف سیاہ رُخ پہ پریشاں کیے ہوئے

ان کا معشوق تمام عشوہ گری کے انداز اور ناز سے واقف ہے۔

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا
لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب کا
پرسش طرز دلبری کیجئے کیا کہ بن کہے
اس کے ہر اک اشارہ سے نکلے ہے یہ ادا کہ یوں
سادگی و پرکاری بے خودی و ہشیاری
حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

اس کا حسن انتہائے جمال ہے ورنہ مرزا جیسے بلند نگاہ میں سما بھی نہ سکتا۔ یہ وہ حسن ہے جو نہ صرف مرعوب بلکہ مغلوب کر لیتا ہے۔

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قد یار کا عالم
میں معتقد فتنۂ محشر نہ ہوا تھا

سطوت سے تیرے جلوۂ حسن غرور کی
خوں ہے مری نگاہ میں رنگ ادائے گل

یہاں تک کہ اگر وہ خود اپنے حسن کو چشمۂ آئینہ میں دیکھ لے تو یونانی نوجوان نرگس کی طرح تاب نہ لا سکے۔

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے
صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

عشق کیا ہے؟ آرزوئے وصل جو دو پریشاں خاک کے ذروں اور دو پریشاں دلوں میں یکساں موجود ہے۔ کن اسباب سے پیدا ہوتی ہے۔ مادے کی کشش اور دل کی کشش دونوں ایک ہیں کشش کا تقاضا ہے کہ ایک دوسرے کو کشش کرنے والے اجسام جوں جوں قریب ہوتے ہیں کشش میں افزادنی ہوتی ہے۔ یہی محبت کی کشش کا حال ہے عشق میں کہیں ایک جانب فاتحانہ غلبہ ہے اور دوسری جانب مفتوحانہ تسلیم کہیں دونوں سمت جوش جذبات اور آرزوئے قریب کہیں ایک طرف جو یائی دوسری طرف گریز پایا جاتا ہے لیکن یہ کشش قلبی کب اور کہاں اور کیوں پیدا ہوتی ہے اس کا نشان پانا مشکل ہے۔

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

فلسفی ذہنی اور دماغی نقطۂ نظر سے عشق کو مرض قرار دیتے ہیں:

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل
کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

لیکن دل سے دماغ مجبور ہے:

میں اور اک آفت کا ٹکڑا وہ دل وحشی کہ ہے
عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا

یہ وحشت طبیعت میں ازل سے راسخ ہےاور یہ سکون اور راحت کے مانع آتی ہے:

دل لگی کی آرزو بے چین رکھتی ہے ہمیں
ورنہ یاں بے رونقی سود چراغ کشتہ ہے

یہ وہ مرض ہے طبیعت جس کے علاج سے منحرف رہتی ہے اور ہمیشہ یہی چاہتی ہے کہ کبھی صحت نہ ہو۔ فیضی کا شعر ہے۔

توشدا روئے محبت رامپرس اجزا کہ چوسع
سودۂ الماس در زہر ہلاہل می کنند

مرزا غالب اسی شعر کو جلا دے کر فرماتے ہیں۔

نہ پوچھ نسخۂ مرہم جراحتِ دل کا
کہ اس میں ریزہ الماس جزو اعظم ہے

اس عشق جوئی کا سبب یہ ہے کہ اس ہنگامہ ہائے ہو سے عالم میں رونق اور جان ہے۔

رونق ہستی ہے عشق خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

جہاں درد موجود ہو عشق ضرور ثمر لاتا ہے۔

عشق تاثیر سے نومید نہیں
جاں سپاری شجر بید نہیں

مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے آگے
تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے

اور عشق کا ثمر خانہ ویرانہ، بربادی، تباہی، پشیمانی، بے اعتباری، عریانی اور صحرانوردی ہے۔

شوق ہر رنگ رقیب سروساماں نکلا
قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا
بوئے گل نالۂ دل، دودِ چراغ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا
حاصل الفت نہ دیکھا جز شکست آرزو
دل بدل پیوستہ گویا اک کفِ افسوس تھا
کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں
شب ہائے ہجر کو بھی رکھو گر حساب میں
گوش مہجور پیام و چشم محروم وصال
ایک دل تس پر یہ ناامیدواری

لیکن کو مرزا غالب کی معشوقہ ایک ارضی عورت ہے ان کا عشق ہوس سفلیہ اور لذات حرصیہ سے پاک ہے۔ ان کو اس کے حسن بے پایاں کے دیکھنے سے ایک ارتعاش روحانی، ایک وجدالہی پیدا ہوتا ہے۔ جس میں جذبات کامرانی اور خواہشات کام جوئی کا کوئی عنصر نہیں اس کا جلوہ رخ ایک کیفیت وجدانہ پیدا کر دیتا ہے اور جسم کے تار تار میں ایک رقص عشقیہ پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ حاجت آرزوئے بشریہ سے لاتعلق ہوتی ہے۔ خلوت سفلیہ کیا ہے جب روح گیرائی اور قبضہ کی جانب مائل ہوتی ہے تو یہ ہوس پیدا ہوتی ہے ہوس مطلوب کو اپنے پرشہوت ہاتھوں سے ملوث کرنا چاہتی ہے۔ عشق کیا ہے؟ عشق میں ادب اور شرم شامل ہیں۔ عشق دور سے پرستش اور پرستاری کرتا ہے جہاں اضطراب آتش زیر پائے خوف ہے وہاں عشق نہیں۔ عشق نور ہے اور جلوت اور خلوت دونوں کو اپنی ضیا سے روشن کرتا ہے۔

میرے ہونے میں کیا ہے رسوائی
اے وہ جلوت نہیں خلوت ہی سہی

میدان عشق میں جہاں جانا بازیٔ طفلاں نہیں ہے۔ ہزاروں میں سے ایک عزت سلامت لاتا ہے۔ اسی عشق کا درجہ ہے کہ:

چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پیراہن
ہماری جیب کو اب حاجت رفو کیا ہے
جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہو گا
کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے
رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

جو اہل ہوا و ہوس اس کوچۂ عشاق میں قدم رکھتے ہیں وہ اہلِ دل کو بدنام کرتے ہیں۔

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی

اس عشق حقیقی میں ایک کیف دائمی، ایک خمار ابدی ہے۔ ہمیشہ آرزوئے وصل رہتی ہے کبھی پوری نہیں ہوتی۔ اس کا لطف وجاں کنی سے زیادہ لطف بخش ہے کبھی کم نہیں ہوتا "وصال یار" وہیں ہے جہاں عشق آرزوئے خام ہے اور اسیر آرزو ہے۔

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

یہاں تک کہ عاشق سراپا ایک "شعلہ مضطر" بن جاتا ہے۔

گر نگاہِ گرم فرماتی رہی تعلیم ضبط
شعلہ خس میں جیسے خوں رگ میں نہاں ہو جائے گا

جہاں اس کا حسن حقیقی بے پایاں ہے وہیں مرزا کی تاب عاشقی بے نہایت ہے۔

کیوں جل گیا نہ تاب رخ یار دیکھ کر
جلتا ہوں اپنی طاقت دیدار دیکھ کر
گرنی تھی ہم پہ برق تجلی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر

یہ انتظار غیب اور حضر دونوں میں یکساں رہتا ہے۔ خود نظارۂ رخ یار کا پردہ بن جاتا ہے۔

میں نامراد دل کی تسلی کو کیا کروں
مانا کہ تیرے رخ سے نگہ کامیاب ہے
دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے
نظارہ نے بھی کام کیا واں نقاب کا
مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی

یہاں تک کہ اگر وہ معشوق صہبائے محبت میں مدہوش قبائے حریر کے بند خود کھول دیتا ہے تو بھی:

زشادی دست نہ پاگم می شود خود رانمی یابم
مے نے کیا ہے حسن خود آرا کو بے حجاب
اے شوق یاں اجازت تسلیم ہوش ہے

اس مدام لب دریا تشنہ لبی کا باعث صرف یہ ہے کہ علوی محبت کبھی جسمانی قرب سے خود کو سیراب نہیں کرتی۔ اگر معشوق کے دست نازنین کو مکرر بوسہ دیا جائے تو دوسرے بوسہ میں یا تو پہلے کے مساوی لذت ہوگی یا اس وجہ سے کہ پہلا بوسہ لینے سے معشوق کی نارسائی کی شان جاتی رہی ہے اور اگر مساوی ہے تو بھی چوں کہ پہلے بوسے کی کیفیت کی

لاعلمی جاتی رہی ہے، ضرور کم ہوگی۔ فارسی قصہ نگار نے "اگر وگل" کی داستان میں اور فرانسیسی داستان گو نے (Mademoisellede Maupinc) میں اسی امر کو بیان کیا ہے۔

گر ترے جی میں ہو خیال وصل میں شوق کا زوال
موج محیط آب میں مارے ہے دست و پا کہ یوں

اس عشق کے اہل اہل ولا کی طرح ہر زمانے میں شاذ ہی ہوتے ہیں چنانچہ کہتے ہیں:

کون ہوتا ہے حریفِ مے مرد افگن عشق
ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد
غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی
کہ کرے تعزیت مہر ووفا میرے بعد
آئے ہے بے کسیٔ عشق پہ رونا غالب
کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد

کیا شاعری مصوری ہے؟ اس میں شک نہیں کہ فن مصوری اور فن شاعری ایک دوسرے سے قریب ہیں۔ دونوں کا کام غیر موجود اشیا کو حاضر اور واقع دکھلاتا ہے دونوں کی بنا ایک خوش انداز فریب پر قائم ہے۔ مصوری سرمہ آواز شاعری ہے۔ اور شاعری شیریں زبان مصور ہے۔ جہاں مصور کا موقلم رنگ اور خطوط سے مختلف حقیقی یا مجازی مضامین کو صورت دیتا ہے وہیں شاعر کا قلم الفاظ اور انداز بیان سے وہی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ الفاظ شاعر کے رنگ ہیں اور الوان مصور کے الفاظ ہیں۔

ارسطو کا بیان ہے کہ شاعری کا مقصد قدرتی اشیا کی نقل ہے۔ لیکن اس کا منشا یہ نہیں کہ شاعر کا کام واقعات کو ان کی من وعن بے رنگ کیفیت میں نقل کرنا ہے بلکہ یہ ہے کہ شاعر کو محاکات اس حالت میں دکھلانا چاہیے جس میں چشم تخیل ان کو دیکھتی ہے۔ یورپ کے بہت سے موجودہ شعراء واقعات زندگی کی ہو بہو تصویریں اتارتے ہیں لیکن یہ عکاسی ہے

مصوری نہیں اور کم رتبہ کام ہے۔

شیکسپیئر کے کلیات میں جو جذبات انسانی کے مرقعات ہیں وہ گویا بالکل زندگی سے مماثل معلوم ہوتے ہیں لیکن حقیقت میں تخیل سے رنگین ہیں اور یہی رنگ ہے جو شیکسپیئر کے کلام کو لاثانی بناتا ہے۔ مرزا کی مصوری شیکسپیئر کی مصوری ہے۔

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے
بندگی میں بھی وہ آزدہ و خود بیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا
گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں
جاں دادۂ ہوائے سر رہ گزار تھا

ہوریس کی رائے میں تصویر میں خواہ وہ مصور کی بنائی ہوئی ہو یا شاعر کی کوئی بات موزونیت کے خلاف نہ ہونی چاہیے (۱۱۔۱۳) حسن موزوں ہونا چاہیے (۱۴۔۲۳) خمیدہ ناک، آنکھوں اور بالوں کی خوبصورتی کو بھی ضائع کر دیتی ہے۔ (۳۵۔۳۷) مرزا کی محاکات میں یہ خوبی غایت قطعی ہے۔

شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا
تماشائے بیک کف بردن صد دل پسند آیا
سب رقیبوں سے ہوں ناخوش پر زنان مصر سے
ہیں زلیخا خوش کہ محو ماہ کنعاں ہو گئیں
رات کے وقت مے پیے ساتھ رقیب کو لیے
آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ خدا کرے کہ یوں

یہ مرزا ہی کی قدرت بیان، سرعت انتقال اور شدت ذکا کا کمال ہے کہ ان تصاویر کو

ایسے تناسب اور متوازن الفاظ میں کھینچا ہے ان اشعار کے الفاظ کی لطافت اور اثرات ہلکے سے ہلکے رنگوں کی سیالیت کو مات کرتی ہے۔ لینگ نے ایک عالمانہ بحث میں بیان کیا ہے کہ:

"اصنام اور اشعار میں مابہ الامتیاز یہ ہے کہ بت سکون اور اشعار جنبش کا اظہار کرتے ہیں۔ جب حسن سمٹ کر چپ چاپ کھڑا ہو جاتا ہے تو مجسمہ کہلاتا ہے اور جب حرکت اور رقص کرنے لگتا ہے تو شعر نام پاتا ہے۔ اجسام صنم سازی کا اور افعال شاعری کا موضوع ہیں شاعری میں تصویر سینما موٹوغراف کی طرح رواں حالت میں ہوتی ہے او رمسلسل کیفیت دکھلاتی ہے۔"

قاآنی موسم بہار کی تصویر یوں کھینچتا ہے۔

نرمک نرمک نسیم زیر نگاہ
غب غب ایں می کمد الرض آں می گزد
گہ بگلشن می چمد گہ بچمن می وزد
گاہ بشاخ درخت گہ بہ لب جوئبار

ہوا کی یہ رفتار شاعر قرطاس پر قلم ہی سے دکھلا سکتا ہے۔ مصور پردے پر موقلم سے نہیں دکھلا سکتا۔ مرزا کے قلم کی یہ تصویر ملاحظہ ہو:

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے
کرتا ہوں جمع پھر جگر لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے دعوت مژگاں کیے ہوئے
پھر وضع احتیاط سے رکنے لگا ہے دم
برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کیے ہوئے

پھر گرم نالہ ہائے شرر بار ہے نفس
مدت ہوئی ہے سیر چراغاں کیے ہوئے
پھر پرسش جراحت دل کو چلا ہے عشق
سامان صد ہزار نمکداں کیے ہوئے
پھر بھر رہا ہوں خامۂ مژگاں بخون دل
ساز چمن طرازئ داماں کیے ہوئے
باہم دگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب
نظارہ و خیال کا ساماں کیے ہوئے
دل پھر طواف کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کیے ہوئے
پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب
عرض متاع عقل و دل و جاں کیے ہوئے
دوڑے ہے پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال
صد گلستاں نگاہ کا ساماں کیے ہوئے
پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا
جاں نذر دل فریبی عنواں کیے ہوئے
مانگے ہے پھر کسی کو لب بام پر ہوس
زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کیے ہوئے
چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو
سرمہ سے تیز دشنہ مژگاں کیے ہوئے
اک نو بہار ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغ مے سے گلستاں کیے ہوئے

پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
سر زیرِ بار منت درباں کیے ہوئے
جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصور جاناں کیے ہوئے
غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوش اشک سے
بیٹھے ہیں ہم تہیہ طوفاں کیے ہوئے

ہجر میں ارمان وصل کا مرقع اس سے بہتر کیا ہو سکتا ہے۔ عاشق کی تمام زندگی ان اشعار میں موجود ہے۔ اول اس زمانے کو بیان کرتا ہے جب محفل وصل شراب سے لبریز، آبگینوں سے روشن رہتی تھی۔ پھر کہتا ہے کہ تقاضائے احتیاط جو کچھ بھی ہو فراق یار میں تسکین ناممکن ہے۔ اس کے بعد دل کے نہ ماننے اور طواف کوئے ملامت کو جانے کی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے۔ نامہ دلدار کے تصور سے ہاتھوں کا کانپنا کہ خوشی سے اس کو کھول بھی نہیں سکتے۔ اور پھر کسی کے در پر پڑے رہنے کا قصد مصمم کرنا عشقیہ جذبات کا ایک مرقع ہے۔ ہر شعر ان میں سے ایک مکمل تصویر ہے اور ہر تصویر اپنے سے مابعد تصویر سے متعلق ہے۔ کوئی مصور رنگ سے وہ اثر پیدا نہیں کر سکتا جو شاعر نے بیان کیا ہے۔

بوعلی سینا نے شفا میں محاکات سے لذت پانے کی دلیل یہ لکھی کہ ہر شے کی تصویر خود لطف انگیز ہے خواہ وہ شے فی نفسہ بری ہو یا بھلی۔ چنانچہ بعض حیوانات نامقبول صورت ہیں ان کی تصویریں دیکھ کر بھی لوگ خوش ہوتے ہیں۔ لیکن باوجود اس امر کے بلند پایہ مصور بدصورت اشیاء کی تصویر اتارنے سے کنارہ کرتے ہیں۔ حسن سیرت کو حسن صورت سے جو تعلق ہے اس کا تقاضا ہے کہ باطنی خیالات اور تصورات کا اثر چہرے اور بشرے سے ظاہر ہوتا ہے۔ ظلم یا غصے کی حالت میں دلفریب سے دلفریب صورت کے خدوخال نامقبول ہو جاتے ہیں اور جذبے کی شدت حسن کو باطل کر دیتی ہے۔ اس لیے ایسی حالت کی تصویر کھینچنے

سے ابا کرتے ہیں۔

یونان کے مشہور قدیم مصور سے جب رحم میڈیا کی تصویر کھینچنے کے لیے کہا گیا تو اس نے اس کی تصویر اس وقت کی حالت میں کھینچی جب کہ وہ تذبذب کی حالت میں تھی اور ہنوز قتل پر آمادہ نہیں ہوئی تھی۔ غالب نے معشوق کے رقیب کی آغوش میں ناز کرنے کی کیفیت کو حوالہ تصویر نہیں کیا کہ جو نا شیزگی اس انداز میں پائی جاتی ہے وہ کسی مرقع میں ادا کیے جانے کے قابل نہیں۔ یہ ایک ایسا نظارہ ہے جس کو کوئی آنکھ دیکھنا پسند نہیں کرتی اس لیے اس جان آزار منظر کی کیفیت کو یوں دکھایا ہے۔

نقش ناز بت طناز بہ آغوش رقیب
پائے طاؤس پے خامۂ مانی مانگے

گویا فلپس شاعر کا قول میڈیا اور شاعر کی بے وفا معشوقہ کے بارے میں یکساں درست ہے۔

''اے ظالمہ تو اسی قابل ہے کہ پردۂ تصویر پر بھی تیری صورت نہ دکھائی جائے۔''

شعر کا تعلق وقت سے اور تصویر کا تعلق فضا سے ہے۔ تصویر ایک ایک نگاہ میں اپنے مضمون کو ظاہر کر دیتی ہے۔ شعر وقت کا طالب ہوتا ہے اور کلی کی طرح رفتہ رفتہ اپنے معنی کو بیان کرتا ہے۔ تصویر ایک ثانیہ کی یادگار ہے۔ شعر ایک تتلی ہے جس کے پیچھے خیال بچے کی طرح کہیں سے کہیں نکل جاتا ہے۔ مثلاً جب یہ شعر پڑھا جاتا ہے:

غنچہ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں
بوسے کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں

تو تصور گوش آشنا ہوتے ہی اول دردنداں اور لب مرجاں کا نقشہ کھینچتا ہے۔ پھر مسی کی اداہٹ اور پان کی سرخی کے ساتھ ان میں تبسم کا رنگ بھرتا ہے۔ پھر رونگاری میں

مشغول ہوتا ہے۔اور سرمہ کی تحریر اور قشقہ کی لکیر تک بھی نہیں بھولتا اور پھر گردن کے اتار اور سینے کے ابھار کے خطوط کی کشش سے پیکر تیار کرتا ہے اور اسی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ دست حنائی میں جو پردہ ہے وہ بھی اور جس غرفہ میں وہ پردہ آویزاں ہے اس کو بھی دکھاتا ہے۔

شبلی کا بیان ہے کہ ایک بڑا فرق عام مصوری اور شاعرانہ مصوری میں یہ ہے کہ تصویر کی اصلی خوبی یہ ہے کہ جس چیز کی تصویر کھینچی جائے اس کا ایک ایک خط وخال دکھایا جائے لیکن شاعر اکثر محض ان چیزوں کو لیتا ہے اور ان کو نمایاں کرتا ہے جن سے صرف ہمارے جذبات پر اثر پڑتا ہے۔باقی چیزوں کو وہ نظر انداز کرتا ہے یا اس کو دھندلا رکھتا ہے کہ اثر اندازی میں ان سے خلل نہ آئے۔

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قد یار کا عالم
میں معتقد فتنۂ محشر نہ ہوا تھا
پرسش طرز دلبری کیجئے کیا کہ بن کہے
اس کے ہر اک اشارہ سے نکلے ہے یہ ادا کہ یوں
سادگی و پرکاری ، بیخودی ہو ہشیاری
حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا
سطور سے تیرے جلوۂ حسن غیور کی
خوں ہے مری نگاہ میں رنگ ادائے گل

ہومر جب بھی معشوق کی شاعرانہ تصویر کھینچتا ہے تو چونکہ وہ استادوں کا استاد ہے کبھی اس سے زیادہ نہیں کہتا کہ ہیلن میں دیویوں کا سا حسن تھا۔حالانکہ تمام رزم نامہ الیڈ کی بنیاد ہیلن کے حسن پر قائم ہے۔ارسطو جو استادوں کے درجے کو نہیں پاتا جب اپنی کتاب آرلینڈ فروزیو میں الکینا کی شاعرانہ تصویر کھینچتا ہے تو اس کا پورا سراپا لکھ جاتا ہے۔ہومر نے صرف دو جگہ اتنا لکھا کہ ہیلن کی باہیں گوری تھیں اور اس کے بال خوشنما تھے۔غالب نے بھی

کل دیوان میں زلف سیاہ یا چشم سیاہ سے زیادہ اپنے معشوق کا پتا نہ بتایا جس طرح بعض اوقات مجسمہ ساز بت میں باوجود جسم جامد کے حرکت کا دھوکا پیدا کر دیتا ہے۔ اسی طرح بعض اشعار میں محاکات بھی سو قلم کی رنگین تصویر کی خاموش ہوتی ہے، کانت دو کلیس کی رائے ہے کہ بہترین شعر وہ ہے جس کے مضمون کو مصور بلا وقت صفحہ قرطاس سے جامہ تصویر پر منتقل کر سکے اور جو حالت خواب تصویر میں قائم ہو وہ بیداری سے مبدل نہ ہو اگر اس خیال سے اتفاق نہ کیا جائے تو ان اشعار سے بہتر مثال ممکن ہیں۔

پھر اس انداز سے بہار آئی
کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی
دیکھو اے ساکنانِ خطۂ خاک
اس کو کہتے ہیں عالم آرائی
کہ زمیں ہو گئی ہے سر تا سر
روکش سطح چرخ مینائی
سبزہ کو جب کہیں جگہ نہ ملی
بن گیا روئے آب پر کائی

یہ کل اشعار ایک نظارہ قدرت پیش کرتے ہیں جس میں متصل اور مسلسل واقعات نہیں بلکہ صرف ایک دلفریب خاموش منظر ہے۔ عقب میں نیلگوں افق ہے۔ آفتاب چمک رہا ہے اور قرص ماہتاب بھی بیتاب اور ماندہ موجود ہے۔ بارش نے زمین کو آئینہ یاب بنا دیا ہے۔ سامنے ایک تالاب ہے۔ سبزہ کی یہ زیادتی ہے کہ سطح آب تک دست دراز ہے۔ اشجار گل پوش اور گل بار ہیں۔ سب سے آگے شاخ نرگس گویا چشم نرگس مشغول تماشا ہے۔ ایک چڑیا یا تتلی تک بھی تو نہیں جو اس خاموشی میں شور یا حرکت پیدا کرے۔ غالب نے حقیقت میں درجل کو بھی جس کی نظم کنار دریا کے متعلق ہے مات کر دیا ہے۔

ضمیمہ۔ د

احوالِ غالب

۱۷۵۲ء میرزا قوقان بیگ خاں۔ غالبؔ کے دادا کی سمرقند سے ہندوستان میں آمد۔ (چندے لاہور میں رہے، محمد شاہ (شاہ عالم کی شہزادگی) کے عہد میں دلی پہنچے۔ شاہی ملازم، پھر مستعفی ہو کر مہاراجا جے پور کے ہاں نوکری۔ آگرے میں قیام)

۵۹-۱۷۵۸ء قتیل کی ولادت شاہ جہاں آباد میں۔

۱۷۹۷ء (۲۷ دسمبر) (محمد) اسد اللہ (بیگ) خاں (غالبؔ) کی آگرے میں ولادت۔ (قوقان بیگ خاں کے بڑے بیٹے عبداللہ بیگ خاں کا نکاح آگرے کے ایک امیر فوجی افسر خواجہ غلام حسین خاں کی بیٹی عزت النساء بیگم سے ہوا۔ یہ اسد اللہ بیگ خاں (غالب) کے والدین تھے۔)

۱۷۹۹ء (۴ مئی) ٹیپو سلطان کی شہادت۔

۱۸۰۰-۱۷۹۹ء یوسف علی بیگ خاں (غالبؔ کے چھوٹے بھائی) کی ولادت

۱۸۰۲ء سالِ ولادت لاڈو بیگم زوجہ مرزا یوسف (برادر غالبؔ)

۱۸۰۲ء میرزا عبداللہ بیگ خاں (غالبؔ کے والد) کا ریاست الور کی ملازمت میں انتقال۔

کافی بود و مشاہدہ، شاہد ضرور نیست
در خاک راج گڑھ پدرم، رابود مرزا (غالبؔ)

اسد اللہ خاں بیگ خاں اور ان کے خاندان کا نصر اللہ بیگ خاں (عبداللہ بیگ خاں کے برادر خرد) کی سر پرستی میں آنا (نصر اللہ بیگ خاں مرہٹوں کی طرف سے آگرے کے قلعدار تھے۔۱۸۰۳ء میں انہوں نے قلعہ لارڈ لیک کے حوالے کر دیا۔اس پر وہ انگریزی فوج میں سترہ سو مشاہرے پر ۴۰۰ سواروں کے رسالدار مقرر ہو گئے)

۱۸۰۳ء (۱۸ اکتوبر) آگرے پر انگریزوں کا قبضہ

۱۸۰۶ء (اپریل) نصر اللہ بیگ خاں کا ہاتھی سے گر جانے سے زخمی ہونا اور انتقال۔ (نواب احمد بخش خاں، والی فیروز پور جھرکا، لوہارو، کی ہمشیرہ نصر اللہ بیگ خاں کے عقد نکاح میں تھی۔)

۱۸۰۶ء (۴ مئی) احمد بخش خاں کی سفارش پر انگریزوں کی طرف سے نصر اللہ بیگ خاں کے پس ماندگان کا وظیفہ دس ہزار روپیہ (پہلا اقتہ) (اس وظیفے میں نصر اللہ بیگ خاں کی والدہ، تین بہنیں، اسد اللہ بیگ خاں اور ان کے چھوٹے بھائی یوسف علی بیگ خاں حصے دار تھے۔)

۱۸۰۶ء (۷ جون) وظیفے کی رقم دس ہزار سے پانچ ہزار سالانہ کر دی گئی (دوسرا اقتہ)۔ غالب کا حصہ ساڑھے سات سو روپے سالانہ (اس حصے کی رو سے ایک شخص خواجہ حاجی بھی اس وظیفے میں دو ہزار سالانہ کا حصے دار قرار دیا گیا تھا۔)

۱۸۰۶ء (۲۸ نومبر) جلال الدین شاہ عالم ثانی کا انتقال۔ معین الدین اکبر شاہ ثانی کی تخت نشینی۔

۱۸۰۷ء ـ ۸ شعر گوئی کا آغاز۔ اسد تخلص

تقریباً	ایک اور شاعر میر امانی اسدؔ تھا۔ چوں کہ لوگ اس کا کلام ان سے منسوب کرنے لگے تھے انہوں نے اس تخلص کو ترک کر کے (تقریباً ۱۸۱۶ء) اس کی جگہ غالب کر دیا۔ تاہم کبھی کبھی اسدؔ تخلص بھی روا رکھا۔
۱۸۰۹۔۱۰ء	قلندر بخش جرأت کی لکھنؤ میں وفات۔ اسد اللہ خاں بیگ کی مولوی محمد معظم کے مکتب (آگرہ) میں تعلیم۔ (بحوالہ عیار الشعراء از خوب چند ذکاء، گلستان بے خزاں، از قطب الدین باطن، بعد میں حالی وغیرہ)
۱۸۱۰ء (۱۹ر اگست)	الٰہی بخش خاں معروف کی چھوٹی بیٹی امراؤ سے دلی میں نکاح۔ (الٰہی بخش خاں نواب احمد بخش خاں کے چھوٹے بھائی تھے۔ نکاح کے وقت غالب کی عمر تیرہ سال کی تھی اور امراؤ بیگم کی گیارہ سال کی۔ معروف کا نامکمل دیوان چھپ چکا ہے مکمل مخطوطہ میرے کتب خانے میں موجود ہے)
۱۸۱۰ء (۲۰ ستمبر)	میر تقی میر کی لکھنؤ میں وفات۔
۱۸۱۲۔۱۳ء	غالب کی دلی میں آمد اور مستقل سکونت۔
۱۸۱۴ء۔ ۱۱۹ اگست تا ۸	کسی بھی سال میں مرزا یوسف کی شادی (یقینی دن، تاریخ، اور مہینا۔ دو
جولائی ۱۸۱۷ء	شنبہ (سہ شنبہ؟) ۲۲ شعبان۔
۱۸۱۵۔۱۶ء	'اسد اللہ عرف مرزا نوشہ ۱۲۳۱ھ' غالبؔ کی پہلی مہر (۱۲۳۱ھ) غالبؔ کی عمر ۱۹۔۲۰ برس کی تھی، یعنی ان کے عیش و نشاط کا زمانہ تھا۔ غالب کی دوسری مہر (یہ دونوں مہریں ایک ہی سال میں بنوائی گئیں)

'اسد اللہ الغالب ۱۲۳۱ھ'

اس مہر کی بنا حضرت علی کا لقب ہے اور یہ بطور سجع ہے۔ بعد میں تبدیل تخلص کے وقت یہی سجع کام آیا اور اسد کی جگہ غالب تخلص قرار دیا۔

۱۸۱۶ء غالب تخلص کا باقاعدہ استعمال

۱۸۱۷ء (۱۹ مئی) انشاء کی لکھنؤ میں وفات۔

۱۸۲۲-۲۳ء غالب کی تیسری مہر۔ محمد اسد اللہ خاں ۱۲۳۸ھ

یہ مہر انیسویں صدی کے ربع اول میں دلی کے علماء میں ایک بہت بڑے مذہبی مباحثے سے پیدا شدہ رجحان کی دین ہے۔ جس میں فضل حق خیر آبادی کے اصرار پر غالب کو بھی ایک مثنوی کہنی پڑی تھی۔

۱۸۲۴-۲۵ء مصحفی کی لکھنؤ میں وفات۔

۱۸۲۵ء خواجہ حاجی کا انتقال (انتقال شاید ۱۸۲۵ء کے شروع میں ہوا ہو گا۔ ۲۸ اپریل ۱۹۲۸ء کی پنشن کی درخواست میں غالب نے لکھا ہے کہ خواجہ حاجی کا انتقال، تین برس ہوئے، جذام کے مرض سے ہوا)

۱۸۲۵ء فیروز پور جھرکا کا سفر۔ نواب احمد بخش کی خدمت میں بسلسلۂ حق پنشن۔ یہ بات جنرل اختر لونی کے انتقال (۱۵ جولائی ۱۸۲۵ء سے کچھ پہلے کی ہے۔

۱۸۲۵ء (نومبر، دسمبر) میرزا یوسف علی (بیگ) خاں کی شدید بیماری، دیوانگی کا آغاز۔

۱۸۲۵-۲۶ء قرض خواہوں کے تقاضوں نے ناک میں دم کر رکھا تھا۔

ایضاً نواب احمد بخش خاں کے ساتھ بھرت پور کا سفر۔ مقصد سر چارلس

مٹکاف سے ملنا تھا۔

ایضاً — واپسی پر ایک لمبے عرصے تک فیروز پور جھرکا میں نواب احمد بخش خاں کے ساتھ قیام۔

۱۸۲۶ء — الٰہی بخش خاں معروف (غالب کے خسر) کا انتقال۔

۱۸۲۶ء (۱۱۳ اکتوبر) — نواب احمد بخش خاں کی فیروز پور جھرکا اور لوہارو کی حکومت سے دست برداری (نواب شمس الدین احمد خاں والی ریاست)

۱۸۲۶ء (دسمبر) — (الف) سفر کلکتہ۔ کا آغاز۔ قرض خواہوں کے ڈر سے دلی نہ گئے اس لیے فیروز پور جھرکا ہی سے سفر کلکتہ شروع ہو گیا۔

(ب) چوں کہ نواب احمد بخش خاں نے غالب کو سر چارلس مٹکاف سے نہ ملایا، اس لیے غالبؔ مایوس ہو گئے۔ پھر گورنر جنرل کے ورود (کانپور وغیرہ) کی خبر پھیلی۔ غالبؔ نے سوچا کہ کان پور چلا جائے۔ وہاں سر چارلس مٹکاف بھی ضرور جائیں گے۔ اس لیے واپسی پر ان کی معیت میں ان سے مل لوں گا۔ چنانچہ اس ارادے سے فرخ آباد اور کان پور کی طرف روانہ ہوئے، مگر کان پور میں سخت بیمار ہو گئے اور وہیں سے خاطر خواہ علاج نہ ہونے پر پالکی میں لکھنو چلے آئے اور وہاں پانچ مہینے سے اوپر رہے۔ لکھنو کی آب و ہوا راس نہ آئی۔ یہاں سے باندہ گئے اور لگ بھگ چھ مہینے نواب باندہ کے مکان میں رہے اور شفا پائی۔

(ج) باندہ سے خشکی کے راستے گھوڑے کی سواری سے کلکتے کا سفر جاری۔ دو تین ملازم ساتھ تھے۔

۱۸۲۷ء (اکتوبر) — نواب احمد بخش خاں کا انتقال۔ غالب کو یہ خبر سفر کلکتہ کے دوران میں

مرشد آباد میں ملی۔

۲۸۔۱۸۲۷ء۔ فارسی میں شعر گوئی کا باقاعدہ آغاز اس سے پہلے کا سرمایۂ فارسی شعر ناقابل اعتنا اور مقدار میں بہت کم ہے۔ 'گل رعنا' میں شامل فارسی انتخاب اس پر شاہد ہے کہ ۱۸۲۸ء (۱۲۴۴ھ) تک ان کے پاس ۲۷ غزلوں سے زیادہ فارسی کلام نہ تھا، اور وہ بھی اس کلکتہ کے دوران کہا گیا تھا۔ غالبؔ کے قدیم ترین خطی نسخے میں بھی اردو کا تو مکمل مردف دیوان ہے۔ مگر فارسی کی صرف ۱۳ رباعیاں ہیں۔

۱۸۲۸ء (۲۱ فروری) کلکتے میں ورود۔ اسی روز شملہ بازار (متصل چیت بازار) میں گردتالاب کے نزدیک مرزا علی سوداگر کی حویلی میں رہنے کو مکان مل گیا۔

۱۸۲۸ء (۲۸ اپریل) پنشن کے مقدمے کا آغاز۔

(سرکاری درباروں میں کرسی نشینی کا آغاز۔ 'گل رعنا' کی ترتیب وتدوین۔ یہ اردو اور فارسی کا انتخاب انھوں نے اپنے کلکتے کے ایک دوست مولوی سراج الدین احمد کی فرمائش پر کیا تھا۔)

۱۸۲۸ء (۲۸ اپریل) پنشن کی درخواست میں مذکور ہے کہ "میرا نام اسداللہ خاں ہے۔"

(اس کے سامنے وہ خط بنام تفتہ بھی دیکھیے جس میں غالبؔ نے لکھا ہے کہ وہ اب "محمد" کا لفظ مبارک اپنے نام کے ساتھ اس لیے نہیں لگاتے کہ لوگوں نے لکھنا ترک کر دیا تھا، لہٰذا انہوں نے بھی موقوف کیا۔)

ایضاً غالب نے درخوات میں لکھا کہ آج ان پر بیس ہزار روپیہ قرض ہے۔

۱۸۲۹ء (۲۹ نومبر) کوئی تین برس کی غیر حاضری کے بعد دلی واپس۔ سفر کلکتہ ختم۔

۱۸۳۰ء راجا رام موہن رائے کا سفر انگلستان۔

۱۸۳۰ء (۱۶ اگست) نظیر اکبر آبادی کی وفات۔

۱۸۳۱ء (۲۷ جنوری) مقدمہ پنشن خارج۔

(اس کے بعد وہ اپیل کرتے رہے، جس کا سلسلہ ۱۸۴۴ء تک رہا لیکن یہ ابتدائی فیصلہ قائم رہا)

۱۸۳۳ء (۱۶ اپریل) دیوان متداول (اردو) کی تاریخ ترتیب۔

۱۸۳۴ء (تقریباً) شیفتہ کی غالب سے پہلی جان پہچان۔

ایضاً پہلی بار ہندوستانی مجسٹریٹوں کا تقرر، انگریزی عہد میں۔

۱۸۳۴ء (۱۱۸ کتوبر) کریم خاں داروغہ، شکار شمس الدین خاں کی ایما میواتی کے ساتھ دلی میں انگریزوں کے ایجنٹ ولیم فریزر کے قتل کے لیے دلی میں آمد، تین مہینے دلی رہا۔ مگر ناکام لوٹا۔ پھر دلی واپس آیا۔

۱۸۳۵ء (۲۲ مارچ) ولیم فریزر کا قتل۔ کریم خاں داروغہ شکار نواب شمس الدین احمد خاں کی گرفتاری

۱۸۳۵ء (۱۸ اپریل) نواب شمس الدین احمد خاں کو بہ الزام اعانت مجرمانہ پھانسی۔

(اس پر فیروز پوجھرکا کا علاقہ انگریزوں نے واپس لے لیا۔ اس کے بعد غالب کی پنشن، ساڑھے سات سو روپے سالانہ ریاست لوہارو کی جگہ انگریزی خزانے سے ادا ہونے لگی۔)

۱۸۳۷ء شمالی ہند میں قحط۔

۱۸۳۷ء (۲۸ ستمبر) معین الدین اکبر شاہ ثانی کا انتقال۔

۱۸۳۷ء۔ (۳۰ ستمبر) سراج الدین بہادر شاہ ظفر کی تخت نشینی۔

۱۸۳۷ء (۲۰ نومبر) راج دربار سے فارسی زبان خارج کرنے کا حکم۔

۱۸۳۸ء	ناسخ کا لکھنؤ میں انتقال۔
۱۸۳۸ء	شاہ نصیر کا حیدرآباد میں انتقال۔
۱۸۳۹ء	مہاراجا رنجیت سنگھ کا انتقال۔
۱۸۴۰ء (؟)	غالب کی والدہ کی علالت اور انتقال۔
ایضاً	دلی کالج میں مدرس فارسی کے عہدے کی پیشکش اور غالب کا انکار۔
۱۸۴۱ء (اگست)	غالب کی، گھر پر جوا خانے کے قیام میں گرفتاری۔ (عدالت نے سو روپیہ جرمانہ کیا، عدم ادائی جرمانہ کی صورت میں چار مہینے قید۔ جرمانہ ادا کر دیا گیا)
۱۸۴۱ء (اکتوبر)	دیوان اردو کا پہلا ایڈیشن (مطبع سید الاخبار، دلی۔ اگرچہ دیوان ۱۸۳۳ء میں مرتب ہو چکا تھا)
۱۸۴۲-۴۳ء	بہ عہد لارڈ الن برا گورنر جنرل، خلعت ہفت پارچہ اور سہ رقم جواہر کا غالب کو اعزاز
۱۸۴۴ء	میر نظام الدین ممنون کا دلی میں انتقال
۱۸۴۵ء	دیوان فارسی (مے خانہ آرزو سر انجام) کا پہلا ایڈیشن (مطبع دار السلام، دلی) دیوان ۱۸۳۵ء میں مرتب ہو چکا تھا۔
۱۸۴۵-۴۶ء	سکھوں اور انگریزوں کی پہلی لڑائی۔
۱۸۴۷ء (؟)	غالب کا پہلا اردو خط (بہ نام تفتہ)
۱۸۴۷ء (۱۳ جنوری)	آتش کا لکھنؤ میں انتقال۔
۱۸۴۷ء	زین العابدین خاں عارف کے بڑے بیٹے باقر علی خاں کی پیدائش۔
۱۸۴۷ء (مئی)	دیوان اردو کے دوسرے ایڈیشن کی اشاعت (مطبع دار السلام، دلی)
۱۸۴۷ء (۲۵ مئی)	گھر پر جوا خانہ قائم کرنے کے الزام میں غالب کی دوبارہ گرفتاری

(فیصلے میں چھ ماہ قید با مشقت اور دو سو روپیہ جرمانہ کی سزا ہوئی۔ مشقت غالباً پچاس روپے ادا کر کے معاف ہو گئی۔ وہ صرف تین مہینے قید میں رہے۔ اس کے بعد رہائی ہو گئی)

۱۸۴۸ء (۹ مارچ) غالب کا پہلا اردو خط (بہ نام نبی بخش حقیر) تاریخ کے ساتھ۔

۱۸۴۸-۴۹ء سکھوں اور انگریزوں کی دوسری لڑائی۔

۱۸۴۹ء (اگست) 'پنج آہنگ' (فارسی) کا پہلا ایڈیشن (مطبع سلطانی، لال قلعہ، دہلی)

۱۸۵۰ء زین العابدین خاں عارف کے چھوٹے بیٹے، حسین علی خاں کی پیدائش۔

۱۸۵۰ء (جولائی) تیموری خاندان کی تاریخ 'مہر نیم روز' لکھنے پر مقرر، خلعت اور خطاب نجم الدولہ، دبیر الملک نظام جنگ۔ (تاریخ نویسی کی تنخواہ چھ سو روپیہ سالانہ مقرر ہوئی۔)

۱۸۵۰-۵۱ء حافظ عبدالرحمٰن خاں (حافظ جیو) احسان دہلوی کا دلی میں انتقال۔

ایضاً غالب کی چوتھی مہر۔ غالب کو یہ خطاب بہادر شاہ ظفر نے ۴ جولائی ۱۸۵۰ء کو دیا، جو ۲۳ شعبان ۱۲۶۶ھ کے مطابق ہے۔ مہر ۱۲۶۷ھ میں بنوائی گئی۔ جو ۶ نومبر ۱۸۵۰ء سے شروع ہوتا ہے۔ (نجم الدولہ دبیر الملک اسداللہ خاں بہادر نظام جنگ ۱۲۶۷ھ

۱۸۵۲ء (اپریل) زین العابدین خاں عارف (امراؤ بیگم کے بھانجے) کی وفات۔ (عارف کی وفات کے بعد ان کے دونوں لڑکوں کو امراؤ بیگم نے پالا) قبر مزار غالب کے قریب کونے میں ہے۔

۱۸۵۲ء (۱۴ مئی) مومن کا دلی میں انتقال۔

۱۸۵۲-۵۳ء غالب کی پانچویں مہر۔ غالب حضرت علی کو مشکل کشا مانتے تھے۔ شاید یہ مہر ان کے سقیم حالات کی نشاں دہی کرتی ہے۔ 'یا اسداللہ

	الغالب ۱۲۶۹ھ
۱۸۵۲ء (اپریل)	'پنج آہنگ' کا دوسرا ایڈیشن (مطبع دارالسلام، دلی)
۱۸۵۳ء	بمبئی سے تھانا (مہاراشٹر) تک پہلی ریلوے لائن۔
ایضاً	کلکتے سے آگرے تک ٹیلی گراف۔
۱۸۵۴ء	حالی پہلی مرتبہ دلی آئے۔ بہ عمر ۱۷/۱۸ برس۔
	ڈیڑھ برس کے بعد اواخر ۱۸۵۵ء میں واپس پانی پت۔
	سال بھر حصار میں ملازمت کی۔
۱۸۵۴ء (۱۵ نومبر)	شیخ محمد ابراہیم ذوق استاد ظفر) کا انتقال)
۱۸۵۴_۵۵ء	غالب استاد مقرر۔
۱۸۵۴_۵۵ء	'مہر نیم روز' کی طباعت واشاعت (فخر المطابع، دلی)
	(یہ اسی سال میں کم از کم تین بار چھپی۔ یہ سب ایڈیشن ہی کہلاتے ہیں، میرے کتب خانے میں موجود ہیں۔)
۱۸۵۶ء	'قادر نامہ' کی اشاعت اول مطبع سلطانی) لال قلعہ، دہلی)
	(یہ نظم غالب نے عارف کے دونوں بچوں کو فارسی اور اردو پڑھانے کے لیے کہی تھی)
۱۸۵۶ء	الحاق اودھ
۱۸۵۶ء (۱۰ جولائی)	غلام فخر الدین، عرف مرزا فخرو (ولی عہد بہادر شاہ ظفر) کا انتقال۔
۱۸۵۷ء (۲۸ جنوری)	غالب نے مولانا فضل حق خیر آبادی کی تحریک پر والی رام پور نواب محمد یوسف علی خاں کی خدمت میں قصیدہ بھیجا۔
۱۸۵۷ء (۵ فروری)	غالب کا تقرر بطور استاد نواب یوسف علی خاں ناظم، والی رامپور
۱۸۵۷ء	غالب کے رازدارانہ خطوط، بنام والی رامپور

(مارچ/اپریل) قوی گمان ہے کہ یہ سیاسی امور پر مشتمل تھے اس لئے غالب کی ہدایت پر یہ خطوط ضائع کردیے گئے۔

۱۸۵۷ء(۱۰ مئی) سنہ اٹھارہ سو ستاون کے ہنگامے (غدر) کا میرٹھ میں آغاز۔

۱۸۵۷ء(۱۱ مئی) دیسی فوج (تلنگوں) کا دلی میں داخلہ انگریزی تسلط کا خاتمہ، دیسی اقتدار کا قیام، غالب کی قلعے کی تنخواہ اور انگریزی پنشن بند۔

۱۸۵۷ء(۲۰ ستمبر) انگریزوں کی فتح اور دلی پر دوبارہ قبضہ۔

۱۸۵۷ء(ستمبر) غدر کے بعد دلی پر دوبارہ انگریزی قبضے کے دوران امام بخش صہبائی انگریزی گولی کا نشانہ بنے۔

۱۸۵۷ء میرزا یوسف علی (بیگ) خاں (برادر غالبؔ) کی وفات۔ وہ انگریز کی گولی کا نشانہ بنے، اگرچہ غالب نے مصلحتاً لکھا ہے کہ وفات بخار سے ہوئی)

۱۸۵۸ء(نومبر) 'دستنبو' کی اشاعت اول (مطبع مفید خلائق، آگرہ)

۱۸۵۹ء سکے کا الزام۔ خط بہ نام مرزا نوشہ، ۱۸ جون ۱۸۵۹ء لیکن گوری شنکر مخبر نے سکے کی رپورٹ (منسوب بہ غالب) ۱۹ جولائی ۱۸۵۷ء ہی کو انگریز کو پہنچادی تھی۔

۱۸۵۹ء(۱۰ جولائی) والی رامپور سے مستقل وظیفے کی درخواست اور اسی مہینے سے سو روپے مہینہ بطور وظیفہ مقرر۔

۱۸۶۰ء(جنوری) گورنر جنرل کی یکم جنوری ۱۸۶۰ء کو دلی میں آمد۔
غالب ان سے ملنے ان کی قیام گاہ پر گئے۔ جواب ملا کہ "فرصت نہیں۔" اور کہ تم "باغیوں سے اخلاص رکھتے تھے۔"
حقیقت یہ تھی کہ سکہ حافظ ویران، شاگرد ذوق کا کہا ہوا تھا جو "صادق

الاخبار" کے ۱۳ ذیقعدہ ۱۲۷۳ھ مطابق ۶ جولائی ۱۸۵۷ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔

۱۸۶۰ء (۱۹ جنوری) رام پور کا پہلا سفر۔ ۲۷ جنوری کو رام پور پہنچے۔

۱۸۶۰ء (۲۴ مارچ) رام پور سے واپسی۔ (۱۷ مارچ کو رام پور سے روانہ ہوئے تھے)

۱۸۶۰ء (مئی) انگریزی پنشن کا دوبارہ اجراء۔

(تین برس کا بقایا ساڑھے سات سو سالانہ کے حساب سے ۲۲۵۰ روپے وصول ہوا)

۱۸۶۱ء (۲۹ جولائی) 'دیوان اردو' کا تیسرا ایڈیشن (مطبع احمدی، دہلی)

۱۸۶۱ء (۱۹ اگست) مولانا فضل حق خیرآبادی کا جزیرہ انڈیمان میں انتقال۔

۱۸۶۱ء۔۶۲ غالب کی چھٹی مہر 'غالب ۱۲۷۷ھ'

یہاں سے غالب کی زندگی کا انتہائی شہرت کا زمانہ شروع ہوتا ہے یہ مختصر علم ان کی انا کا نقطہ عروج ہے۔ سات سال بعد ان کا انتقال ہوا۔ یہ ان کی آخری مہر تھی۔ گویا ان کا انا کا مظاہرہ ان کے انتقال تک پوری آب و تاب کے ساتھ جاری رہا۔ (غالب ۱۲۷۸ھ)

۱۸۶۲ء 'قاطع برہان' کی طبع اول (مطبع نول کشور، لکھنو)

۱۸۶۲ء (۲ مارچ) انگریزی درباریوں میں کرسی نشینی اور خلعت کے اعزاز کا دوبارہ اجراء۔

۱۸۶۲ء (جون، جولائی) 'دیوان اردو' کا چوتھا ایڈیشن (مطبع نظامی، کان پور)

۱۸۶۲ء (یکم اکتوبر) لاڈو بیگم، بیوہ مرزا یوسف کی حکومت سے درخواست گزارے کے لیے 'دیوان اردو' کی پانچویں اور آخری اشاعت (مطبع مفید خلائق، آگرہ)

۱۸۶۳ء (جولائی) یکم اکتوبر ۱۸۶۲ء سے ۳۰ روپے مہینہ خیراتی پنشن بہ نام لاڈو بیگم، زوجہ مرزا یوسف مرحوم جاری۔

۱۸۶۳ء (مئی رجون) 'دیوان فارسی' (کلیات نظم فارسی) کا دوسرا ایڈیشن (مطبع نول کشور لکھنو)

۱۸۶۴ء مثنوی 'ابر گہربار' کی اشاعت (اکمل المطابع، دلی)
(یہ مثنوی کلیات نظم میں شامل تھی، لیکن اب الگ سے شائع ہوئی)

۱۸۶۴ء 'قاطع برہان' کے جواب میں 'محرق قاطع برہان' مصنفہ سید سعادت علی کی اشاعت (مطبع احمدی، دلی)

۱۸۶۴ء 'قادر نامہ' کی دوسری اشاعت (مجلس پریس۔دلی)

۱۸۶۴ء 'لطائف غیبی' (اگرچہ نام میاں دادخاں سیاح کا ہے مگر اس کے اصل مصنف غالب ہی ہیں)

۱۸۶۵ء 'دافع ہذیان' مصنفہ سید محمد نجف علی جھجری کی اشاعت۔

۱۸۶۵ء 'سوالات عبدالکریم' از عبدالکریم کی اشاعت (اکمل المطابع، دلی)
(دوسرے کے نام سے شائع ہوئی، لیکن یہ بھی غالب کی اپنی تصنیف ہے)

۱۸۶۵ء 'قاطع برہان' از مرزا رحیم بیگ رحیم میرٹھی کی اشاعت۔

۱۸۶۵ء غالب نے حکومت سے تین مطالبے کیے کہ انہیں شاہی دربار مقرر کیا جائے پہلے سے اونچی جگہ ملے اور 'دستنبو' حکومت اپنے خرچ پر شائع کرے۔ حکم ہوا کہ تحقیقات کی جائیں کہ غدر میں غالب کا رویہ کیا تھا۔ رپورٹ ہوئی کہ ان سے سکہ منسوب ہے۔ سب درخواستیں رد ہو گئیں۔ غالب پر سکے کا الزام ان کی زندگی میں غلط ثابت نہ ہو سکا۔

۱۸۶۵ء (۲۱ اپریل) نواب یوسف علی خاں والی رام پور کا انتقال نواب کلب علی خان کی جانشینی۔

۱۸۶۵ء (اگست) غالب کے رسالے 'نامہ غالب' بہ جواب 'قاطع برہان' کی اشاعت

	(مطبع محمدی، دلی)
۱۸۶۵ء (۷راکتوبر)	میرزا غالب کا رام پور کا دوسرا سفر۔
	۱۲راکتوبر کو رام پور پہنچے۔
۱۸۶۵	'دستنبو' کا دوسرا ایڈیشن (مطبع لٹریری سوسائٹی روہیل کھنڈ، بریلی)
۱۸۶۵ء	برطانوی ہند کا یورپ کے ساتھ ٹیلی گراف کے ذریعے براہ راست رابطہ۔
۱۸۶۵ء (دسمبر)	'قاطع برہان' کی طبع ثانی، بہ عنوان 'درفش کاویانی' کی اشاعت (اکمل المطابع، دلی)
۱۸۶۵ء (دسمبر)	رام پور کے دوسرے سفر سے واپسی
	(۲۸دسمبر کو رام پور سے روانہ ہوئے اور ۸جنوری ۱۸۶۶ء کو دلی پہنچے)
۱۸۶۶ء	'قاطع برہان' کے جواب میں 'موید برہان' مصنفہ مولوی احمد علی احمد جہانگیری کی اشاعت (مطبع مظہر العجائب، کلکتہ)
	'قاطع برہان' کے جواب میں 'قاطع القاطع'، مصنفہ، امین الدین امین دہلوی کی اشاعت (مطبع مصطفائی، دہلی)
۱۸۶۷ء (؟)	'دعائے صباح' فارسی منظوم ترجمہ (مطبع نول کشور لکھنو)
	(اس کا آج تک ایک ہی نسخہ دریافت ہوا ہے جو میرے کتب خانے میں ہے)
۱۸۶۷ء	'تیغ تیز' کی اشاعت (اکمل المطابع، دہلی)
	(غالب نے یہ مختصر رسالہ 'موید برہان' کے جواب میں لکھا تھا۔)
۱۸۶۷ء (فروری)	'نکات غالب' 'رقعات غالب' کی اشاعت (مطبع سراجی، دلی)
	پنجاب کے محکمہ تعلیم کے ڈائرکٹر میجر فلر نے رائے بہادر ماسٹر پیارے

لال کو حکم دیا کہ غالب سے فارسی قواعد سے متعلق کتاب لکھوائی جائے۔ ماسٹر صاحب موصوف کے کہنے پر میرزا نے یہ دو مختصر رسالے قلم بند کیے۔

۱۸۶۷ء (۱۱ اپریل) 'ہنگامہ بول آشوب' (۱) کی اشاعت (مطبع منشی سنت پرشاد، آرہ) ('قاطع برہان' کے مناقشے کے سلسلے کے منظومات)

۱۸۶۷ء (اگست) 'سبد چین' کی اشاعت (مطبع محمدی، دلی)

۱۸۶۷ء (۲۵ ستمبر) 'ہنگامہ بول آشوب (۲) کی اشاعت (مطبع منشی سنت پرشاد، آرہ)

۱۸۶۷ء (۳ دسمبر) مولوی امین الدین، دلوی، مصنف 'ساطع برہان' کے خلاف مقدمہ ازالہ حیثیت عرفی۔

۱۸۶۸ء (جنوری) 'کلیات نثر فارسی' (غالبؔ) کی اشاعت (مطبع نول کشور لکھنو) (اس میں فارسی نثر کی تین کتابیں پنج آہنگ 'مہر نیمروز، دستنبو، شامل ہیں)

کتابیات

۱۔ ابواللیث صدیقی (ڈاکٹر)، آج کا اردو ادب، قمر کتاب گھر کراچی ۱۹۸۲ء

۲۔ الطاف حسین حالی، یادگار غالب، شیخ مبارک علی، لاہور، ۱۹۳۰

۳۔ الطاف حسین حالی، مقدمہ شعرو شاعری انوار المطابع لکھنؤ

۴۔ اسد اللہ خاں غالب، دیوان غالب، کنگ پبلشرز، کراچی

۵۔ اسد فیض (ڈاکٹر)، اعتبار حرف، ایشیا پبلشرز، فیصل آباد

۶۔ اکرام بریلوی، کوچہ بین السطور، ویلکم بک پورٹ، کراچی ۲۰۱۳ء

۷۔ اطہر رضوی، بیادِ غالب، جاوداں، کراچی، ۱۹۹۵ء

۸۔ اصغر حسین خاں، نظیر لدھیانوی، کلیات غالب، مکتبہ کارواں، لاہور ۱۹۶۳ء

۹۔ ارتضیٰ حسین، معروضات، شیخ غلام علی اینڈ سنز، کراچی، ۱۹۸۲ء

۱۰۔ اختر انصاری اکبر آبادی، عصری ادب، ادارہ نئی قدریں، حیدر آباد،

۱۱۔ اویس احمد ادیب، تنقیدیں، قمر کتاب گھر، کراچی ۱۹۷۱ء

۱۲۔ جمال حسین (قاضی)، مشرق میں عشقیہ شاعری، شعبہ اردو علیگڑھ یونیورسٹی، ۲۰۰۷ء

۱۳۔ جمیل الدین عالی، سہ ماہی اردو، انجمن ترقی اردو، پاکستان، جنوری۔ مارچ ۱۹۶۹ء

۱۴۔ جمیل جالبی (ڈاکٹر) نئی تنقید، رائل بک کمپنی، کراچی ۱۹۸۵ء

۱۵۔ حسین انجم، انتخاب دیوان غالب، سید اینڈ سید پبلشرز، کراچی ۲۰۰۵ء

۱۶۔ خواجہ حسن نظامی، غالب کا روزنامچہ، خواجہ ڈپو، دہلی ۱۹۲۱ء

۱۷۔ رئیس فاطمہ، ارتکاز، نو بہار پبلی کیشنز، کراچی ۲۰۱۲ء

۱۸۔ ریاض صدیقی، غالب برانہ مان، مکتبہ ہم زبان، کراچی ۱۹۹۲ء

۱۹۔ سلیم اختر (ڈاکٹر)، غالب شناسی، اور نیاز و نگار، الوقار پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۹۸ء

۲۰۔ سعادت سعید (ڈاکٹر)، راوی، جی سی یونیورسٹی، لاہور ۲۰۱۳ء

۲۱۔ سردار جعفری، پیغمبرانِ سخن، مکتبہ دانیال، کراچی ۱۹۸۳ء

۲۲۔ سحر انصاری، سہ ماہی تمثال، کراچی ۱۹۹۳ء

۲۳۔ شان الحق حقی، نکتہ راز، عصری کتب، کراچی ۱۹۷۲ء

۲۴۔ ضمیر جعفری، سہ ماہی ادبیات، اسلام آباد ۱۹۸۷ء

۲۵۔ ضمیر نیازی، مرحلہ شوق، پاکستان اسٹڈی سینٹر، جامعہ کراچی ۲۰۰۹ء

۲۶۔ عبدالرحمٰن چغتائی، نقش چغتائی، (دیوانِ غالب) احسن برادرز، لاہور ۱۹۶۵ء

۲۷۔ عبدالرحمٰن بجنوری (ڈاکٹر) محاسن کلام غالب، انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ ۱۹۵۲ء

۲۸۔ گوہر نوشاہی (ڈاکٹر) سہ ماہی نوادر، مجلس یادگار نظیر حسین زیدی، لاہور ۲۰۰۷ء

۲۹۔ محمد اختر جوناگڑھی (قاضی)، ورامکاں، نوبہار پبلی کیشنز، کراچی ۲۰۱۲ء

۳۰۔ محمد جمیل احمد، اردو شاعری پر ایک نظر، غضنفر اکیڈمی، کراچی ۱۹۸۵ء

۳۱۔ محمد رضا کاظمی (ڈاکٹر)، تہذیب و تخلیق، پاکستان اسٹڈی سینٹر، جامعہ کراچی، ۲۰۰۸ء

۳۲۔ محمد علی صدیقی، (ڈاکٹر)، غالب اور آج کا شعور، ادارہ یادگار غالب، کراچی ۲۰۰۴ء

۳۳۔ ممتاز حسین، نئی قدریں، مکتبہ اردو، لاہور، ۱۹۵۳ء

۳۴۔ ممتاز حسین، ادب اور روح عصر، شہرزاد، کراچی، ۲۰۰۳ء

۳۵۔ ممتاز حسین، نقد حرف، مکتبہ اسلوب، کراچی ۱۹۸۵ء

۳۶۔ ممتاز حسین، ادب اور شعور، ادارہ نقد ادب، کراچی ۱۹۹۲ء

۳۷۔ مختار الدین احمد، نقد غالب، انجمن ترقی اردو (ہند) علیگڑھ، ۱۹۵۶ء

۳۸۔ مختار الدین احمد، احوال غالب، مکتبہ جامعہ، دہلی ۱۹۵۳ء

۳۹۔ ناصر رانا (ڈاکٹر) سہ ماہی ادب معلی، اکادمیات، لاہور، ۲۰۰۷ء

۴۰۔ ناصر بغدادی، سہ ماہی 'بادبان' کراچی ۲۰۰۶ء

۴۱۔ نور محمد شیخ، مجلہ نوید سحر، عبداللہ ہارون کالج، کراچی ۲۰۰۲ء

مصنف کی دیگر تصانیف

۱۔ ادب اور عصری شعور ۲۰۱۶ء
۲۔ ہمہ جہت اقبال (تنقید) ۲۰۱۶ء
۳۔ نئے دن کی بشارت (شعری مجموعہ) ۲۰۱۵ء
۴۔ ادب اور سماجی شعور (تنقید) ۲۰۱۵ء
۵۔ روشن راہیں (کالموں کا مجموعہ): ۲۰۱۳ء
۶۔ ترقی پسند ادب کے معمار (تذکرہ نگاری/تحقیق) ۲۰۱۳ء
۷۔ ابراہیم جلیس۔ انسان اور قلم کار ۲۰۱۳ء
۸۔ دھنک رنگ (انتخاب کلام مع تراجم) ۲۰۱۲ء
۹۔ ارمغان ممتاز (تالیف) ۲۰۱۲ء
۱۰۔ ترقی پسند اردو نثر کے پچاس سال (تحقیق) ۲۰۱۲ء
۱۱۔ فیض کا فکری ابلاغ (تنقید) ۲۰۱۱ء
۱۲۔ ترقی پسند تحریک کا سفر (تاریخ) ۲۰۱۱ء
۱۳۔ پنج رنگ (انتخاب کلام مع تراجم) ۲۰۱۰ء
۱۴۔ مجنوں گورکھپوری۔ شخصیت وفن (تنقید) ۲۰۱۰ء
۱۵۔ بلاوا (سفرنامہ) ۲۰۰۹ء
۱۶۔ ہجرت (ترجمہ) ۲۰۰۸ء
۱۷۔ زندگی کا سورج (شعری مجموعہ) ہندی۔ ۲۰۰۷ء
۱۸۔ جمال وکمال (یادداشتیں) ۲۰۰۷ء
۱۹۔ ترقی پسند تحریک، ادب اور سجاد ظہیر (تنقید) ۲۰۰۶ء
۲۰۔ کہانیاں دیس دیس کی (تراجم) ۲۰۰۶ء

۲۱۔ نقد و نظر (تنقید) ۲۰۰۵ء

۲۲۔ ادب، سائنس اور جمہوریت (تنقید) ۲۰۰۴ء

۲۳۔ مزاجِ سخن (مجموعہ غزلیات) ۲۰۰۳ء

۲۴۔ قائدینِ پاکستان (پاکستانیات) ۲۰۰۲ء

۲۵۔ قلم برائے امن (تالیف) ۲۰۰۱ء

۲۶۔ قلم کا سفر (تالیف) ۲۰۰۰ء

۲۷۔ ننھے سورج دیس کے (مجموعہ ہائیکو) ۲۰۰۰ء

۲۸۔ ادب اور سائنس (تالیف) ۱۹۹۹ء

۲۹۔ خوشبو گلابوں کی (عالمی تراجم و طبع زاد نظمیں) ۱۹۹۸ء

۳۰۔ آئی ایم ایف اور پاکستان کی سیاسی معیشت (ترجمہ) ۱۹۹۷ء

۳۱۔ انجینئرنگ ہورائزن (انگریزی مضامین) ۱۹۹۵ء

۳۲۔ مکان شیشے کا (شعری مجموعہ) ۱۹۸۷ء

۳۳۔ گلہائے عقیدت (منقبتی مجموعہ) ۱۹۸۵ء

۳۴۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی، شخصیت و فن (تنقید) زیرِ طبع

۳۵۔ معجزۂ فن (فارسی کلام اقبال مع ترجمہ و تشریح) زیرِ طبع

۳۶۔ منتخبات مجنوں (انتخاب) زیرِ طبع

۳۷۔ ہائیکو دبستان (زیرِ طبع)

۳۸۔ سندھ کے ادب پر ترقی پسند تحریک کے اثرات۔ (تالیف) زیرِ طبع

۳۹۔ اکیسویں صدی (سائنسی مضامین) زیرِ طبع

۴۰۔ ہم کلام (مکالمے) ۲۰۱۷ء

۴۱۔ ترقی پسند نظم (تحقیق) زیرِ طبع

۴۲۔ ہمہ رنگ غالب (تنقید) زیرِ طبع

۴۸۔
ا۔



کچھ مصنف کے بارے میں:

ڈاکٹر جمال نقوی ۱۸ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ سے بی۔ اے کرنے کے بعد ایم اے اردو کالج اور پی ایچ ڈی (مطالعہ پاکستان) جامعہ کراچی سے مکمل کیا۔ منسٹری آف ڈیفنس کے ادارہ کراچی شپ یارڈ میں جنرل منیجر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ کچھ عرصے ادارہ علم میں جنرل منیجر رہے۔ محمد علی جناح یونیورسٹی (ماجو) کی فیکلٹی آف سوشل سائنسز میں ایسوسی ایٹ پروفیسر کے عہدے پر کام کیا۔ اور آج کل سرسید یونیورسٹی میں چانسلر کے ایڈوائزر ہیں۔

ڈاکٹر جمال نقوی نے چالیس سے زائد کتابیں تصنیف و تالیف کیں۔ ان کی تخلیقات کا دنیا کی سات زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اور انھوں نے انگریزی، جاپانی، روسی، فارسی، ہندی اور سندھی زبانوں سے نظم و نثر میں ترجمے کیے ہیں۔ تحقیق، تنقید، تاریخ، پاکستانیات، شاعری، تذکرہ نگاری، کالم نگاری، سفرنامے، سوانح، یادداشتیں، سائنس اور انجینئرنگ جیسے موضوعات پر اردو، انگریزی اور ہندی میں کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

ڈاکٹر نقوی نے امریکہ، کناڈا، ایران، قزاقستان، نیپال، ہندوستان اور پاکستان میں منعقد ہونے والی عالمی کانفرنسوں میں مقالات پیش کیے جن پر انھیں اعزازات و انعامات سے نوازا گیا۔ آپ ادب، سائنس اور انجینئرنگ کی متعدد قومی اور بین الاقوامی انجمنوں میں عہدیدار منتخب ہو چکے ہیں۔ جہاں فعالیت کی بنیاد پر آج بھی انھیں عزت و احترام دیا جاتا ہے۔ ادبی انجمنوں کے جرائد اور ترجمانوں کے مدیر کی حیثیت سے بھی کام کر چکے ہیں اور اب بھی بہت سے اداروں میں سرپرست اور مشیر کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ علم و ادب کے شعبے میں ڈاکٹر صاحب کی گراں قدر علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں پنجاب اور [illegible] کی جامعات میں آپ کی شخصیت اور فن کے موضوع پر تحقیقی مقالے تحریر کیے گئے ہیں اور شائع ہو رہے ہیں۔ تقریباً تین درجن کتابوں کی اشاعت کے علاوہ آپ کی مندرجہ ذیل کتب زیر اشاعت ہیں:

- تجزیۂ فن (فارسی کلامِ اقبال مع ترجمہ و تشریح)
- منتخباتِ مجنوں (انتخاب)
- ادب اور عصری شعور (تنقیدی مضامین)
- علی گڑھ تحریک (پس منظر و پیش منظر)
- ترقی پسند تحریک کا سفر (اگلا پڑاؤ)
- ترقی پسند ادب کے معمار (دوسری جلد)
- بانگِ دبستان (انتخاب)
- ہندی کہانیاں (ہندی سے ترجمہ)
- ترقی پسند نظم کا سفر (تحقیق)
- سندھ کے ادب پر ترقی پسند تحریک کے اثرات (تالیف)
- اکیسویں صدی (سائنسی مضامین)
- انتخابِ کلام (جدید اضافوں کے ساتھ)

ISBN 978-969-7280-18-6
Rs. 795

پیس پبلی کیشنز
42- اردو بازار، لاہور